باسمہٖ تعالیٰ

تکوین و تشریع

مع

سوانحِ تنویر

عارف باللہ

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم

ترتیب

مفتی محمد رضوان

ناشر

کتب خانہ ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تکوین وتشریع

مع

سوانحِ تنویر

شیخ المشائخ، عارف باللہ، صاحبِ شریعت وطریقت

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم

خلیفۂ اجل

مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی وحضرت مولانا فقیر محمد صاحب

پشاوری رحمہما اللہ

کے حالاتِ زندگی اور تکوین وتشریع کے موضوع پر آپ کی ایک تصنیفِ لطیف

ترتیب

مفتی محمد رضوان

ناشر

کتب خانہ ادارہ غفران راولپنڈی

نام کتاب	تکوین وتشریع مع سوانحِ تنویر
از	حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم
ترتیب	مفتی محمد رضوان
کمپوزنگ واشاعت	ادارہ غفران راولپنڈی
تاریخِ اشاعت	رجب المرجب ۱۴۲۸ھ
صفحات:	۲۴۴
قیمت:	

......ملنے کے پتے......

کتب خانہ: ادارہ غفران، چاہ سلطان، گلی نمبر 17، فون: 051-5507270

بیت الحنیف 4/C، بلاک A۔ یونٹ نمبر 8، لطیف آباد، حیدر آباد، سندھ

فون: 0300-2376300

کتب خانہ: امدادیہ ٹاور مارکیٹ حیدر آباد

کتب خانہ: رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ، راجہ بازار، راولپنڈی فون 5771798

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور۔ فون 042-7353255

مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ ۱۷، اردو بازار لاہور۔ فون 042-7232536

ادارۂ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی۔ فون 021-2722401

دارالاشاعت اردو بازار کراچی۔ فون 021-2631861

مکتبہ رشیدیہ، اقبال روڈ اقبال مارکیٹ، کمیٹی چوک راولپنڈی فون :- 03005320301

الخلیل پبلشنگ ہاؤس، فضل داد پلازہ، اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی فون:- 051-7122152

شمار نمبر — فہرست مضامین — صفحہ نمبر

حضرت عارف باللہ مدظلہم کی دیگر تصنیفات

(۱)......تذکرۂ مسیح الامت

(حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ کی حیات ووفات کا دلچسپ سوانحی خاکہ)

(۲)......شامتِ اعمال

(امتِ مسلمہ کی بداعمالیوں کی شامت پر عبرت انگیز مضمون)

(۳)......موجودہ صدی اور ظہورِ مہدی

(موجودہ صدی میں ظہورِ مہدی کے دعوے کی تردید اور حضرت مہدی علیہ الرحمہ کی تفصیلی علامات)

حافظہ قوی کرنے کا عمل

آج کل عام طور پر لوگوں کو حافظہ کمزور ہونے کی شکایت رہتی ہے، خاص طور پر قرآن مجید حفظ کرنے والے طلباء اور دوسری تعلیم میں مشغول افراد کو سبق یاد نہیں ہوتا اور یاد بھی ہو جاتا ہے تو زیادہ عرصہ تک یاد نہیں رہتا۔ ایسے حضرات کے لئے ایک آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ صبح وشام اور ہو سکے تو ہر نماز کے بعد اور خصوصاً سبق وغیرہ یاد کرتے وقت ''بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' پڑھ کر سات مرتبہ یہ کلمات پڑھے جائیں وَاذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ (سورہ کہف) (تعلیم فرمودہ عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب مدظلہم)

سوانحِ تنویر

یعنی

شیخ المشائخ، عارف باللہ، صاحبِ شریعت وطریقت

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم

کی آپ بیتی اور حالاتِ زندگی

آپ کی ولادت سے لے کر بچپن اور بچپن سے لے کر جوانی، اور جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کی عجیب وغریب داستان، ہندوستان سے لے کر پاکستان تک کے سفر اور قیامِ پاکستان کی تحریک سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے مشاہداتی حیرت انگیز مناظر، اصحابِ شریعت وطریقت اور اصحابِ خدمت کے ساتھ آپ بیتے واقعات

عرضِ ناشر

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ سے اللہ تعالیٰ نے موجودہ صدی میں دین کی وسیعُ الجہت خدمت کا جو کام لیا ہے، وہ بلاشبہ ایک مجددانہ کارنامہ ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ جہاں ایک طرف قلم وتحریر کے ذریعہ سے ہزاروں تصنیفات وتالیفات کی شکل میں اپنی دینی وراثت چھوڑ کر گئے ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرتی ہیں، اسی کے ساتھ دوسری طرف رجالِ کار کی شکل میں بھی ایک ایسا ورثہ چھوڑ کر گئے ہیں، جو قربِ قیامت کے اس پُرفتن دور میں دین کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔

یوں تو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے بالواسطہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد بھی اس دور میں کم نہیں، لیکن وہ حضرات جنہوں نے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کی بلاواسطہ زیارت کی اور آپ کی صحبت بابرکت سے مستفید ہوئے، بالخصوص جنہوں نے بلاواسطہ آپ سے بیعت کا شرف حاصل کیا، ایسے حضرات کی تعداد اب تقریباً عنقاء ہوتی جارہی ہے۔ان چند ہستیوں میں سے میری معلومات کے مطابق اب پاکستان میں حضرت نواب محمد عشرت علی خان قیصر صاحب اور حضرت مولانا ڈاکٹر تنویر احمد خان صاحب مدظلہما ہیں۔اور حسنِ اتفاق یہ ہے کہ مذکورہ دونوں بزرگ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے براہِ راست بیعت کا شرف حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے دو خلفاء یعنی مسیح الامت حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی اور فقیر الامت حضرت مولانا فقیر محمد صاحب پشاوری رحمہما اللہ کے صحبت واجازت یافتہ خلفاء بھی ہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کا سایہ بصحت وعافیت اور بسلامت تادیر قائم رکھیں۔

حضرت نواب محمد عشرت علی خان قیصر صاحب مدظلہم کے حالات وواقعات پر مشتمل کتابچہ تو اس سے قبل ادارہ غفران راولپنڈی سے شائع ہو چکا ہے، اور حضرت ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب مدظلہم کے حالات وواقعات پر مشتمل رسالہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس کی اشاعت کی سعادت بھی بحمداللہ تعالیٰ ادارہ غفران کو حاصل ہورہی ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف کے ان حالات وواقعات کو ضبط کرنے میں ابتدائی کاوش تو مولانا

مفتی صبار دانش صاحب رحمہ اللہ (خلیفہ: حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف) کی ہے، جواب اس دنیا میں نہیں ہیں، انہوں نے حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف کی زبانی بیان فرمودہ آپ بیتی کو ٹیپ میں محفوظ کر کے نقل کیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں، اور ان کو اس کاوش پر اجرِ جزیل عطاء فرمائیں۔

مگر بعد میں حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف مدظلہم نے خود اس مضمون کی نظر ثانی واضافہ جات فرمائے اور کچھ امور کی زبانی کلامی بھی نشاندہی فرمائی، اور اس غرض کے لئے حضرت والا نے حیدر آباد سے راولپنڈی کے متعدد سفر فرمائے، پھر اس مضمون کو ترتیب دینے وتبییض کرنے اور اضافہ جات کی سعادت حضرت ڈاکٹر موصوف مدظلہم نے بندہ کو مرحمت فرمائی۔

اسی کے ساتھ حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف مدظلہم کی ایک اور تصنیف کا مسودہ جو تکوین وتشریع، سے متعلق تھی اس کی بھی تبییض وضروری اضافہ جات کر کے، اس سوانح کا حصہ بنا دیا گیا اور دونوں مضامین کی ایک ساتھ اشاعت مناسب سمجھی گئی۔

حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف کے خاندان کے اکابرین خصوصاً والد ماجد اور دادا ابا جی رحمہما اللہ کا بھی چونکہ تکوینی نظام سے تعلق رہا ہے، تکوینی نظام سے متعلق واقعات کا حضرت ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان اپنے اکابرین کی طرف سے خود بھی مشاہدہ فرمایا اور حضرت والا کی سوانح میں آپ حضرات اس قسم کے تکوینی واقعات ملاحظہ فرمائیں گے۔

یہ مناسبت اس بات کی محرک بنی کہ دونوں مضامین کو یکجا شائع کیا جائے۔

بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے حالات وواقعات ایمان والوں کے لئے عبرت ونصیحت اور وعظ وتذکیر نیز ہمت وحوصلہ کی بلندگی پیدا کرنے کے لئے تیر بہدف تاثیر رکھتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائیں، اور قارئین وسامعین کے لئے اصلاح وفلاح کا باعث بنائیں۔ آمین۔ فقط

محمد رضوان۔ ۶/رجب المرجب ۱۴۲۸ھ بروز اتوار

ادارہ غفران چاہ سطان راولپنڈی پاکستان

تاثرات

شیخ المشائخ، عارف باللہ، صاحبِ شریعت وطریقت
حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بندہ کی آپ بیتی کا ابتدائی مضمون اور ابتدائی مسودہ تو آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے مفتی صابر دانش صاحب رحمہ اللہ نے مجھ سے سُن سُن کر اور ٹیپ کر کے قلمبند کیا تھا، اُن کی عادت تھی کہ گفتگو کے دوران چھوٹے سے ٹیپ میں ریکارڈ کر لیا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے اور بھی کئی چیزیں جمع کیں۔

یہ مجھے بھی یاد نہیں کہ انہوں نے کب لکھا اور کیسے لکھا، یہ ان کی کرامت ہے، ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نے ان کے کاغذات سے نکال کر یہ مجھے بھیج دیا (جس کے سرورق پر ''آپ بیتی'' کا عنوان ڈلا ہوا تھا) کیونکہ ان مسودوں پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ یہ کاغذات ان کو بھجوا دیئے جائیں۔

پہلے تو اس کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ نہ ہوئی، لیکن اب جبکہ الحمدللہ اس فقیر کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور بقول میرے ابا جی رحمہ اللہ کے کہ دنیا میں تمہارا نام ہو گا صحیح ہو گیا، الحمدللہ تعالیٰ ساؤتھ افریقہ، انگلستان، امریکہ، کینیڈا، ناروے، ہندوستان وغیرہ وغیرہ ہر جگہ اس فقیر کا سلسلہ موجود ہے، ان کی طرف سے برابر خواہش رہنے لگی کہ میرے حالات قلمبند ہونے چاہئیں۔

اس سلسلہ میں بہت سے احباب کو جب ان مسودات وتحریرات کا علم ہوا تو ان کا بھی پرزور اصرار ہوا کہ یہ دونوں مضامین جلد از جلد شائع ہونے چاہئیں۔

اس ضرورت کے تحت بندہ نے اب اس مسودہ کو ازسرِنو دیکھا اور اس میں کچھ حذف واضافات کیئے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ بندہ کی ایک اور تصنیف کا مسودہ جو تکوین وتشریع کے موضوع سے متعلق تھا وہ بھی اس کے ساتھ شامل کر لیا جائے، کیونکہ بندہ کی زندگی میں بہت سے حالات تکوین

سے متعلق بھی ہیں اور یہ ایک مستقل موضوع ہے، اس مناسبت سے دونوں مضامین کا ایک ساتھ شائع ہونا مناسب ہے؛ اسی غرض کے لیے بندے کا متعدد مرتبہ راولپنڈی کا بھی سفر ہوا۔

مفتی محمد رضوان سلمہٗ نے ان مضامین کو محنت کے ساتھ ترتیب دیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

اس وقت راقم نہایت غم واندوہ کی حالت میں یہ تحریر کررہا ہے کہ میرے محترم منجھلے چچا نائب صوبیدار نصیر احمد خان صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں ’انا للہ وانا الیہ راجعون‘‘ آپ نہایت عبادت گزار، تہجد گزار تھے، تقریباً ستانوے سال کی طویل عمر پائی، آخری وقت تک صحت مند تھے، معمولات جاری تھے، اچانک طبیعت خراب ہوئی اور داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ویسے یہ چند ہفتوں سے اپنے سفر کا تذکرہ گاہے گاہے اپنی اولاد سے کرتے رہے، آپ قصبہ ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں مقیم تھے اور ایمن آباد میں ہی فوت ہوئے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ ماشاءاللہ کافی عیالدار ہیں، چھ صاحبزادے، دو صاحبزادیاں آپ کی اولاد میں سب جوان ہیں، چچی صاحبہ بھی بقیدِ حیات ہیں، صاحبزادوں کے نام شجرہ میں تحریر ہیں۔

اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ اعزہ واقرباء اور احباب دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، اب رخصت شدہ ان احباب کے واقعات وحالات ہی ہیں کہ ان سے کچھ عبرت ونصیحت پکڑی جائے اور سبق حاصل کیا جائے۔ یہ میری سوانح کا ایک مختصر حصہ ہے باقی حالات بشرطِ زندگی وعافیتِ صحت پھر کبھی لکھے جائیں گے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عزت وآبرو اور سلامتی ایمان و اعضاء کے ساتھ رکھیں اور ہر قسم کے فتن سے محفوظ فرمائیں۔ آمین فقط

تنویر احمد خان عفی عنہ

۴/ رجب/ ۱۴۲۸ھ۔ ۲۰/ جولائی 2007ء بروز ہفتہ

بیت الحنیف 4/C، بلاک A۔ یونٹ نمبر 8، لطیف آباد، حیدر آباد، سندھ

فون: 0300-2376300

واردِ حال ادارہ غفران، چاہ سلطان، راولپنڈی

سوانحِ تنویر

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

ولادت اور نام

میرا نام تنویر احمد ہے اور میری سنِ پیدائش جو میں نے سنی ہے، وہ ۲۱ اگست ۱۹۲۱ء (۱۶/ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ بروز یکشنبہ، بوقتِ صبح صادق)

اور میری ولادت مہندر گڑھ عرف کانوڈ ضلع نارنول ریاست پٹیالہ موجودہ راجپوتانہ علاقہ ہریانہ میں ہوئی۔

میں اپنے دادا کے سب سے بڑے بیٹے محمد حنیف خان کی سب سے بڑی اولاد میں سے ہوں، مجھ سے پہلے دو جڑواں بھائی پیدا ہوئے تھے جو پیدا ہونے کے بعد ہی فوت ہو گئے تھے، اس کے بعد میرے والد صاحب کو ایک بزرگ نے بشارت دی کہ تمہارے لڑکا پیدا ہوگا، اس کا نام تنویر احمد خان رکھنا۔

دادا ابا رحمہ اللہ جن کو میں ابا جی کہتا تھا، اور دوسرے بھی سب ابا جی کہتے تھے، اُن کا نام صوبیدار دوست محمد خان تھا جو دنیوی حشمت کے ساتھ دینی وجاہت کے بھی حامل تھے، ذاکر و شاغل بزرگ تھے، ذکر و شغل کی تعلیم بھی حضور ﷺ سے حاصل ہوئی تھی، آپ نے ایک روز حضور ﷺ سے یہ عرض کیا کہ دورانِ ذکر زبان میں کچھ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، آپ ﷺ نے اپنا لعابِ دہن منہ میں ڈالا، معاً بیدار ہوئے تو اس لعاب کا اثر منہ میں محسوس کیا، اسی وقت میری ولادت کی خبر ملی، ابا جی رحمہ اللہ فوراً آئے اور وہی لعاب میرے منہ میں ڈال دیا۔

میرے ابا جی میرا کوئی نام رکھنا چاہتے تھے۔ والد صاحب رحمہ اللہ کو یہ خیال ہوا کہ ابا جی رحمہ اللہ اس کا کوئی نہ کوئی نام رکھیں گے، اس احتمال کو سامنے رکھتے ہوئے جب میری پیدائش کا وقت قریب آیا تو والد صاحب رحمہ اللہ نے سوچا کہ ابا جی کوئی نہ کوئی نام رکھ دیں گے اور وہ بزرگ جنہوں نے مجھے

بشارت دی ہے ان کا معاملہ رہ جائے گا، تو میں اس واقعہ کو پہلے ظاہر کردوں، چنانچہ والد صاحب رحمہ اللہ نے یہ واقعہ و بشارت گھر والوں کو بتائی، جب ابا جی رحمہ اللہ کو یہ بات معلوم ہوئی، تو انہوں نے فرمایا ٹھیک ہے، چنانچہ میرا یہ نام کسی بزرگ کی بشارت کے مطابق میری پیدائش پر رکھ دیا گیا۔

نسب وخاندان

میں راجپوتوں میں قبیلہ راٹھوڑ سے تعلق رکھتا ہوں، ہمارے یہاں دو قسم کے لوگ ہیں، ایک راٹھوڑ اور دوسرے چوہان، ہماری شادیاں چوہانوں میں ہوتی ہیں یا چوہانوں کی ہمارے یہاں ہوتی ہیں جب میں نے اپنے بچپن میں ہوش سنبھالا تو میں نے اپنے ابا جی اور اماں جی کو دیکھا جو میرے دادا دادی تھے، میرے ابا جی کی اولاد میں چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی، سب سے بڑے بیٹے محمد حنیف خان (میرے والد) پھر محمد رفیق خان، پھر کبیر احمد خان، پھر صغیر احمد خان، پھر نصیر احمد خان اور اس کے بعد شبیر احمد خان تھے۔

میرا نسب یہ ہے:

تنویر احمد خان، بن محمد حنیف خان، بن صوبیدار دوست محمد، بن نذیر احمد خان، بن حافظ عبدالصمد خان۔

میرے خاندان کا تعلق فوج سے تھا، میرے دادا فوج میں ملازم تھے، آخری ملازمت کے ایام میں وہ اول رسالہ یعنی فرسٹ اسکنر ز ہارس سے تبدیل ہو کر پلٹن میں چلے گئے تھے، وہاں سے صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے جو رسالے کے رسالدار کے برابر ہوتا تھا۔

ہمارا شجرہ موجود ہے، اور راجپوتوں میں تو بغیر شجرہ کے کسی کو راجپوت مانتے ہی نہیں؛ وہ شجرہ الگ صفحہ پر تحریر کر دیا گیا ہے۔

وطن مالوف

میرا وطن مہندر گڑھ ہے، یہ ابتداءً ایک قصبہ تھا، بعد میں شہر اور ضلع بن گیا تھا، اُس وقت اِس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہوگی، اس قصبہ کا نام پہلے کانوڈ تھا، یہ نواب جھجر کی راجدھانی تھی اور یہاں

پر ان کا قلعہ تھا، غدر میں سب سے زیادہ مزاحمت نواب جھجر کی طرف سے ہوئی، یہ ان کی بہت بڑی ریاست تھی، ریواڑی، نارنول، کانوڈ، حصار، سرسہ، بھوانی، کرنال اور روہتک، جھجر، کلانور، بھنڈا، یہ سب نواب صاحب جھجر کی راجدھانی تھی۔

مہندر گڑھ کے جس محلے میں ہم رہتے تھے اس کا نام محلّہ راٹھوڑان تھا، اور یہ محلّہ قصبہ کے ابتداء میں ہی تھا، اور اس محلّہ کا پہلا مکان ہمارا تھا، گو ہمارے گھر آبادی کے بیچ میں بھی تھے، مگر اس محلّہ کے شروع میں سب سے پہلے ہماری حویلی آتی تھی جو میرے بڑے چچا رسالدار رفیق احمد خاں مرحوم نے بنائی تھی، جہاں سے شہر کی آبادی شروع ہوتی تھی اس سے متصل لبِ سڑک لیفٹننٹ احمد علی خان صاحب کی گیراج تھی۔

ہمارے یہاں گھر میں کوئی فضول بات نہیں ہوتی تھی، تمام گھرانے میں کوئی بات خلافِ شرع نہیں ہوتی تھی، ہمارے یہاں فوٹو نہیں کھنچتے تھے، اور نہ کوئی تصویر ہوتی تھی، ہمارے گھر میں سب نمازی لوگ تھے، عبادت گزار تھے، اللہ اور اس کے رسول کے ذکر کے علاوہ کوئی ذکر ہمارے گھر میں نہیں ہوتا تھا، ہماری اماں جی کی مجلس میں بھی یہی باتیں ہوتی تھیں۔

اوپر خاندان میں اسلام کی ابتداء

ہمارے جدِ امجد جو سب سے پہلے مسلمان ہوئے، ان کا نام جھنڈے راؤ ہے، قصّہ اس کا یہ ہوا کہ ان کا تعلق قنوج راجدھانی سے تھا اور قنوج کی راجدھانی میں مہاراجہ قنوج کے فوت ہونے کے بعد جب یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ اس کی تخت نشینی کس کو ملے، اس سلسلہ میں دو بھائیوں میں جھگڑا تھا، ایک بھائی کہتا تھا میں حقدار ہوں، دوسرا کہتا تھا میں حقدار ہوں، بڑے بھائی جھنڈے راؤ کی مہاراجہ بیکانیر کے یہاں شادی ہوئی تھی، جو کہ یہاں مہاراجہ بیکانیر کی ریاست کی فوج کے سپہ سالار تھے، اور بیکانیر میں ہی رہتے تھے، چھوٹا بھائی قنوج میں باپ کے ساتھ رہتا تھا، جب باپ کا انتقال ہوا تو چھوٹا بھائی سازش کر کے تخت نشین ہو گیا، بڑا بھائی (جھنڈے راؤ) اپنے باپ کی کریا کرم کی رسومات میں شرکت کے لئے وہاں مختصر سپاہیوں اور اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ

پہنچا، اس کو یہ بھی امید تھی کہ میں ہی اپنے باپ کے تخت کا وارث ہوں، اور مجھے ہی وہاں کا راج پاٹ ملے گا، یہاں پہنچ کر دیکھا تو معاملہ الٹ ہو چکا تھا، اور چھوٹا بھائی تخت پر قبضہ کر چکا تھا، جھنڈے راؤ نے جب یہ دیکھا تو وہ خاموشی سے رسومات میں شریک رہا، سوچا کہ میں تو بیکانیر میں سپہ سالار رہوں، اور وہاں اچھی عزت ہے، کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور بھائی سے یہ کہا کوئی بات نہیں تم یہاں حکومت کرتے رہو، مجھے اس کی ضرورت نہیں اور خاموشی سے بیکانیر واپس چل پڑا، لیکن چھوٹے بھائی کو یہ خطرہ تھا کہ یہ بڑا بھائی بیکانیر پہنچ کر اپنی فوج کے ساتھ واپس آ کر حملہ آور ہوگا، اور مجھ سے حکومت چھین لے گا، اس لئے اس نے اپنے آدمیوں کو اس سے آگے روانہ کر دیا کہ ایسی جگہ جو ویران ہو ان پر حملہ کر کے سب کو ختم کر دینا۔

جھنڈے راؤ کے ساتھ کچھ حفاظتی عملہ تھا جب یہ لوگ چلتے ہوئے مہندر گڑھ سے باہر ایک میدان جو خشک برساتی ندی کا میدان تھا، وہاں پہنچے تو مخالفین اچانک حملہ آور ہو گئے اور لڑائی شروع ہوگئی، فریقِ مخالف کافی لوگ تھے، نتیجے میں یہ سب مارے گئے، ایک مسلمان درویش جو قریب ہی ایک جھونپڑی میں رہتے تھے، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، جب معرکہ ختم ہوا تو یہ وہاں پہنچے، وہاں ایک ڈولی بھی رکھی تھی جس میں جھنڈے راؤ کی بیوی اور دو بچے تھے، جن کے ساتھ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی، راجپوتوں میں عورتوں، بچوں کا مارنا بہادری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو بہت معیوب سمجھتے ہیں، چنانچہ ان بابا صاحب نے باپردہ طریقہ پر ان خاتون سے پوچھا تم کون ہو اور یہ لوگ کون تھے؟ اس نے سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ فلاں لاشوں میں جو وہ شخص پڑا ہے وہ میرا خاوند ہے، بابا نے اس کو جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے اور اس کا سانس چل رہا ہے البتہ زخمی ہے، بابا نے اس عورت سے کہا کہ تمہارا شوہر زندہ ہے اور زخمی ہے تم میری مدد کرو تو اس کو اٹھا کر میری جھونپڑی تک لے چلتے ہیں، اس کی مرہم پٹی میں کروں گا شاید یہ بچ جائے چنانچہ وہ عورت اور بابا دونوں مل کر اس کو اٹھا کر جھونپڑی پر لے گئے جہاں اس کی مرہم پٹی کی گئی پھر کچھ عرصہ بعد اس کو ہوش آ گیا، اور کچھ دنوں میں زخم ٹھیک ہو گئے، تندرست ہو گیا، یہ سانحہ عجیب تھا، جہاں سے ایک دوسری تاریخ نے جنم لیا، بابا نے جب یہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ تمہارا کیا مذہب ہے؟ اس پر

جھنڈے راؤ نے جواب دیا کہ بابا میں تو مر چکا تھا، تمہاری وجہ سے مجھے دوسری زندگی ملی ہے اب تو جو تمہارا مذہب ہے وہی میرا مذہب ہے اور جو تمہارا حال ہے اور رہائش ہے وہ میری جگہ اور وطن ہے اب تو بس میں تمہارے پاس رہوں گا، جہاں کا میں ہوں ان لوگوں کو جا کر اب میں کیا منہ دکھاؤں گا، چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہوکر ان مسلمان درویش کے پاس ہی رہنے لگے اور یہاں ایک درویش بزرگ کی جھونپڑی سے ہی ہمارے خاندان کے اسلام کی کی ابتدا ہوتی ہے۔

میرے بچپن کے حالات وواقعات

اپنے بچپن کے چند حالات ذکر کرتا ہوں۔

میری پیدائش کے وقت میرے ابا جی اپنی مدتِ ملازمت پوری کر کے پینشن پر آ چکے تھے، میرے والد رسالدار محمد حنیف خان کی میں بڑی اور پہلی اولاد تھا، اس لیے میرے دادا اور دادی اماں نے میری پرورش کی، انہیں کی گود میں میں بڑا ہوا ہوں۔

احقر اپنے والد محترم کو بھیّا جی کہتا تھا، اس لئے کہ میں ان کی سب سے بڑی اولاد تھا۔ اور میرے تمام چچا بھی ان کو بھیّا جی کہتے تھے اسی لئے میرے بھائیوں سمیت سب نے بھیّا جی کہنا شروع کر دیا اور اپنی والدہ صاحبہ کو ان کی دیکھا دیکھی بھابھی صاحبہ کہنا شروع کر دیا اور آخر تک اسی طرح کہتے رہے۔

ایک بات یہ بتا تا چلوں کہ میرے ساتھ کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو امتیازی شان رکھتی ہیں، مثلاً یہ کہ میں پیدائشی طور پر مختون ہوں، اور تا حال زیرِ بغل بال قدرتی طور پر نہیں ہیں۔

بچپن میں کمزور واقع ہونا

میں پیدائشی طور پر بہت نحیف کمزور اور لاغر تھا، گویا کہ سوکھے کا مرض تھا، یہاں تک کہ میرے سر میں ہڈیوں کے جوڑ وغیرہ سب دکھائی دیتے تھے، تالو بالکل ہلتا ہوا دکھائی دیتا تھا، شیر احمد خان صاحب (جو ہمارے دادا کے بڑے بھائی تھے) کو جڑی بوٹیوں سے بھی شغف تھا، انہوں نے میرا علاج کیا اور علاج یہ تھا کہ آکھ کے درخت کا دودھ ایک پھائے پر لگا کر میرے

تالو اور سر پر پوری طرح جما دیا، اور یہ فرمایا کہ یہ پھایہ چپک گیا ہے، جب یہ خود اترے تو اسے اُترنے دینا، چنانچہ وہ لگا رہا اور کافی عرصہ کے بعد وہ اترا، اس سے جو مجھے سوکھے کا مرض تھا وہ چلا گیا، لیکن کمزور میں پھر بھی رہا، جوانی تک جسمانی اعتبار سے میرے اوپر گوشت پوست نہیں تھا، پتلا دبلا ہی رہا۔

میرے بچپن کے کھیل

بچپن میں ہمارے یہاں تین چار کھیل کھیلے جاتے تھے، ایک گلی ڈنڈا کھیلا جاتا تھا اور ایک کھیل جسے ہمارے یہاں چیلہ کوڈی کہتے تھے، یہ کھیل بھی ہم نے کھیلا، اور چیلہ کوڈی کھیل یہ ہوتا تھا کہ چونے جیسا سفید پتھر ہوتا تھا، ریگستانی ہمارا علاقہ تھا، کسی ٹیلہ پر ہم بیٹھ جاتے تھے اور دو پارٹی بنا لیتے تھے، اور وہ پتھر ہم پھینک دیتے تھے، اور اس پتھر کو لینے کے لئے دونوں پارٹی وہاں سے چلتی تھی، رات کو سفیدی کی وجہ سے پتھر نظر آ جاتا تھا، اور چاند کی روشنی بھی ہوتی تھی، اب اسے ایک آدمی اٹھالیتا تھا، اور وہ بہت ترکیب سے اٹھاتا تھا، اگر کسی کو یہ پتہ چل گیا کہ کس نے اٹھایا ہے تو سب اس پر پل پڑتے تھے، اور فریقِ مخالف اسے چھین لیتے تھے، اب اگر چھیننے کے دوران اس نے اپنے کسی ساتھی کو پھینک دیا، اس نے اٹھالیا پھر اس کو پکڑ لیا، غرض یہ کہ کون سا فریق اس پتھر کو اس مقام تک جہاں سے پتھر پھینکا گیا تھا لے جاتا ہے، بس یہ ایک کشمکش ہوتی تھی اس کھیل میں، کھینچا تانی، اس سے چھین رہے ہیں، دس آدمی اس پر پڑے ہوئے ہیں، بس یہ ہوتا تھا۔

کبڈی بھی کھیلی جاتی تھی، کُشتیاں بھی ہمارے یہاں ہوتی تھیں، یہ تو تھے بچپن کے میرے کھیل، اور جب میں تھوڑا سا بڑا ہو گیا تو ہم نے فٹبال اور ہاکی بھی کھیلنا شروع کی، اور جب جوانی کے قریب پہنچا تو والی بال کھیلنا شروع کی اور ایک عرصہ تک کھیلتا رہا، اور بہت کھیلا، چونکہ میں اپنے قد کے اعتبار سے لمبا تھا، اور یہ کھیل لمبے آدمی کو فائدہ پہنچاتا ہے، ویسے بھی لمبا آدمی اس کے نیٹ (جال) پر اچھا کھیلتا ہے۔

یہ والی بال کا کھیل میں نے بعد میں جلال آباد میں جا کر بھی کھیلا، گو حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کے

علم میں نہیں تھا، جلال آباد میں وزیر علی خان، شفقت علی خان پٹھان خاندان کے یہ لوگ کھیلتے تھے، میں ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ مدرسہ میں ہمیں کبھی کبھی کبڈی کھیلواتے تھے، حضرت نے طلباء کو لکڑی چلانے کی مشق بھی سکھائی، ایک زمانے میں حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کی حیات میں افریقی طالب علم حضرت کے یہاں آنے شروع ہو گئے، انہوں نے مدرسہ میں والی بال کھیلنا شروع کر دیا، بھائی جان (حضرت کے صاحبزادہ) نے اس کی مخالفت کی، ان دنوں حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے، بھائی جان نے جواز وعدمِ جواز کی بحث شروع کر دی، عدمِ جواز کی کوئی دلیل راجح تو ہے نہیں، اس لئے کہ یہ کھیل ایسا ہے کہ نہ تو اس میں ستر کا مسئلہ ہے، اور نہ کوئی اور عدمِ جواز کی بات، حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ اس وقت پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے اور لاہور میں اپنے بھانجے مولانا وکیل احمد خاں کے یہاں مقیم تھے، یہ واقعہ تو جلال آباد میں ہو رہا تھا اور بھائی جان اس سے نمٹ رہے تھے۔

یہاں حضرت کے پاس پاکستان کے کچھ طلبہ آئے اور سارا قصہ سنایا، حضرت نے فرمایا اچھا ٹھیک ہے، میں جاؤنگا تو دیکھ لوں گا، اتفاق سے میں بھی پیچھے سے ہندوستان چلا گیا، اور میں اس زمانہ میں بھی وہاں موجود تھا، حضرت نے دو یا تین مجلسیں طلبہ کے ساتھ کیں، اور اس میں حضرت نے طلبہ کو سمجھایا کہ میں تو یہ نہیں کہتا کہ یہ کھیل ناجائز ہے، مگر یہ کھیل عربی مدارس میں کھیلا نہیں جاتا، انگریزوں کے کھیل ہیں، تو گویا اس میں ان کا تشبہ ہے، ہم اپنے مدرسہ کو ایسے طریقہ پر رکھنا چاہتے ہیں کہ جو طرز سرکاری اور انگریزی اسکولوں کے ہیں وہ یہاں نہ رہیں، اس وجہ سے میں اپنے پیارے طلبہ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ جواز وعدمِ جواز کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ اس وجہ سے کہ یہ عربی مدارس کی روایات کے خلاف ہے وہ اپنی گیند لا کر یہاں میرے پاس جمع کر دیں، چنانچہ انہوں نے لا کر حضرت کے پاس جمع کرا دیں۔

ہمارے حضرت کے اندر وسعتِ نظری بہت تھی وہاں پر ایک شکل یہ پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت کے صاحبزادہ بھائی جان ایک اقدام کر چکے تھے، اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ میں یہ کھیل یہاں کھیلنے

نہیں دونگا، اب چونکہ یہ بات ہوچکی تھی، اور بھائی جان مہتمم تھے، حضرت نے یہ سوچ کر کہ اہتمام کے سارے تانے بانے بکھر جائیں گے، اس لئے حضرت نے اُسے اس انداز سے منع فرمادیا، ورنہ مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ حضرت اس کو بند کریں گے، یہاں چونکہ ایک انتظامی مسئلہ ایسا پیدا ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے حضرت کو بند کرنا پڑا۔

بچپن میں حافظے کے قوی ہونے کا واقعہ

حافظہ کے سلسلہ میں جن کو پیدائشی عجائبات کہتے ہیں ان میں میرا بہت قوی حافظہ تھا، اور کچھ قدرتی باتیں ایسی تھیں، جو اتفاقاً یا ویسے ہی ایسی پیدا ہوگئی تھیں، جن پر سب حیرت کرتے تھے، ناچیز کو اللہ تعالیٰ نے حافظہ بلا کا عطا فرمایا تھا، جو بات سُن لیتا یا دیکھ لیتا تھا وہ بات مجھے یاد ہوجاتی تھی اور یاد رہتی تھی:

ہمارے رشتہ کے پردادا تھے، جن کو ہم دادا ابّا کہتے تھے، محمد ابراہیم خان ان کا نام تھا، دادا ابّا کے نام سے مشہور تھے، وہ ہمارے گھر اکثر تشریف لاتے تھے، صحن کے سامنے ہمارا زینہ تھا، اس پر چڑھ کر اوپر ہماری مردانہ نشست تھی، وہاں جاکر وہ ہمارے ابا جی کے پاس بیٹھتے تھے، جب زینہ پر وہ چڑھتے تھے تو ان کا معمول تھا کہ وہ یہ دعا پڑھتے جاتے اور چڑھتے جاتے، ''رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْن''ظاہر ہے کہ میں بھی وہیں کہیں پڑا رہتا ہونگا، تو میں نے جو سب سے پہلے بولنا سیکھا تو وہ یہ مذکورہ دعا تھی، اب گھر والے بڑے حیران، کہ نہ اماں کہا نہ ابا کہا، رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا کہنا شروع کیا، اس قسم کی بات بچپن میں بڑے تعجب کی بات ہوتی تھی۔ ذالک الفضل من اللہ۔

ایک اور عجیب واقعہ

میری دادی اماں نے جن کو میں اور سب گھر والے اماں جی کہتے تھے، مجھے میری والدہ سے لے رکھا تھا اور وہ مجھے اپنے پاس ہی رکھتی تھیں، پالنے میں، کھلانے میں، پلانے میں، پرورش کرنے میں، سُلانے میں، بس وہی خیال رکھتی تھیں، ان کا معمول یہ تھا کہ انہیں آخری پارہ تقریباً آدھا حفظ

یاد تھا، جب رات کو وہ سوتی تھیں اسے پڑھتی تھیں، اور ایصالِ ثواب وغیرہ کر کے سوتی تھیں، اور میں دادی اماں کے برابر میں لیٹا ہوا ہوتا تھا، وہ آدھا پارہ سنتا تھا، اس سے وہ مجھے بھی یاد ہو گیا، اس طریقہ سے نہیں کہ یہ کونسی سورت ہے، یہ میں بالکل نہیں جانتا تھا، بس یہ کہ مجھے کہیں سے شروع کرا دیں، میں اس جگہ تک جہاں تک دادی اماں پڑھتی تھیں پڑھ دیتا تھا، اور اس وقت میری عمر مشکل سے اڑھائی تین سال ہو گی۔

جب وہ سیپارہ کا حصہ مجھے یاد ہو گیا اور ایک دن میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا تھا تو میری دادی اماں (جن کو میں اماں جی کہتا تھا) نے کہیں سن لیا، کہ یہ کیا کر رہا ہے، اب نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں چرچا چلا کہ تنویر تو یہ پڑھتا ہے، تنویر تو یہ پڑھتا ہے، بھئی کیسے پڑھتا ہے، سناؤ سب نے سنا، ابا جی (میرے دادا ابا) رحمہ اللہ کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی سنا، اتنا یاد ہے کہ اس کی تلاوت قرآن مجید کی ترتیب کے خلاف پہلے، الحمد شریف، پھر قل اعوذ برب الناس، قل اعوذ برب الفلق۔ پھر قل ھو اللہ احد، پھر تبت یدا، پھر اذا جاء، پھر قل یا ایہا الکفرون، اس طریقہ سے میں پڑھتا تھا، اور پہلے بچوں کو یونہی پڑھایا جاتا تھا، میں اذا زلزلت الارض تک پڑھتا تھا، جب یہ تحقیق ہو گئی کہ اس کو یہ سیپارہ کا حصہ یاد ہے، اور اس طریقہ سے یاد ہے تو یہ بھی عجوبہ ہو گیا۔

اور میرے ابا جی (دادا جی) رحمہ اللہ مجھے کندھے پر اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے، اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اسے اتنا کلام مجید یاد ہے، لوگ پوچھتے کیسے یاد ہے، ارے بھئی ہمیں سناؤ، چنانچہ ابا جی رحمہ اللہ نے کہیں سے پڑھنا شروع کیا، میں نے بھی وہاں سے پڑھنا شروع کیا اور چل پڑے۔

ابا جی رحمہ اللہ کی ایک بڑی خواہش تھی کہ میری اولاد میں کوئی لڑکا حافظ ہو اور انہوں نے اپنے لڑکوں پر کافی کوشش کی اور حفظ کے لئے بٹھایا لیکن کوئی حفظ نہیں کر پایا، ہمارے سب سے چھوٹے شبیر چچا، ان سے بڑے نصیر چچا دونوں کو حفظ کرانا شروع کیا، لیکن ان سے حفظ ہو نہ سکا، نتیجہ یہ کہ ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی، جب میرا یہ سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے کہا بس میں اپنے اس بیٹے کو حافظ بناؤں گا، اب تو یہ حافظ بن ہی گیا، چنانچہ بچپن سے ہی میرے کانوں میں یہ آواز پڑنے لگی کہ یہ حافظ ہو گا، اور کبھی اتفاق سے میں بولتا تو یہی کہتا کہ ہاں میں حافظ بنوں گا۔

ابتدائی تعلیم

میں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مکتب میں شروع کی، اس مکتب کا نام مدرسہ زینتُ الاسلام تھا، جس کے صدر میرے ابا جی رحمہ اللہ تھے، یہ ہمارے سب سے قریب ترین مدرسہ تھا، اس کے علاوہ شہر کے اخیر میں ایک سرکاری اسکول تھا، ہمارے یہاں اس مکتب میں پانچویں جماعت تک پڑھایا جاتا تھا، اس کے ساتھ دینی کتابیں مثلاً تعلیم الاسلام مصنفہ مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ اور قرآن مجید حفظ وناظرہ پڑھایا جاتا تھا، میں نے اسی مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا۔

جہاں تک میری یاد ہے جب میں قاعدہ پڑھنے جاتا تھا، اس وقت ہمارے یہاں ناگ پھنی لگائی جاتی تھی، گھاس لگا کر چاروں طرف باڑ کے طور پر یہ لگائی جاتی ہے اور یہ باڑ دیوار کا کام کرتی تھی، مدرسہ کے راستوں میں یہ ناگ پھنیاں تھیں، بہت زمانہ تک تو یہ ہوتا رہا کہ ابا جی رحمہ اللہ نے قاعدہ دلا کر مدرسہ میں بٹھا دیا، دوسرے دن جب میں گھر سے مدرسہ کے لئے نکلا تو راستہ میں قاعدہ پھاڑا اور ناگ پھنی کے پیچھے پھینک دیا، اور خود غائب، تو انہیں ہر دوسرے تیسرے روز ایک قاعدہ خریدنا پڑتا تھا، بچپن کی ناسمجھی کی وجہ سے میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ مجھے کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

پھر اس کے بعد ہمارے محلے کے حافظ عبدالعظیم خان مرحوم تھے وہ حافظ تھے، وہ کچھ زمانہ تک ہمارے یہاں قاعدہ کے مدرس رہے، لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان سے قاعدہ پڑھا ہو، ایک دفعہ انہوں نے میرے چہرہ پر مارا تو آنکھ کے پاس کچھ زخم سا ہو گیا، وہ گلچے سے مارتے تھے (یعنی مُکّا بنا کر اور انگوٹھا نکال کر اُس سے مارتے تھے) ان کے انگوٹھے کا ناخن میرے چہرہ میں چبھ گیا، میرے ابا جی رحمہ اللہ بہت ناراض ہوئے اور مجھے وہاں سے اٹھالیا، پھر شاید حافظ صاحب کو بھی برخواست کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد مولانا حافظ ممتاز علی خان رحمہ اللہ جو ہمارے شہر نارنول کے تھے، ان کے توسط سے مولوی محمد حسن صاحب دارالعلوم دیوبند سے بطورِ مدرس آئے، پھر ان کے توسط سے ایک قاری مظہر الحق صاحب جو بعد میں دارالعلوم دیوبند میں ناظمِ مطبخ ہو گئے تھے، وہ مدرسہ میں آئے، میں نے نورانی قاعدہ وغیرہ مولوی محمد حسن صاحب اور قاری مظہر الحق صاحب سے پڑھا، اور اس

کے بعد حفظ میں نے مولوی محمد حسن صاحب کے پاس کیا۔

ان سے میں نے گلستان بوستان بھی پڑھی، پندنامہ، کریما، یہ بھی پڑھا، میزان منشعب کتاب الصرف اور کتاب النحو وغیرہ ابتدائی کتابیں بھی انہیں سے پڑھیں، اور تقریباً بارہ سال کی عمر میں میں نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، میرا حافظہ بہت قوی تھا، تھوڑی دیر دیکھ کر پڑھا اور یاد ہوگیا اور سنا دیا، لیکن میرے ساتھی جو میرے ساتھ حفظ کررہے تھے، وہ مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے، وہ حفظ نہ کرسکے۔

مجھے مولوی محمد حسن (میرے استادِ محترم) صاحب نے یہ کہا تھا اور مجھ سے یہ درخواست کی تھی کہ تم ابھی اپنے آپ کو پورا حافظ مت کہو نہ اپنے گھر والوں کو، تاکہ تمہارے ساتھیوں کا بھی ایک آدھ سال میں پورا ہوجائے تو سب ساتھ کہہ دیں گے، ورنہ ان کے والدین کو خیال ہوگا، کہ یہ کیا بات ہے ہمارے بچے قرآن مجید ختم نہ کرسکے، اس طریقہ سے انہوں نے سال ڈیڑھ سال مجھے یہ بات کہنے سے روکے رکھا، اور میں باوجود حافظ ہونے کے کسی سے یہ نہ کہہ سکا کہ میں حافظ ہوگیا ہوں، اس کے بعد میں نے تقاضا کیا کہ میں تو اب مزید انتظار نہیں کرسکتا، اس کے بعد مولوی محمد حسن صاحب نے ان لڑکوں کا جو باقی رہ گیا تھا ان کو ناظرہ کے بطور ختم کرایا، اور اعلان کردیا کہ یہ سب حافظ ہوگئے، لیکن ان ساتھیوں میں سے جتنے بھی اس وقت حافظ بنے تھے، بعد میں ان میں سے کوئی حافظ نہیں رہا، سب بھول گئے، سب تقریباً میرے سے بڑی عمر کے تھے، نام کے تو حافظ تھے لیکن کام کے نہیں، ان میں سے ایک میرے ساتھی یہاں حیدرآباد میں بھی رہتے تھے اُن کا نام حافظ عبدالوحید خان صاحب تھا۔

حفظ کے بعد اپنے مکتب میں چار جماعت تک پڑھا تھا، لیکن مولوی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ کے کہنے کی وجہ سے کہ یہ حفظ کررہا ہے اس کے دماغ پر زور پڑے گا، اباجی رحمہ اللہ نے مجھے درسی کتابوں سے ہٹالیا، حالانکہ میں نے بہت کہا کہ میرے ذہن پر کوئی زور نہیں پڑرہا ہے، لیکن میری اباجی رحمہ اللہ نے ایک نہ مانی اور زبردستی مجھے ہٹالیا، البتہ پانچویں کی کتابیں میں نے ویسے ہی پڑھ لی تھیں، اور گلستان بوستان بھی اس طریقہ سے پڑھیں کہ ایک دفعہ پڑھ کر کتاب بند کرکے رکھ دیتا

تھا، دوسرے دن جب میرے ساتھی آتے تو دور سے ہی میں ان کو بتا دیتا تھا جو مجھے زبانی یاد ہوتا تھا، حافظہ اس قسم کا تھا کہ بس ایک دفعہ کتاب کا سبق پڑھ لیا اور زبانی یاد ہو گیا۔

میرے ابا جی نے مجھے اپنی تمنا اور آرزؤوں کے ساتھ حافظ بنایا۔

حفظ کے بعد پھر علمِ دین پڑھنے کے لئے مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوا، پھر وہاں سے حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ کی خدمت میں چلا گیا، اس زمانہ میں حضرت کے یہاں ہدایہ تک پڑھایا جاتا تھا، ہدایہ کے بعد حضرت نے ہمیں دارالعلوم دیوبند بھیج دیا، اور میں دارالعلوم چلا گیا، اور وہیں سے سندِ فراغت حاصل کی۔

دہلی مدرسہ امینیہ میں داخلہ

تقسیم سے کافی پہلے میں دہلی آ گیا اور وہاں کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ امینیہ میں داخل ہو گیا، جب میرا مدرسہ امینیہ میں ایک سال گذر گیا اس مدرسہ امینیہ میں مولوی محمد حسن صاحب نے مجھے داخل کرایا تھا، اور مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مجھے مولانا ضیاء الحق صاحب کے سپرد فرمایا جو وہاں صدر مدرس تھے انہیں ہم بابا، بابا کہتے تھے، بہت بزرگ اور عابد تھے، ان کے برابر میں مجھے کمرہ دیا گیا اور خصوصی طور پر مجھے وہاں رکھا گیا، اور مولانا ضیاء الحق صاحب سے کہا گیا کہ آپ ان کا خاص طور سے خیال رکھیں، اور یہ میں نے دونوں حضرات سے اپنی شکایت کی تھی کہ اور تو کچھ نہیں ہے بس ایک بات ہے کہ میں صبح اٹھ نہیں سکتا، آپ صبح مجھے کسی طریقہ سے اٹھوا سکتے ہیں تو اٹھوالیا کریں، مولانا ضیاءُ الحق صاحب نہ صرف عابد تھے بلکہ اوقات کے بھی بہت پابند تھے، انہوں نے اپنے معمولات کے چوبیس گھنٹے کا ایک چارٹ بنا کر اپنے کمرہ میں لگایا ہوا تھا، اسمیں بعض باتیں مثلاً پندرہ منٹ کا قیلولہ تھا تو سولہ منٹ کبھی نہیں ہوتے تھے، پندرہ منٹ ہی کے بعد اٹھ جاتے تھے۔

اور اکثر وہ فجر کی نماز پڑھاتے تھے، اور جب فجر کی نماز پڑھاتے تھے تو ان کی یہ بات طلبہ میں مشہور تھی کہ اگر بابا نماز پڑھا رہے ہیں اور وہ رکوع میں ہیں تو آدمی وضو کر کے دو سنتیں پڑھ کر رکوع میں

مل لے گا، اتنا لمبا ان کا رکوع ہوتا تھا، خیر یہ تو مبالغہ ہے بہرحال بہت لمبا ان کا رکوع ہوتا تھا، طلبہ میں یہ مشہور تھا۔

اس زمانے میں میری حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے یہاں تھانہ بھون حاضری اور آمدورفت شروع ہوگئی تھی، مولانا صاحب مجھ سے پوچھا کرتے تھے تم کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا تھانہ بھون جاتا ہوں، تھانہ بھون کس کے پاس جاتے ہو؟ میں نے کہا حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے پاس، ہاں بھئی دل میرا بھی بہت چاہتا ہے کہ ایک دفعہ میں بھی ان کی زیارت کروں، اور تو میں کسی کو بزرگ مانتا نہیں، ان کے بارے میں میرا دل چاہتا ہے، وہ کسی سے بیعت نہیں تھے، بڑے خشک آدمی تھے، اب یہ تو پتہ نہیں وہ تھانہ بھون گئے یا نہیں گئے، لیکن وہ مجھ سے یہ بات کہا کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ نے مولانا ضیاء الحق صاحب سے معلوم کیا کہ تنویر کا کیا حال ہے؟ کچھ اس کی نیند کم ہوئی یا پھر نہیں، جواب میں فرمایا کہ تنویر میاں کی نسبت بڑی قوی ہے، ان کی نیند تو اپنی جگہ ہے ہاں البتہ میں تہجد میں دس منٹ لیٹ اٹھنے لگا ہوں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے مکاتبت واستفادہ کا شرف

میں نے اپنے علاقہ سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے خط وکتابت بچپن سے ہی شروع کردی تھی، اور میری طالب علمی تک وہاں جانے سے پہلے پہلے میرے پاس حضرت کے بہت سے خطوط جمع ہوگئے تھے، جو میں نے بچپن سے ہی لکھے تھے، لیکن وہ فسادات کے زمانے میں (جن کی تفصیل آگے آئے گی) سارے ضائع ہوگئے، اور اباجی رحمہ اللہ کے خطوط بھیاجی رحمہ اللہ اور منشی چچا رحمہ اللہ کے خطوط کا ذخیرہ بھی تھا افسوس کہ وہ بھی سب ضائع ہوگئے، بہت قیمتی ذخیرہ تھا "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ"

خط کا کیا ذکر خطوط والے ہی نہیں رہے۔

ورنہ وہ ایک بہت قیمتی ذخیرہ تھا، جو میرے بچپن کے حالات پر تھا، کہ میں نے اپنی طالب علمی کا پورا آغاز بھی نہیں کیا تھا، مدرسہ امینیہ میں بھی نہیں داخل ہوا تھا، اس سے پہلے سے میں نے

حضرت سے خط و کتابت کی تھی، ذہنی اعتبار سے کہیں اور نگاہ جمتی نہیں تھی، اور میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر مجھے کہیں بیعت ہونا ہے تو بس میں وہیں بیعت ہوسکتا ہوں، اور کہیں نہیں، وہ یقیناً اتنے بڑے بزرگ ہیں، دماغ میں یہ ایک بات تھی، ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن ان کی تصانیف اور مواعظ وغیرہ بہت کچھ دیکھ لئے تھے۔

چونکہ ہمارے جو استاد تھے ان کے پاس اس زمانہ میں التبلیغ رسالہ آتا تھا، اور اس میں حضرت کے مواعظ ہوتے تھے، تو وہ مواعظ اور حضرت کی کتابیں بچپن سے پڑھتا رہا، پھر اس کے بعد حضرت کے ملفوظات آنے شروع ہوگئے تھے پھر وہ پڑھنے شروع کر دیئے، تو بچپن سے جو کتابیں پڑھیں وہ حضرت ہی کی پڑھیں، تربیت السالک بھی اس زمانہ میں آ گئی تھی وہ بھی پڑھی اور بھی بہت سی کتابیں پڑھیں، مواعظ تو پڑھتے ہی تھے۔

والد صاحب اور ابا جی رحمہما اللہ کو میرے معاش کی فکر تھی اور یہ سوچتے تھے کہ یہ فوج میں نہیں جائے گا اور تو کچھ یہ کر نہیں سکتا، کوئی تجارت ہی کرے گا، ہمارا خاندان تجارتی نہیں تھا، ان کو یہ فکر تھی کہ اس کے لئے کاروبار کا کوئی ایسا ذریعہ بنا دیں کہ اس کو بعد میں تکلیف نہ ہو۔

اسی غرض سے ابا جی اور والد صاحب رحمہما اللہ نے مجھے اسی زمانے میں دھلی میں ہی کاروبار کرایا، کتب خانہ کھلوا کر دیا، وہلی میں دریبہ کلاں جامع مسجد کے شمال میں ایک بڑا کتب خانہ کر کے دیا، اس کا نام تھا کتب خانہ قادریہ۔

شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ اس وقت حیات تھے، میرے ایک استاد تھے میں نام نہیں ظاہر کروں گا، وہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ سے بیعت تھے، تو انہوں نے مولانا عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ کی نسبت سے قادریہ نام رکھ دیا، وہ کتب خانہ دو سال کے قریب رہا، لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ دیانتدار ثابت نہ ہوسکے۔ ان سے ابا جی رحمہ اللہ اور والد صاحب رحمہ اللہ نے یہ کہا تھا کہ آپ یہ کتب خانہ چلاتے رہیں، جب یہ تنویر فارغ ہوکر آئے تو اس کو چلتا ہوا کتب خانہ مل جائے گا، باقی آپ جانیں اور آپ کا کام جانے، اس زمانہ کے لحاظ سے وہ ایک بڑی جائیداد اور ایک بہت بڑا کاروبار تھا، وہ دیانتدار ثابت

نہیں ہوئے اور کتب خانہ بیچ دیا، لہٰذا یہ معاش اور کاروبار کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ سے تعلق اور جلال آباد میں داخلہ

امینیہ سے جلال آباد داخل ہوا؛ جلال آباد میں طالب علمی کے زمانہ میں ہمارے استاد مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ ہی تھے، لیکن کبھی کبھی مدرسہ کے نائب مدرس مولانا عابد حسین صاحب کے پاس حضرت ناراض ہوکر یا کسی اور وجہ سے بھیج دیا کرتے تھے کہ جاؤ میں نہیں پڑھاتا وہاں جا کر پڑھ لو، اس طریقہ سے کچھ ان سے بھی پڑھا، بس یہی دو مدرس تھے اس زمانہ میں اور وہاں ہدایہ تک تعلیم ہوتی تھی، ہدایہ کنز، قدوری، ادب کی کتابیں، منطق کی کتابیں، کافیہ، شرح جامی وغیرہ، یہ سب کتابیں ہم نے جلال آباد میں پڑھیں۔

یہ مدرسہ مفتاح العلوم کا ابتدائی زمانہ تھا، ہدایہ اولین تک یہاں تعلیم حاصل کی۔

احقر ابتدائی کتابیں صرف نحو کی پڑھتا ہوا مدرسہ امینیہ سے یہاں حاضر ہوا تھا، اس وقت ابتدائی کتابوں والے طلباء موجود نہیں تھے، حضرت نے تجویز فرمایا کہ ہدایۃ النحو، قدوری، نفحۃ الیمن اور دیگر کتابوں والے طلباء کے ساتھ بیٹھ کر یہ کتابیں پڑھنا شروع کردو اور فارغ وقت میں مجھ سے اپنی پچھلی کتابیں پڑھ لیا کرو، چنانچہ اس طریقے سے احقر نے اس جماعت میں داخل ہوکر مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، احقر کے ساتھیوں میں اس وقت مولوی سلیم اللہ خان، مولوی محمد رفیق احمد مرحوم، مولوی حشمت علی، مولوی احسان اللہ، مولوی حمید اللہ وغیرہ تھے، حضرت والا (مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمہ اللہ) کا یہ معمول تھا کہ مدرسہ جاتے ہوئے احقر کو ساتھ لے کر تشریف لے جاتے تھے اور واپسی میں بھی احقر ساتھ ہوتا تھا، اکثر احقر کا ہاتھ چلتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لے لیا کرتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ یہ بھی حضور ﷺ کی سنت ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے میری بچپن سے خط وکتابت شروع ہوگئی تھی، میں کافی خط لکھتا رہتا تھا، آخر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بعض وجوہات سے اصلاح وتعلیم کا سلسلہ اپنے مخصوص خلفاء کی طرف منتقل کرنے کا اعلان فرمادیا تھا، اس سلسلہ میں حضرت سے خط وکتابت میں یہ قصہ چل رہا تھا

کہ حضرت نے مجھے لکھا کہ تم کسی کو اپنا مصلح تجویز کرلو،اس پر بحث چل رہی تھی، میں نے لکھا کہ مناسبت آپ سے ہے،عقیدت آپ سے ہے،تعلق آپ سے ہے،آپ فرمارہے ہیں کسی کو مصلح تجویز کرلیں، کیسے کسی کو مصلح بنالیں بغیر مناسبت کے، بات سمجھ میں نہیں آئی، یہ خط وکتابت کافی لمبی چلتی رہی۔

پھر ایک مرتبہ میں نے مفتی محمد حسن صاحب رحمہ اللہ کو خط لکھا یہ امرتسر میں تھے،تقریباً پانچ مہینہ کے بعد ان کا جواب آیا، میں نے بڑے حضرت رحمہ اللہ کو شکایت لکھی، میں نے کہا کہ مصلح کا تو یہ حال ہے کہاں سے تجویز کروں، پانچ مہینہ بعد تو جواب آیا ہے،حضرت نے پہلے سے فہرست بھیجی ہوئی تھی پھر لکھا کہ کوئی اور مصلح تجویز کرلو، میں نے لکھا کہ میری زندگی تو ساری اسی میں گذر جائے گی، میں تو مصلح ہی دیکھتا رہوں گا۔

اور پھر میں نے یہ کہا کہ یہ بھی ایک ایسا قصہ ہے کہ اگر فرض کیجئے میں نے کسی کو مصلح تجویز کرلیااور میں نے ان سے ملاقات کی اور میری سمجھ میں نہیں آئے پھر کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے وہ خوبصورت نہ ہوں،ایسے ہوں ویسے ہوں، میں نے اپنی طرف سے بڑے حضرت کو بہت سی باتیں لکھیں،اس پر حضرت نے یہ لکھا کہ تم ایسا کرو کہ دیکھ کر مصلح تجویز کرو، پہلے کسی کے پاس جاؤ،اور دیکھ کر طبیعت میں مناسبت پاؤ،تو مصلح بنالو۔

پھر میں نے اس پر سوال شروع کیا کہ اتنا خرچہ میں کہاں سے لاؤں گا،کہ ایک ایک کے پاس رختِ سفر باندھ کر جاؤں،حضرت نے یہ جواب دیا کہ ایک ایک کا کرایہ مجھ سے منگا کر ایک ایک کے پاس جاؤ، پھر میں نے لکھا کہ بندہ کی عمر تو اب اسی میں گذرے گی ،بس میں آپ کے خلفاء کی زیارت کرتا رہوں اور جا کر ان کو دیکھتا رہوں،اور آپ سے پیسے منگاتا رہوں۔

بہرحال ایک صاحب حاجی نعمت اللہ خان جلال آباد کے تھے،وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ تمہارے خطوط جب حضرت کے پاس آتے تھے تو اکثر یہ فرمایا کرتے تھے،بہت ذہین لڑکا ہے اس نے بہت تنگ کررکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے قصبہ کے ایک صاحب تھے محمد ہاشم،وہ دہلی سے جلال آباد اور تھانہ بھون جاتے

تھے، میں نے ان سے پوچھا، انہوں نے کہا میں تو بڑے حضرت سے بھی بیعت ہو گیا اور میں نے اپنا مصلح بھی تجویز کر لیا، میں نے بڑے حضرت رحمہ اللہ سے ہی پوچھا تھا تو حضرت نے فرمایا کہ یہاں قصبہ جلال آباد میں مولوی محمد مسیح اللہ خان ہیں انہیں جا کر دیکھ لو، اگر تمہارے سمجھ میں آ ئیں تو ان کو مصلح بنا لو، میں وہاں گیا تو میرے تو وہ سمجھ میں آ گئے، اور میں نے ان کو اپنا مصلح بنا لیا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ اب اگر تم دوبارہ جاؤ تو جانے سے پہلے مجھے اطلاع کر دینا تاکہ میں بھی تیار ہو جاؤں، میں ان کو بھی دیکھ لونگا اور بڑے حضرت کی بھی زیارت ہو جائے گی، چنانچہ دوسری دفعہ جب وہ جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ گیا، جس وقت میں اسٹیشن پر پہنچا تو دوپہر کا تقریباً ایک بجا تھا، حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کو میرے آنے کی اطلاع نہیں تھی، ان کے آنے کی اطلاع ہو تو ہو کہ شاید انہوں نے پہلے سے اس کی اطلاع کر دی ہو لیکن میری اطلاع نہیں تھی، جب میں اسٹیشن سے دو میل چل کر قصبہ میں داخل ہوا تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ پونے دو کا وقت ہے، اب کسی کے یہاں جانا اور ان کو یہ ظاہر کرنا کہ ہم آئے ہیں، ان کو تکلیف دینا ہے کہ وہ ہمارے لئے کھانا تیار کریں، اس میں وقت لگے گا، تکلیف الگ ہو گی، اس لئے کھانا یہیں کھا لو تاکہ وہاں یہ کہہ دیا جائے کہ ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔

چونکہ حضرت کی کتابیں، ملفوظات، مواعظ اور تربیت السالک تو ہم پڑھ چکے تھے، اس لئے ان حضرات کا مزاج اور قواعد ذہن میں تھے، اس وجہ سے میں نے کہا یہ غلط چیز ہے، یہیں کھا لو، اب مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ یہاں جلال آباد میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کوئی روٹی پکا کر کھلانے والا ہو، یا کوئی ہوٹل ہو، پورے جلال آباد میں ایک شخص سیخ کباب بنا رہا تھا، میں وہاں پہنچا تو اس کو سلام کیا، اور میں نے کہا کہ کیا آپ کباب کے ساتھ ہمیں روٹی نہیں دے سکتے؟ اس نے کہا روٹی تو یہاں نہیں دی جاتی، البتہ چونکہ آپ مسافر ہیں اس لئے میں گھر سے پکوا دیتا ہوں، میں نے کہا ہاں پکوا دو، غرض انہوں نے اپنے گھر سے روٹی پکوائی اور ان سے کباب لے کر روٹی کھائی، خوب اچھی طرح سے کھا کر حضرت کی خدمت میں پہنچے۔

حضرت کے خادم حافظ عبدالرزاق رحمہ اللہ ملے، انہوں نے ہمارے لئے چارپائی بچھا دی کہ اس پر

لیٹ جاؤ، پانچ بجے حضرت برآمد ہوں گے، نمازِ عصر پڑھنے جائیں گے اس وقت ملاقات ہوجائے گی، چنانچہ ہم لیٹ گئے، تھوڑی دیر شاید دو یا تین منٹ بعد حضرت باہر تشریف لے آئے، اور اپنے خادم حافظ عبدالرزاق رحمہ اللہ سے کہا کہ وہ دو بزرگ جن کے بارے میں میں نے تم سے کہا تھا آ گئے یا نہیں؟ انہوں نے کہا یہ دو آدمی آئے تو ہیں، حضرت نے فرمایا یہی وہ دو بزرگ تھے، جن کے بارے میں میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ آئیں تو مجھے اطلاع کر دینا، تم نے اطلاع نہیں کی، انہوں نے کہا ابھی آئے ہیں۔

میں بڑا پریشان کہ ہم کہاں سے بزرگ ہوگئے، بات نہیں چیت نہیں، پہلے سے ملاقات نہیں، لینا نہیں دینا نہیں، بزرگی کہاں سے آ گئی، غرض حضرت سے سلام ودعا ہوئی، مصافحہ وغیرہ ہوا، اور حضرت نے یہ فرمایا کہ میں نے ان سے کہہ دیا تھا، آپ کی آمد کے بارے میں، اگر آپ لوگ آ جائیں تو وہ مجھے اطلاع کر دیں، میں نے کہا حضرت میری طرف سے تو کوئی آپ کو اطلاع تھی نہیں، حضرت نے فرمایا کہ ہاں بھئی کبھی کبھی ویسے ہی اطلاع ہو جاتی ہے، اس لئے میں نے ان سے کہہ دیا تھا، اچھا میں آپ کے لئے کھانا لے آؤں، حضرت کھانا تو ہم نے کھالیا ہے، فرمایا یہاں قصبہ میں تو تم کھا ہی نہیں سکتے، یہاں تو کوئی ایسی جگہ ہے نہیں، میں نے اپنا قصہ سنایا حضرت نے مسکرا کر فرمایا اچھا، اور فرمایا کہ طبیعت میں سلامتی تو معلوم ہوگئی، فرمایا کہ ابھی تم آرام کرلو، پھر بات ہوگی۔ [۱]

جب حضرت عصر کی نماز پڑھ کر تشریف لائے، پھر مدرسہ گئے، پھر عصر کے بعد مجلس میں تفصیل سے گفتگو ہوئی، اور میں نے اپنی تمام باتیں جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے چل رہی تھیں وہ بھی بیان کیں، اور عرض کیا کہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں پڑھ رہا ہوں، اس دوران جو آثار اور جو باتیں

---

[۱] حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کبھی متوجہ ہونے سے کشف ہوجاتا ہے اور کبھی بلا توجہ ہوجاتا ہے، اور کبھی متوجہ ہونے سے بھی نہیں ہوتا، غرض امرِ اختیاری نہیں ہے، البتہ گاہے قصد پر مرتب ہوجاتا ہے (امداد الفتاویٰ جلد پنجم، صفحہ ۱۴۴)

لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ایک بڑی چیز سے متعلق کشف ہوجائے (جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ میں آمد سے متعلق) اور ایک چھوٹی چیز سے متعلق کشف نہ ہو (جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ میں کھانا کھانے نہ کھانے سے متعلق)

ہوئیں اس سے یہ اندازہ لگایا کہ ہم حضرت کے مرید نہیں ہوئے بلکہ مراد بن گئے، اور حضرت نے یہ تقاضا کیا کہ تم اپنا بوریہ بستر باندھ کر مدرسہ امینیہ سے یہاں آ جاؤ، میں نے کہا حضرت ابھی والدین سے بھی اجازت لینی ہے، یہ کام بھی ہے اور وہ بھی ہے، فرمایا یہ سب بعد میں کرتے رہنا، پہلے تو تم یہ کرو کہ اپنا سامان مدرسہ امینیہ سے اٹھاؤ اور یہاں آ جاؤ، عرض کیا حضرت آپ کے یہاں کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہیں ہے، فرمایا میرا گھر ہے، بس یہیں رہو گے، اور میں تمہیں اپنے گھر سے کھانا کھلاؤں گا، ناشتہ کھانا وغیرہ سب کی میری ذمہ داری ہے۔

مجھے بڑا تعجب بھی ہوتا تھا کہ حضرت میرے لئے اتنی تکلیف بھی اٹھائیں گے، پھر پیرانی صاحبہ سے کہیں گے پھر وہ کھانا پکائیں گی، لیکن حضرت کا تقاضا تھا بس تم آ جاؤ، چنانچہ میں گیا اور مدرسہ امینیہ سے اپنا سارا سامان اٹھا کر حضرت کے یہاں پہنچ گیا، اس دوران ایک مرتبہ میں نے بڑے حضرت رحمہ اللہ سے تھانہ بھون ملاقات کر لی، اور جا کر پرچہ دے دیا، اور میں نے بڑے حضرت سے عرض کیا کہ میں نے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کو اپنا مصلح بنالیا ہے، فرمایا بالکل ٹھیک کیا، صحیح، اور حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ سے میں تحریری طور پر بیعت بھی ہو گیا، میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ان کے پاس پڑھ بھی رہا ہوں وہیں ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا ہے، فرمایا بالکل ٹھیک کیا۔

یہ ابتدا ہے جلال آباد میں پہنچنے کی۔

اس سے پہلے میں نے فارسی کی کتابیں پڑھ لی تھیں، اور حفظ کر چکا تھا، اور مدرسہ امینیہ میں ابتدائی عربی کی کتابیں شروع کی تھیں، علم الصیغہ، ہدایۃ النحو، ایک کتاب اور تھی ادب کی اس میں چھوٹی چھوٹی احادیث اور قصے تھے، اس کا نام اب یاد نہیں آ رہا، یہ کتابیں ایک سال سے کچھ کم عرصہ تک مدرسہ امینیہ میں پڑھیں۔

جلال آباد آنے کے بعد پڑھتے بھی رہے اور جب جی چاہتا بڑے حضرت (تھانوی) رحمہ اللہ کی خدمت میں پہنچ جاتے، وہاں کا بھی دربار دیکھتے رہے اور یہاں (جلال آباد) کا بھی دیکھتے رہے، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

پیرانی صاحبہ (اہلیہ محترمہ حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ) جن کو ہم امّی جان کہتے تھے، مجھ پر بہت

شفقت فرماتی تھیں، کبھی کھانا پکانے یا کچھ اور کام کرنے میں ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کا یہ معمول تھا کہ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا خود لے کر باہر تشریف لاتے تھے اور میرے ساتھ خود بھی ناشتہ اور کھانا کھاتے تھے تاکہ یہ خیال نہ ہو کہ میں خود کچھ اور کھاتا ہوں اور تمہیں دوسرا کھانا دیتا ہوں۔

میں نے جلال آباد سے گھر والدین کو خط لکھا کہ اس طریقہ سے میں یہاں پر آ گیا ہوں، اباجی رحمہ اللہ نے لکھا کہ تم نے ٹھیک کیا، بہت اچھا کیا، اور اطمینان کا اظہار کیا، اور گھر والوں نے بھی، کسی نے کچھ نہیں کہا، اور نہ یہ کہا کہ کیوں ایسا ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم اور وہاں سے فراغت

اس کے بعد باقی تعلیم کے لئے دیوبند گئے اور دیوبند میں جو میرے اساتذہ میں سے تھے، وہ مولانا عبدالسمیع مختصر المعانی اور ادب وغیرہ کی کتابیں بڑی اچھی پڑھاتے تھے، شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب ہمارے زمانہ میں یہ بخاری شریف پڑھاتے تھے، مولانا عبدالواحد صاحب یہ مولانا عبدالسمیع صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادہ ہیں، مولوی یحییٰ صاحب تھے جو مولوی شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ کے متبنّٰی تھے، ان سے بھی میں نے پڑھا ہے، ہدایہ اولین وآخرین ان سے پڑھیں۔

شیخ المنطق مولانا ابراہیم بلیاوی صاحب رحمہ اللہ، مولانا حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ ہماری پوری طالب علمی کے زمانہ میں تقریباً جیل میں رہے، مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ نے اپنے گھر پر بخاری شریف شروع کردی تھی، تھوڑی سی بخاری شریف میں نے ان سے بھی پڑھی۔

ایک مولوی داؤد صاحب بھی بہت پرانے اساتذہ میں سے تھے اور ان کے پڑھانے کا انداز بڑا عجیب تھا، ہدایہ اخیرین پڑھاتے تھے، بہرحال دارالعلوم دیوبند سے فراغت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

منشی فاضل کا امتحان

جب میں دیوبند سے پڑھ کر گھر آ گیا تو مجھے والد صاحب نے فرمایا کہ تمہیں اب کوئی ملازمت کر لینی چاہئے، میں نے کہا ٹھیک ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ میں کوئی ایسا امتحان دے لوں کہ جس سے انگریزی کا امتحان دینے کا راستہ کھل جائے، میں نے کہا منشی فاضل کا، یا مولوی فاضل کا دے لیتا ہوں، چونکہ وقت بہت کم ہے میں منشی فاضل کا امتحان دے لیتا ہوں، لیٹ فیس کے ساتھ فارم جمع کرا دیتا ہوں، کتابیں دیکھ لیتا ہوں، والد صاحب نے مخالفت کی کہ اتنی عجلت میں امتحان کی تیاری نہیں ہوگی اور ہے بھی ایسی چیز کہ وہ دوسری زبان ہے، تم نے عربی پڑھی ہے اور یہ فارسی ہے، اور اگر مولوی فاضل کا امتحان دو اس کے لئے بھی یہ وقت کم ہے اور میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ابھی امتحان نہ دو، میں نے کہا میں ابھی دوں گا، میں نے اپنی ضد پوری کی اور وہ امتحان میں نے دے دیا۔

انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا کہ تم اس امتحان میں بہت مشکل سے اگر کامیاب ہو جاؤ تو ہو جاؤ ورنہ مجھے کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہے، اس میں سب سے زیادہ جو مجھے فکر ہے وہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ تم اس امتحان میں فیل ہو گئے تو تمہاری جو ایک ساکھ ہے کہ تم دیوبند سے پڑھ کر آئے ہو اس کو بڑا دھبہ لگے گا، ہمیں بھی اس کی وجہ سے کافی دھبہ لگے گا، میں اس وجہ سے تمہیں منع کر رہا ہوں، میں نے کہا نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں کامیاب ہو جاؤں گا، انہوں نے کہا کیسے؟ نہ محنت کرتے نظر آتے ہو نہ پڑھتے ہو۔

بہر حال میں نے منشی فاضل کا وہ امتحان دے دیا، اس کے بعد دہلی میں نتیجہ نکلا میرے والد صاحب رحمہ اللہ بھی وہیں تھے اور میں بھی وہیں تھا، وہاں ایک ادارہ شرقیہ تھا، اس کے تحت لوگ پنجاب یونیورسٹی سے امتحان دیتے تھے، ان کے پاس وہ نتائج آئے تھے، اور اس میں میرا نتیجہ دیکھا گیا تو والد صاحب کو بتایا کہ وہ وہاں فیل ہے، والد صاحب میرے پاس آئے، دیکھو ہم نے تمہیں پہلے منع کیا تھا کہ اتنی عجلت میں امتحان مت دو بہر حال تم فیل ہو، لیکن تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہئے، کوئی

ایسی بات نہیں ہے وقت ہی ایسا تھا، اتنے قلیل وقت میں اتنا بڑا امتحان نہیں دیا جا سکتا، دوبارہ دے دینا۔

لیکن میں تمہیں یہ بات بتا دیتا ہوں کہ تمہیں ہمت سے اس کا مقابلہ کرنا چاہئے اور ہمت نہیں ہارنی چاہئے ، یہ مت سوچ لینا کہ میں کسی مسجد میں جا کر کوئی امامت کرلوں گا، اور دوسروں کے ٹکڑوں پر پلوں گا، یہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ اگر میں نے کسی مسجد میں تمہیں روٹی کھاتا ہوا دیکھ لیا تو میں وہیں آ کر تمہیں گولی ماردونگا، تمہیں چاہے مزدوری کرنی پڑے چاہے مٹی اٹھانی پڑ جائے اس کو میں گوارا کرلوں گا، لیکن میں اس قسم کی بات برداشت نہیں کرونگا۔

پھر وہ گھر چلے گئے میں دہلی میں ہی رہ گیا، جب وہ گھر پہنچے تو میرے نتیجہ کا کارڈ گھر آیا ہوا تھا، اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ پاس ہے اور بہت اچھے نمبروں سے پاس ہے، تو والد صاحب کو ان باتوں کا بڑا خیال ہوا کہ میں نے بیٹے کو برا بھلا کہا، یہ کہا وہ کہا تو انہوں نے وہاں سے مجھے ٹیلی گرام دیا کہ تم پاس ہو اور میں تمہارے نتیجہ کا کارڈ بھیج رہا ہوں، اچھا جس وقت وہ مجھے یہ باتیں کہہ رہے تھے اس وقت بھی مجھے یہ یقین تھا کہ میں پاس ہوں، اور یہ نتیجہ جو یہاں آیا ہے وہ ایک اسی ادارہ کا ہے اس سے میرا کیا تعلق ، میں نے تو پنجاب سے دیا ہے، ریاست پٹیالہ سے ، میرا نتیجہ یہاں کہاں آئے گا، یہ بات میرے ذہن میں اور سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ، بہر حال والد صاحب کے بزرگ ہونے کی وجہ سے سنتا رہا وہ ڈانٹ رہے تھے میں سن رہا تھا، چونکہ طبیعت میں جواب دینے کی عادت نہیں تھی کہ میں ان کے سامنے بولوں۔

پھر میں بعد میں جب گھر گیا تو انہوں نے بڑے عجیب انداز میں یہ بات کہی کہ اس مولوی کے بارے میں اور اس کی دماغی صلاحیتوں کے بارے میں یہ بات بالکل معلوم نہیں تھی کہ کتنی ہے لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کم بخت میں بہت صلاحیتیں ہیں اور یہ بہت قلیل وقت میں بہت بڑا کام کرسکتا ہے، چونکہ بہت کم وقت تھا اور جس طریقہ سے وہ چاہتے تھے کہ میں اس طرح ایسے اور ایسے محنت کروں میں اس طرح نہیں کرتا تھا، ہاں میرا ایک طریقۂ کار تھا، میری شادی ہو چکی تھی اور میری اہلیہ، اللہ اس کو غریقِ رحمت کرے، پہلی بیوی میری بہت اطاعت گزار تھی ، بہت کم گو، ۱۸ سال کی

عمر میں میری شادی ہوگئی تھی، اس سے میں نے امتحان کی تیاری کے دوران ایک معاہدہ یہ کیا ہوا تھا کہ مجھے تم رات کو ایک دو دفعہ چائے بنا کر پلا دیا کرو، اور میں اپنی کتابیں دیکھوں گا، اس نے کہا ٹھیک ہے اور میں اوپر جا کر اپنی کتابیں رات میں دیکھ لیتا تھا، اور وہیں سو جاتا تھا، اور دن بھر کھیلتا رہتا تھا، کبھی یہ کر رہا ہوں اور کبھی وہ کر رہا ہوں۔

والد صاحب دن بھر دیکھتے تھے کہ نہ پڑھتا نظر آتا ہے نہ لکھتا نظر آتا ہے نہ محنت کرتا ہے یہ آخر کرے گا کیا، ظاہر ہے کہ یہ تو فیل ہوگا، اور فیل ہوگا تو بڑی بدنامی ہوگی ہماری بھی بدنامی اور اس کی بھی، ان کو یہ فکر لاحق تھی، میں نے ان سے کئی بار یہ عرض کیا کہ میں اپنی تیاری کر رہا ہوں آپ گھبرائیں نہیں، مگر وہ جواب میں یہی کہتے کہ کیا خاک تیاری کر رہا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس منشی فاضل کے امتحان میں کامیاب فرمایا۔

حالانکہ میں بیمار بھی بہت رہا کرتا تھا، مگر اسی کے ساتھ ایک بات یہ تھی کہ پہلے دور میں بیماریوں کے بنیادی علاج ہوا کرتے تھے اور وہ بڑے عجیب ہوتے تھے، پہلے تو منضج اور مسہل سے ہر بیماری کا علاج کر دیا جاتا تھا۔

یہ لفظ اصل میں تو منضج ہے، لیکن اُردو کی پرانی عوامی اصطلاح میں یہ منجش تھا، حالانکہ یہ لفظ منضج ہے؛ اور انضاج کہتے ہیں پکانے کو۔

تو اب نہ حکیموں کے یہاں یہ طریقہ ہے اور نہ ڈاکٹروں کے یہاں؛ کہیں بھی نہیں۔

اب تو اس دنیا میں کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں رہا کہ کون اس منضج اور مسہل میں پڑے۔

مختصر العلاج نام کی ایک کتاب جو فارسی زبان میں ہے، آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے لکھی ہوئی ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس میں بوٹیوں کے نام ہیں کہ فلانی چیز کا جوشاندہ بناؤ، ایسے پی لو اور بس، ٹھیک ہو گئے۔

مختصر العلاج تو یہی ہے کہ پہلے اس بیماری کی علامات اور مرض لکھا گیا، اور پھر اس کا علاج۔

اسی انداز سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ ہو جائے تو بہت اچھی بات ہے، اور فارسی کا تو میں ماہر ہوں، حتیٰ کہ

ایک زمانے میں میں نے حضرت سے فارسی میں خط وکتاب شروع کردی تھی، لیکن وہ خطوط سارے ضائع ہوگئے کیونکہ جب پاکستان بنا ہے تو حضرت حکیم الامت سے میرے دادا ابا کی خط وکتابت، میرے والد صاحب کے خطوط، میرے چچا کے اور خود میری ذات کے وہ سب ضائع ہوگئے؛ وہ بڑا ذخیرہ تھا، اللہ تعالیٰ کو جو منظور۔

مگر اب اتنی فرصت ہی نہیں کہ اس کتاب کا ترجمہ کروں۔

ایک دفعہ میں بیمار ہوا تو مجھے بخار رہنے لگا، اور دن میں پچیس تیس دفعہ نکسیر آتی تھی، سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا، ہر ایک حکیم کے پاس، ہر ایک ڈاکٹر کے پاس؛ سب جگہ گیا، جو حکیم وڈاکٹر بھی نسخہ تجویز کرتا تھا اس سے زیادہ مرض بڑھتا تھا، ؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، میں بڑا پریشان تھا۔

اب میرے والد صاحب مجھ سے لڑتے تھے، تم جب حکیم نہیں ہو تو کیوں بولتے ہو، جو کوئی تمہارا علاج کرتا ہے، تم کہتے ہو: ''نہیں غلط علاج ہے مجھے اس سے فائدہ نہیں ہوگا''

پہلے سے تم کہہ دیتے ہو، میں نے کہا کہ مجھے پتہ ہے نا۔

نہیں بھئی تمہیں جب یہ حکیم وڈاکٹر کہتے ہیں کہ تپِ دق (ٹی۔بی) ہے؛ تو تم انکار کرتے ہو۔

میں نے کہا کہ مجھے تپِ دق نہیں ہے۔

تو والد صاحب نے کہا کہ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ تپِ دق ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں، اب میں ان کو تو کچھ نہیں کہتا۔

خیر قصہ مختصر یہ کہ جب میں ڈاکٹروں اور حکیموں سے تنگ آ گیا تو والد صاحب تو پینشن لینے گئے ہوئے تھے، ہمارے یہاں کیونکہ اسٹیٹ تھی اور گورنمنٹ کی طرف سے پینشن جاری نہیں ہوتی تھی، اس لیے یہی طریقہ تھا کہ گورنمنٹ کے علاقے میں جاؤ اور وہاں سے لو۔

تو ریواڑی ہمارے یہاں سے نزدیک ترین علاقہ تھا، وہاں پینشن لینے کے لیے سب جاتے تھے میرے دادا ابا بھی اور والد صاحب بھی؛ تین تین مہینے میں پینشن لینے جایا کرتے تھے۔

تو والد صاحب پینشن لینے گئے ہوئے تھے میں گھر سے بھاگا اور گاڑی میں بیٹھ کر دلّی آ گیا۔

دلی آنے کے بعد میں حکیم فریدالدین عباسی جو فیروز باغ میں طبیہ کالج کے پرنسپل تھے، اُن کے

پاس گیا، یہ بڑے ٹھاٹھ کے حکیم تھے، داڑھی چڑھاتے تھے، خضاب لگاتے تھے، اور چست پائجامہ پہنتے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے تھے اور پیسے نہیں لیتے تھے، اپنے گھر پر سب کو فری دوا دیتے تھے، بڑی بات تھی، اس زمانے کے بڑے عجیب حکیم تھے، لوگوں کے خیر خواہ، اور آج کل کے قصائی ڈاکٹر ہیں؛ تو خیر میں گیا اور بس انہوں نے میرے پورے بدن کو گھور کر دیکھا اور لیٹنے کے لیے جو جگہ بنائی ہوئی تھی اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ لیٹ جاؤ؛ میں لیٹ گیا، انہوں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور کہا کہ آجاؤ؛ انہوں نے مجھے سات پڑیاں دیں اور کہا کہ دیکھو یہ مکھن میں رکھ کر کھالو اور جتنا مکھن کھایا جائے وہ کھاؤ؛ اور جتنا ناک کے ذریعے سُڑک سکتے ہو، ناک سے چڑھاؤ اور جاؤ۔

میں نے کہا کہ بہت اچھے۔

اب میں وہ سات پڑیاں لے کر چلا آیا، میں نے مکھن خریدا، ناک کے ذریعے بھی اوپر چڑھایا، کھایا بھی؛ اس سے پہلے دن مجھے پچیس فیصد فائدہ ہوا۔

بھئی کمال ہو گیا کہ دوسرے دن میں ٹھیک ہو گیا اور نکسیر بند ہو گئی اور تیسرے دن بخار بھی اُتر گیا، اب میرے والد صاحب جب گھر واپس پہنچے تو انہیں بڑا غصہ آیا کہ وہ نالائق کیوں یہاں سے بھاگا ، کہاں گیا تو خیر وہ میری تلاش میں دہلی آئے، وہ سات دن کے بعد آئے اور جب انہوں نے مجھے دیکھا تو جس حالت مجھے انہوں نے چھوڑا تھا وہ تو بالکل میں چارپائی پر تھا اب تو میرا چہرہ بھی خون سے بھرا ہوا تھا، تو سارا اُن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

اور یہ ایک سال سے مجھے نکسیر اور بخار کا مرض تھا جو کسی سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، پھر مجھے انہوں نے سات پڑیاں اور دیں تھی۔ پھر میں ایک مہینہ بعد اُن کے پاس دوبارہ گیا اور اُن سے پوچھا کہ مجھے کیا مرض تھا؟ کہ سارے ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج تو فیل ہو گیا تھا کسی کی دوا ہی نہیں لگ رہی تھی ، میں تو مَر رہا تھا، تو وہ کہنے لگے کہ سب احمق لوگ ہیں۔ ارے جب ناک سے خون آ رہا ہے تو سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ نزلہ تو نہیں بگڑا ہوا، تو تمہارا تو نزلہ بگڑ کر آنتوں پر جَم گیا تھا جس نے بخار قائم کر دیا تھا، تو تمہیں میں نے سیدھا لٹا کر تمہاری آنتیں دیکھی تھیں تو تمہارا تو نزلہ بگڑا ہوا تھا۔

آپ اندازہ لگائیں کہ اُس زمانے کے حکیم ایسے تھے۔

ایک مرتبہ مجھے ایک مرض پیدا ہوا کہ مجھے پیشاب بہت آ رہا تھا، دن میں پچاس، ساٹھ مرتبہ آ جاتا تھا، اور بُرا حال ہوا پڑا تھا، اور بہت سے حکیموں سے میں نے علاج کروایا لیکن افاقہ نہ ہوا بلکہ پیشاب زیادہ ہی ہوا، تو مجھے کسی نے کہا کہ حکیم جمیل صاحب کو دکھاؤ۔

یہ حکیم اجمل خان کے صاحبزادے تھے، لیکن بڑے عیاش تھے، طوائفیں آ رہی ہیں، کھانے پک رہے ہیں، میں نے کہا کہ چھوڑو بھائی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں بھائی بہت بڑے حکیم ہیں، تمہارے مرض کی تشخیص نہیں ہو رہی اس لیے اُن کے پاس چلو۔

اُن صاحب کا حکیم جمیل کے یہاں اثر ورسوخ تھا، اس لیے انہوں نے مجھے پہلے نمبر پر بٹھا دیا؛ اب اطلاع آ رہی ہے کہ حکیم صاحب باہر برآمد ہو گئے ہیں، حکیم صاحب اس وقت غسل خانے میں ہیں، اس وقت وہاں سے برآمد ہو کر ناشتہ فرما رہے ہیں، اس وقت یہ فرما رہے ہیں اور وہ فرما رہے ہیں اور یہ اعلان ہوتا رہا۔

پھر اس کے بعد یہ اعلان ہوا کہ حکیم صاحب آج برآمد نہیں ہوں گے؛ معذرت۔

حکیم صاحب برآمد نہیں ہوئے اور سارے مریض اُٹھ کر چلے گئے اور میں بھی لاحول ولاقوۃ پڑھتا ہوا چلا گیا۔

اگلے دن دوبارہ مجھے اُن صاحب نے حکیم صاحب کے پاس جانے کو کہا تو میں نے کہا لاحول پڑھو بھئی، کون اس برآمدگی کا انتظار کرے۔ تو خیر دوسرے دن پھر مجھے وہ صاحب لے گئے اور میں چلا گیا۔ اعلانات ہوتے رہے کہ اب زنان خانے میں ہیں اور اب مردان خانے میں ہیں، اور پھر اعلان ہوا کہ حکیم صاحب برآمد ہو گئے۔

میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے۔

جب میں نے دیکھا تو چست پائجامہ، ننگے سر، مونچھ اور داڑھی صاف اور ٹُخ ٹُخ کرتے ہوئے آئے اُس وقت اُن کی عمر ستر سال کی تھی۔

آ کر بیٹھے اور دور سے میری نبض تین اُنگلیوں سے دیکھی اور اپنی دائیں طرف والے نسخہ نویس کی

طرف منہ کر کے کچھ اُوں اُوں کر دیا۔

نسخہ نویس نے ایک بڑا نسخہ لکھ کر مجھے دیدیا، میں بڑا پریشان ہوا کہ حکیم صاحب نے کچھ کہا تو ہے نہیں صرف اُوں اُوں کیا ہے اور نسخہ اتنا بڑا آ گیا۔

خیر میں نے نسخہ لیا اور دواخانے سے دوا لی۔

مجھے کچھ افاقہ ہوا لیکن مکمل نہیں ہوا تو میں دوبارہ اُن صاحب کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس گیا اور میں نے اس نسخہ نویس سے کہا کہ بھئی ایک بات بتاؤ کہ حکیم صاحب نے تم سے مختصر سی بات کہی تھی اور تم نے اتنا بڑا نسخہ لکھ کر دیدیا۔ حکیم صاحب نے تم سے کیا کہا تھا۔

اس نے کہا کہ ہمارے یہاں نسخوں کے نمبر مقرر ہیں، حکیم صاحب ہمیں نسخہ بتا دیتے ہیں اور ہم وہ نسخہ لکھ دیتے ہیں، اس نسخہ میں مفرد اور مرکب سب دوائیں مقرر ہیں۔

تو وہ نسخہ اور ان کے نمبر ہمیں یاد ہیں، اب حکیم صاحب تو ہمیں صرف نمبر بتاتے ہیں اور نسخہ ہم لکھ لیتے ہیں۔

میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ وہ تو اُوں اُوں کرتا ہے اور اتنا بڑا نسخہ آ جاتا ہے، اتنا بڑا نسخہ کیسے بتایا انہوں نے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر میرا علاج کیسے ہوا۔ میں حکیم حاذق، معمولاتِ مطب حکیم اجمل خان صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے، میں اُسے پڑھ رہا تھا، میرے استاد ہمیں نسخہ دیتے تھے کہ جاؤ بھئی پنساری کے یہاں جاؤ اور نسخہ بنوا کر لے آؤ۔

جو بھی دوا بنانی ہوتی، تو میں وہاں جاتا تھا، اور وہاں سے وہ پنساری نسخہ دیدیتا تھا، اب بیچ میں گاہک بھی آ رہے ہیں، ہماری بھی دوائی بھی دے رہے ہیں اور انہیں بھی فارغ کر رہے ہیں؛ تو ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں ہمارا نسخہ تیار ہو جاتا تھا، اور ہم لے کر آ جاتے تھے۔

اب اس دوران میں ایک مونگ پھلی کی بوری رکھی ہوئی تھی، اُس میں سے مونگ پھلی کھاتا رہتا تھا؛ ایک بڑھیا ایک دن آئی اور اس نے کہا: بیٹے میں ایک بات کہوں؟

میں نے کہا کہو! اس نے کہا کہ یہ مونگ پھلی مت کھایا کرو، میں نے کہا کیوں؟ کہ تم جوان ہو اور

تمہیں یہ نقصان دے گی۔ یہ گرم ہوتی ہے، تمہارے گُردے خراب ہو جائیں گے۔

میں نے کہا جاؤ، خوامخواہ ہی تم فتوے لگا رہی ہو، تم کوئی حکیم ہو؟ میں نے بڑھیا کو ڈانٹ دیا۔

لیکن درحقیقت مونگ پھلی کھاتے کھاتے مجھے یہ مرض ہوا تھا، کہ جناب اس طرح پیشاب آنا شروع ہو گیا، اس سے گردوں پر حملہ ہوا ہوگا۔

بہرحال جب وہ کتاب حکیم حاذق والی میں پڑھنے لگا کہ ہر مرض کو اس کی علامات سے پہچانو۔

تو اس میں گردے کا ایک باب آیا، میں نے وہ پڑھنا شروع کیا۔

اس میں بولِ ضلالی کا مسئلہ بھی لکھا ہوا تھا، جس میں اس کی علامات بھی لکھی تھیں یہ پڑھ کر مجھے تو یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے میری ہی کوئی تصویر ہے جو اس میں لکھی جا رہی ہے۔

ایسے زبان خشک ہو جائے گی، چہرے پر خشکی آ جائے گی، میں نے کہا کہ بھئی یہی مرض ہے۔

اس میں نسخہ لکھا ہوا تھا، عام نسخے کی کیٹگری بھی تھی اور خاص نسخے کی بھی۔

تو ایک نسخہ یہ لکھا ہوا تھا، کہ بنولے کی گری لے کر اس کے اندر سے ایک تولہ مغز نکالو، اور اس کو رگڑ کر اس کی کھیر بنا کر کھاؤ۔

تو سب سے آسان مجھے یہی نسخہ نظر آیا، اُس زمانے میں یہ آج کل کی طرح کے بنولے نہیں تھے، بلکہ وہ موٹے کالے ہوتے تھے، ان میں گری ہوتی تھی، اب تو ان کم بخت لوگوں نے کھاد اور مصنوعی بیج بنا بنا کر بیڑا غرق کر دیا۔ اب بنولے میں کوئی گری ہی نہیں ہوتی، ذرا سی ہوتی ہے۔

خیر میں بازار سے وہ بنولا خرید کر لایا اور میں نے اپنی والدہ کو اس کا طریقہ بتلایا، انہوں نے بچیوں سے کہا کہ دیکھو بھئی اسے سروتے سے کاٹو جس سے چھالیہ کاٹی جاتی ہیں اور سوئی سے ان کی گری نکالو، تو انہوں نے نکال دی اور ایک تولہ تول کر مجھے دیدی۔

میں نے کہا کہ ایسے ایسے اس کی کھیر بنا دو، تو والدہ نے اسے رگڑ کر اور کھیر بنا کر مجھے دیدی۔

اس سے مجھے پہلے دن پچھتر فیصد فائدہ ہوا، میں تو بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ کیا، دوسرے دن وہ کھائی جناب تو بالکل ٹھیک، کوئی پیشاب ویشاب نہیں؛ ورنہ تو سارے دن پیشاب کرتے کرتے میں تھک جاتا تھا۔

میں نے کہا کہ بھئی یہ تو کمال ہے۔

سات دن میں نے وہ دوا کھائی اس کے بعد آج تک میں الحمد للہ ٹھیک ہوں؛ تو یہ اس زمانے کی چیزیں اور اس زمانے کے علاج تھے اور اصل بات تو یہ ہے جب اللہ تعالیٰ کو شفاء دینی ہو تو کوئی بہانہ بن جاتا ہے، جیسا کہ حکماء سے میری اس بیماری کا علاج نہیں ہوا، ڈاکٹروں سے نہیں ہوا، اور اس آسان سے دیسی نسخہ سے ہو گیا۔

بہر حال میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں بہت سے امراض سے گذر کر آیا ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل اور بزرگوں کی دعا سے آج تک گاڑی چل رہی ہے۔

میرے والد ''بھیّا جی'' رحمہ اللہ کے حالات وواقعات

میرے والد محمد حنیف خان صاحب رحمہ اللہ جنہیں ہم ''بھیا جی'' کہتے تھے، وہ اپنے والد یعنی میرے دادا جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے کا بہت ادب کیا کرتے تھے، اور وہ ہر معاملہ میں چاہے وہ غلط کہہ رہے ہوں جی ابا جی، جی ابا جی کہتے اور خاموش ہو جاتے، کسی بات کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ بات یوں نہیں، بلکہ خلافِ واقعہ بات پر بھی خاموش ہو جاتے۔

ہمارے دادا کے ذہن میں بڑی وسعت تھی بہت نرمی تھی بہت باتوں پر یہ فرما دیتے تھے چھوڑو سب ٹھیک ہو جائے گا اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے کوئی فکر کی بات نہیں، لیکن اس کے برعکس والد صاحب رحمہ اللہ میں بہت سختی تھی، والد صاحب درگزر کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے، میں نے اس کو بہت محسوس کیا۔

میرے والد صاحب رسالہ میں رسالدار تھے اور رسالدار صاحب کے نام سے وہ مشہور ہوئے اور وہ اپنے زمانہ کے بڑے عجیب بزرگ تھے، ان کی بزرگی کے واقعات اتنے ہیں کہ شاید اگر کوئی بیان کرنا چاہے تو بڑی مشکل سے ان کو سمیٹا جا سکتا ہے، لیکن ان کی بزرگی اور ان کے واقعات میں ان کے مجاہدے، ان کے علم اور ان کی معرفت کا دخل ہے، بہت اچھے مقرر تھے، بہت اچھے عربی فارسی کے جاننے والے تھے، اپنی استعدادِ طبعی پر خود ہی عربی فارسی سیکھی، ابتداءً کسی حد تک

پڑھا ہوگا، لیکن بعد میں تو خود ہی کتابیں منگائیں تھیں اوران کو خود ہی مطالعہ کیا تھا، ان کو فقہ وتفسیر وحدیث میں اچھا عبور تھا، حتّٰی کہ سِیَر کی باتوں میں اگر میں کوئی غلط بات کہہ دیتا یا غلط مسئلہ میرے منہ سے نکل جاتا تو فوراً مجھے ٹوک دیتے۔

میرے والد صاحب فوج میں تھے، وہ اس زمانے میں بہت بڑے بزرگ شمار کئے جاتے تھے، بڑے بڑے عالم فاضل صوفی سب ان کے پاس آتے تھے، اور ایسے پڑے رہتے تھے جیسے شاگرد پڑے رہتے ہیں، اور وہ بہت سخت مزاج کے تھے، بہت سوں کو دھکّے بھی دیتے تھے، اور نکال بھی دیتے تھے، لیکن دنیا ان کو چھوڑتی نہیں تھی، اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات ہیں۔

مرتے دم تک بڑے متقی اور پرہیز گار اور متشرّع رہے، تقویٰ تو ان میں پہلے بھی بہت تھا، یہاں تک ان کا تقویٰ تھا کہ ہمارے محلّہ کی عورتیں اس بات کی شاہد تھیں کہ آج تک ہم نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا، وہ اس طریقہ سے سر پر تولیہ ڈال کر اور نیچے نگاہ کر کے گذرتے تھے، محلّہ میں ان کا یہی انداز تھا، رہنے اور گزرنے کا، اور بہت حسین آدمی تھے، ان کے علاوہ ہمارے (دادے) اباجی رحمہ اللہ بھی بہت حسین تھے اور خوش رنگ تھے۔

مجھے تعجب بھی ہے کہ عام طور پر حکماء کے نزدیک یہ ہوتا ہے جو سب سے پہلا لڑکا ہوتا ہے، جس کو پلوٹھی کا کہتے ہیں اس کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، اور جسمانی طور پر بھی وہ کچھ کمزور ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں بھولا ہوتا ہے، لیکن والد صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ حالت بالکل برعکس تھی، اپنے والد کی پہلی اولاد ہونے کے باوجود ان کا حافظہ بہت قوی تھا اور جسمانی اعتبار سے بھی بہت قوی تھے۔

والد صاحب رحمہ اللہ عزم وحوصلہ کے اعتبار سے بہت قوی تھے، اور فوج میں بھی بہت سختی کے ساتھ نوکری کی، ہمارے چھوٹے چچا صغیر احمد خاں صاحب وہ ان کے ساتھ فوج میں تھے، ایک مرتبہ پشاور میں اسکیم تھی، رمضان کے دن تھے، اس میں بہت پیدل چلنا پڑا تھا، تقریباً ۲۵ میل یا کچھ کم وبیش چلے، وہاں ایک کیمپ میں اس وقت والد صاحب افسر تھے، اور چچا جان دفعہ دار یا نائب دفعہ دار ہونگے، والد صاحب نے اپنے اردلی سے چائے بنوائی اور ابھی یہ سوچ رہے تھے کہ صغیر آ جائے تو اچھا ہے اسے میں چائے پلادوں، اتنی دیر میں وہ آ گئے، والد صاحب نے فرمایا اچھا ہوا تم

آ گئے، یہ چائے بنوائی ہے آؤ تم بھی پی لو، وہ چائے پی رہے تھے، اس دوران چچا صغیر کے منہ سے یہ نکلا کہ بھائی صاحب آج تو میں تھک گیا، اور غالباً یہ سوچا ہوگا کہ اس وقت میرے ساتھ کچھ لاڈ و پیار ہو رہا ہے، میرا بھائی صاحب کچھ خیال کریں گے، اور امتیازی سلوک کریں گے، یہ سب بھائی میرے والد صاحب کو بھیا جی کہتے تھے ہم نے جب ہوش سنبھالا تو ہم سب بھائی بھی بھیا جی کہتے رہے۔

بس چچا صغیر کے اس لفظ پر بھیا جی کا چہرہ متغیر ہو گیا، اور بڑی سخت آواز میں چچا سے فرمایا کہ صغیر اگر تو مر جاتا تو یہ اس سے بہتر تھا کہ میں تجھ سے یہ سنتا ''میں تھک گیا'' تھکنا بھی کوئی چیز ہے، وہ اس قسم کے سخت راجپوت آدمی تھے، ہاں یاد آیا یہ فوجی اسکیم یا مشق جب ہو رہی تھی تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا انگریزوں نے فتویٰ لیا تھا کہ کوئی مسلمان فوجی روزہ نہ رکھے اس دوران روزہ نہیں ہوتا تھا، لیکن بھیا جی رحمہ اللہ روزے سے ہوتے تھے، چنانچہ صغیر چچا کو یہ بھی کہا کہ تم تو روزے سے بھی نہیں ہو اور میں روزے سے ہوتے ہوئے بھی نہیں تھکا۔

اور بہت سی باتوں میں وہ اپنی روایات کے بڑے حامل تھے، جو کہ راجپوتوں کی خاندانی روایات ہیں، اور عام طور پر یہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلام بہادروں کا مذہب ہے، راجپوتی اگر ہمارے اندر ہے تو یہ اسلام کی ایک صفت ہے، اور اس کو بڑے فخر سے کہا کرتے تھے، اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ رات کو گھوڑا اپنے تھان پر اور راجپوت اپنے استھان یعنی بستر پر ہونا چاہئے، رات کو اگر کوئی دیر سے گھر آتا تو ناراض ہوتے تھے۔

اور میرے منشی چچا کبیر احمد خان وہ بہت مزاحی آدمی تھے، وہ کبھی کبھی مذاق میں کہتے تھے، بھیا جی اگر آپ ہندو ہوتے تو بڑے ٹھاٹھ کے ٹھاکر راجپوت ہوتے، والد صاحب کے سامنے اگر گھر میں سے کوئی کمزور بات نکال دیتا تو بہت ناراض ہوتے، ان کی زندگی زیادہ تر فوج میں ہی گذری تھی، اور فوج ہی میں وہ اتنی شہرت پا گئے تھے اپنی بزرگی کے سلسلہ میں کہ بڑی دور دور سے لوگ ان کے پاس آتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ ہمیں فلاں نے بھیجا ہے وہاں چلے جاؤ، اور تو کہیں تمہارا علاج ہے نہیں، چنانچہ وہ آجاتے اور پڑے رہتے، عام آدمیوں کے علاوہ بڑے بڑے علماء بھی ہوتے

تھے۔

ایک دفعہ صغیر چچا نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ مجھے گانا سننے کا بڑا شوق تھا اور میں طوائفوں میں جاتا تھا، اور یہ راگ وغیرہ سنتا تھا، گانے بھی سنتا تھا، اور بھیا جی کو یہ بات معلوم تھی کہ میں جاتا ہوں، تو ایک دن ایسے ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا اور مجھے یہ نصیحت کی ہوئی تھی کہ جھوٹ کبھی مت بولنا، جو بات ہو حسبِ واقعہ کہہ دیا کرو، میں اس سے ناراض نہیں ہونگا، غرض مجھ سے پوچھا کہ رات کو کہاں جاتے ہو، میں نے کہا کہ طوائفوں میں جاتا ہوں، کیوں؟ گانا سننے کا شوق ہے، اچھا! اگر تمہارے گانے کا ہم یہیں بندوبست کردیں تو! میں نے کہا ہاں کردیجئے، یہاں کردیجئے یا کہیں اور کردیجئے، اچھا بات ختم ہوگئی، یہ واقعہ دل کشا چھاؤنی لکھنؤ کا ہے۔

دوسرے یا تیسرے دن لکھنؤ کے بہت بڑے گویّوں کے استاد کسی معاملہ میں بھیا جی (یعنی والد صاحب) کے پاس آگئے، کہ میرا یہ معاملہ ہے، انہوں نے کہا تمہارا معاملہ بہت سخت ہے، یہ فوری حل نہیں ہوسکتا، اس میں کچھ وقت لگے گا، لیکن تم ایک کام کرو، یہ ہمارا بھائی ہے اس کو گانے سننے کا بڑا شوق ہے، اس نے کہا اجی گانا، کس کا گانا، کیسا گانا، اس نے لکھنؤ کا سارا محفل خانہ وہاں جمع کردیا، اب رات بھر ان کی مجلس لگ رہی ہے اور گانے ہو رہے ہیں، غالباً تین ماہ میں چچا نے کہا میرا اب دل بھر گیا ہے، اب مجھے کوئی گانا نہیں سننا، والد صاحب نے کہا بس! اور سوچ لو، اور گویے سے پوچھا کہ تیرا جو کام تھا، جاوہ ہوگیا، بھاگ جا یہاں سے، اس عجیب تدبیر سے چچا کا علاج کیا۔

عام طور پر لوگ اپنی مشکلات اور مسائل لے کر بھیا جی رحمہ اللہ کے پاس آتے تھے۔

والد صاحب کا یہ انداز ہمیشہ سے تھا کہ جب کبھی کوئی آدمی آتا یا کوئی سائل آتا، اگر کام ہونا ہوتا تو وہ بلا ہچکچاہٹ کے کہہ دیتے تھے کہ جاؤ ہوگیا کام، اور اگر کام نہیں ہوتا تھا تو کہہ دیتے تمہارا کام نہیں ہوگا، بیچ میں کوئی اٹکانے والی بات نہیں کرتے تھے، بس دوٹوک جواب دیتے تھے۔

اوران کے واقعات جو مشہور ہوئے وہ زیادہ تر پشاور کے علاقے میں ہوئے، جب وہ پشاور، نوشہرہ، لنڈی کوتل، رسال پور، بنوں وغیرہ میں بہت رہے، یہاں پر بہت ان کے واقعات مشہور ہوئے، پٹھانوں میں بھی مشہور تھے، فقیر ''ایپی'' اس زمانے میں انگریزوں سے لڑ رہا تھا، تو اس نے والد

صاحب سے گفتگو وشنید کے بعد پیغام رسانی کرائی تھی، کہ چونکہ آپ مسلمانوں کا ''بی اسکوارڈن'' ہے، اگر آپ ہمارے ساتھ مقابلے پر آئیں گے تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ مسلمان مقابلے پر ہیں، تو یہ ایک بڑا مسئلہ تھا، والد صاحب نے اس کو یہ کہلوایا کہ ہماری علامت یہ ہے کہ ہمارے پاس سارے مُشکی گھوڑے ہیں، چنانچہ یہ ان کو معلوم ہوگیا کہ اس یونٹ میں جتنے مسلمان ہیں ان کے پاس مُشکی گھوڑے ہیں تو وہ یا تو گولی چلاتے ہی نہیں تھے، اور اگر چلاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اتنے انداز سے چلا رہے ہیں کہ کسی کا ٹخنہ زخمی ہوگیا ہے، کسی کا پیر زخمی ہوگیا ہے، بس گولی ذرا سی زخمی کرتی ہوئی نکل جاتی اور وہ ہسپتال چلا جاتا، یہ رجمنٹ فرسٹ اسکنر ز ہارس کے نام سے تھی، اکثر یہ رجمنٹ پشاور، نوشہرہ، رسالپور، بنوں میں رہی تھی۔

تو والد صاحب پٹھانوں میں بھی بہت مشہور ہوگئے تھے، لیکن ان کی بزرگی کے بارے میں ہمیں اس وقت پتہ چلا جب وہ پنشن تشریف لے آئے، اور چچاؤں نے ان کے واقعات ہمارے گھر میں کہنا شروع کئے، پھر ہمیں پتہ چلا ورنہ ہم ان کو بزرگ نہیں مانتے تھے، ہم تو اپنے ابا جی یعنی دادا رحمہ اللہ کو ہی بزرگ مانتے تھے، وہ تو گویا اپنے زمانے کی ایک کھلی کتاب تھے۔

ایک پشاور کا واقعہ جو پاکستان بننے کے بعد پشاور آنے پر مجھے معلوم ہوا وہ یہ کہ ایک کبابی جونوتھیہ گلی میں کباب بناتا تھا، نام اس کا کریم غالباً عبدالکریم ہوگا، لیکن کریما کبابی کے نام سے مشہور تھا، بھیاجی رحمہ اللہ اس وقت رسالے میں تھے، ایک مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی دوکان پر آئے اور اس سے کہا کہ برتن اچھی طرح صاف کرو اور ہمیں کباب بنا کر کھلاؤ، ظاہر ہے کہ پٹھان اتنا صفائی کا خیال نہیں کرتے اس نے برتن وغیرہ دھلوائے اور بڑے اہتمام سے کباب بنا کر کھلائے، بھیاجی رحمہ اللہ نے کبابوں کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس کو برکت کی دعا دی اور یہ بھی فرمایا کہ ان شاء اللہ بڑے لوگ گورنر اور صدر بھی تیرے کباب کھائیں گے، چنانچہ خواجہ ناظم الدین جب صدر تھے تو پشاور سے بائی ائیر (ہوائی جہاز کے ذریعے سے) ان کے کباب منگاتے تھے، علیٰ ہذا القیاس غلام محمد (سابق گورنر پاکستان) ودیگر سیاسی لوگ وامراء اس کے کباب منگاتے تھے، مجھے اس نے خود یہ واقعہ سنایا کہ وہ فوج میں رسالدار تھے اور یہ نام تھا۔

میرے والد صاحب رحمہ اللہ مستجاب الدعوات تھے اوران کا تکوینیات سے بہت اونچا تعلق تھا،لیکن چونکہ وہ طبیعت کے سخت تھے،اور میرا تعلق زیادہ اباجی (یعنی اپنے دادا) رحمہ اللہ سے تھا،اٹھنا،بیٹھنا،بات کرنا،وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے،اس کے مقابلہ میں والد صاحب رحمہ اللہ سے بہت کم تھا،میں ان سے بہت ڈرتا تھا،لیکن ان کے بارے میں اورلوگ جو قصے سناتے تھے وہ ایسے عجیب وغریب تھے جو کسی طریقہ سے سمجھ میں نہیں آتے ،اورانہیں عقل تسلیم بھی نہیں کرتی تھی،لیکن وہ سب چیزیں ان کی طرف منسوب تھیں۔

مثلاً پاکستان میں کوئی تقریباً دوسوآدمی تو ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ فلاں وقت رسالدار صاحب آئے اور یہ کام کر کے چلے گئے اب بھی اتنے آدمی موجود ہیں،اوراس وقت بھی یہ تھا کہ ہم فلانی جگہ تھے،ایسی پریشانی میں مبتلا تھے رسالدار صاحب آئے ،اورکام کر کے چلے گئے یہاں تک کہ جنگ ۱۹۶۵ء کے موقع پر ہمارے چچا اوران کے رسالے والے لوگ کئی جگہ گِھر گئے،اورراستہ مسدود ہوگیا،دشمن نے گھیراؤ کیا ہوا تھا اُدھر بھی نہیں نکل سکتے،اِدھر بھی نہیں نکل سکتے،اچانک والد صاحب رحمہ اللہ وہاں پہنچ گئے انہوں نے کہا کہ کیا بات ہے پریشانی کی آؤ میرے ساتھ اِدھر سے نکلو،ادھر سے نکال کر فرمایا کہ وہ دیکھوتمہارا کیمپ سامنے پڑا ہوا ہے،یہ جاوہ جا،اب پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو رسالدار صاحب غائب،اس وقت تک کسی کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ رسالدار صاحب کیوں آ گئے اور کیسے آ گئے ،جب انہیں یہ خیال آتا تھا کہ رسالدار صاحب کیسے آ گئے ،بس اس وقت دیکھتے تو وہ غائب ہو جاتے ،ان کا تکوینی تصرف ایسا ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان کا اس طرف خیال ہی نہیں جاتا تھا،اس قسم کے واقعات ان کے بہت مشہور تھے۔

ان میں سے کچھ واقعات میں نے بھی دیکھے تھے،مثلاً وہ دہلی میں جاتے تھے،وہاں خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحب مرحوم کے پاس جو والد صاحب کے دوستوں میں تھے،ان کے یہاں ٹھہرتے تھے ،وہاں بڑی دنیا جمع ہوتی تھی،اور ہر شخص یہ کہتا تھا کہ رسالدار صاحب میرا یہ کام ہے،مجھے فلاں پریشانی ہے،انصاری صاحب نے اپنی طرف سے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ رسالدار صاحب سے دعا کرانی ہے تو پہلے مٹھائی لے کر آؤ،بعد میں وہ دعا کرتے ہیں،تولوگ مٹھائی بھی لے آتے

تھے، جب والد صاحب مرحوم ناراض ہوتے تو انصاری صاحب کہتے کہ اجی بھیا جی اب مٹھائی لے آئے، آپ دعا کردیں، اس طرح وہ سفارش کردیتے، اور والد صاحب دعا فرما دیتے۔

دہلی کے صدر کے پنجابی سوداگران میں سے ایک آدمی بڑے رئیس تھے ان کا لڑکا گم ہوگیا، بے چارے بہت پریشان تھے، دو دن کے بعد کہیں ان کو یہ پتہ چلا کہ یہاں ایک بزرگ رسالدار صاحب آئے ہوئے ہیں، ان کے پاس اگر تم چلے جاؤ تو شاید تمہارا مسئلہ حل ہوجائے، وہ آئے تو انصاری صاحب مرحوم نے کہا ہاں وہ یہاں ہیں تو سہی، تم ایسا کرو کہ مٹھائی لے کر آنا شام کو، وہ تو سوداگر تھے، انہوں نے کہا اجی مٹھائی جتنی چاہو منگالو، وہ پتہ نہیں کتنی مٹھائی لے کر شام کو آ گئے، گرمیوں کے دن تھے، والد صاحب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی وہیں رہتا تھا انصاری صاحب کے پاس ہی، لیکن والد صاحب سے ڈر کی وجہ سے چلا جاتا تھا، ان کی مجلس میں نہیں بیٹھتا تھا، کبھی اتفاق سے چھپ چھپا کر بیٹھ گیا تو بیٹھ گیا۔

والد صاحب نے مٹھائی دیکھ کر بہت ناراضگی کا اظہار کیا، یہ اتنی مٹھائی کیوں لائے، کس نے کہا تھا، بہت غلط بات ہے، انصاری صاحب کو بھی ڈانٹا، کہ ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں مت کیا کرو، انہوں نے کہا اجی اب تو یہ لے آئے، آپ براہِ کرم دعا فرمادیں، فرمایا کیا بات ہے، انہوں نے کہا ایسے ایسے میرا لڑکا گم ہوگیا ہے، والد صاحب نے تھوڑا سا سوچ کر اور دل میں دعا کرکے یہ فرمایا اچھا جاؤ تمہارا لڑکا ٹھیک ہے پرسوں ان شاء اللہ اس کی اطلاع تمہارے پاس آجائے گی، اور ان شاء اللہ اس سے اگلے دن وہ خود بھی آجائے گا، وہ بے چارے چلے گئے، دو دن کے بعد بمبئی سے فون آیا کہ آپ کا لڑکا تو یہاں پہنچ چکا ہے ہمارے پاس ہے، اور ہم نے اسے روانہ کردیا ہے کل پہنچ جائے گا، ان کی اس قسم کی باتیں کشف کرامات تھیں۔

ہمارے چچا رسالدار صغیر احمد خان جو ہمارے خاندان کے بڑے تھے، ان کی زندگی چونکہ والد صاحب کیساتھ گذری، وہ بہت واقعات ان کے جانتے تھے، جنگ کے دوران جو جو کام انہوں نے کئے ان کو تو بہت یاد تھے، مجھے تو چیدہ چیدہ واقعات معلوم ہیں۔

والد صاحب میں ایک چیز یہ تھی کہ بہت سخت موحد تھے، اور بہت متقی تھے، کچھ باتیں ان کی ایسی

تھیں جو تعجب خیز ہیں، ایک یہ کہ کوئی مشتبہ چیز ان کو ہضم نہیں ہوتی تھی، فوراً قے ہو جاتی تھی، میرے رشتہ کے چچا یعنی میرے ابا جی رحمہ اللہ کے بڑے بھائی شبیر احمد خان کی اولا د وہ پولیس میں ملازم ہو گئے، ان کا نام فضل احمد خان تھا، ایک دفعہ میری والدہ نے ان کو پیسے دیئے کہ گوشت لیتے آنا، والد صاحب کو یہ پتہ چل گیا کہ یہ گوشت آج فضل احمد خان سے منگوایا ہے، انہوں نے پوری ہنڈیا پھینک دی، تم نے اس سے کیوں گوشت منگوایا، میری والدہ نے کہا ابا جی بھی تو منگوا لیتے ہیں، فرمایا اباجی کی بات چھوڑو، حالانکہ ابا جی (دادا) رحمہ اللہ بھی وہیں کھڑے ہوئے تھے، ابا جی (دادا) نے کہا بات کیا ہے، فرمایا اجی وہ پولیس میں ہے، اس کی وجہ سے گوشت والے نے اس کو دو چار بوٹی زائد دے دی ہوں گی، ان کا کون حساب دے گا، ابا جی (دادا) نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے، والد صاحب فرمایا آپ کو نہیں پڑتا ہوگا، مجھے تو پڑتا ہے، بہت متقی تھے۔

اور جہاں تک ان کے کپڑوں کی پاکی کا تعلق ہے، میں اگر یہ کہوں کہ وہ اس معاملہ میں مبالغہ سے بھی آگے گذرے ہوئے تھے تو بے جانہ ہوگا، مثلاً گائے نے دس گز کے فاصلہ سے پیشاب کر دیا تو وہ اپنے سارے کپڑے آکر دھوتے تھے، کہ میرے چھینٹے لگ گئے ہونگے، ظاہر ہے کہ وہاں چھینٹے لگنے کا کوئی امکان نہیں، لیکن ان کو یہ وہم ہو جاتا تھا آکر فوراً دوسرے کپڑے بدلے اوران کو دھویا۔

ان کی طبیعت میں اتنی لطافت تھی کہ بدبودار چیز دیکھ لیتے تو بہت طبیعت خراب ہو جاتی تھی، ایک مرتبہ ایک صاحب مسجد میں ان کے برابر کھڑے ہو گئے ان کی بغلوں سے بوآ رہی تھی، جیسے ہی نماز پڑھ کر وہ باہر نکلے مسجد کے دروازے پر ان کو قے ہوگئی اور وہاں ان کو چکر آنے شروع ہو گئے، اب وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ کیا ہو گیا ہے، کبیر چچا جو صغیر چچا سے بڑے تھے جن کو ہم منشی چچا کہتے تھے انہوں نے کہا بھائی صاحب کیا قصہ ہے، انہوں نے کہا تم ایسا بندوبست کرو کہ میری طبیعت بحال ہو جائے، عطر وغیرہ لے آؤ، وہ عطر گھر سے لے کر آئے اوران کی ناک پر لگائی تب جا کر کافی دیر کے بعد کچھ طبیعت بحال ہوئی، گویا اتنی طبیعت میں لطافت تھی، پھر انہوں نے وہ سارا قصہ بیان کیا کہ برابر میں جو شخص کھڑا تھا اس کی بغلوں سے بدبو آ رہی تھی جس کی وجہ سے میری حالت خراب ہوگئی۔

والد صاحب کا علمی تبحر بھی بہت زیادہ تھا، عربی کی بڑی اچھی استعداد تھی، اور جب کبھی میرا ان سے کسی معاملہ میں ٹکراؤ ہوتا تھا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں صحیح ہوا ہوں اور وہ غلط ہو گئے ہوں، تفسیر پر بھی اچھی گہری نظر تھی، بہت اچھا حافظہ تھا، میں نے بہت سی باتوں میں ان سے استفادہ کیا، اور سیکھیں والد صاحب کی بڑی استعداد تھی، خصوصاً فارسی میں بہت زیادہ تھی، انہوں نے ایک دفعہ مجھ سے یہ بھی کہا کہ تم ایسا کرو جو مقامات تمہاری سمجھ میں نہ آئیں وہ مجھ سے پوچھ لو، میں نے ایک دن جدید فارسی کا ایک کتابچہ جو ہمارے مضمون اور کورس میں شامل تھا، اس میں جدید فارسی تھی، اور جدید اصطلاحات تھیں، تو میں اس رسالہ کو لے کر والد صاحب کو زچ کرنے کے لئے ان کے پاس گیا، کہ انہیں جدید فارسی تو آتی نہیں ہوگی یہ میں ان سے پڑھتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ مجھے کیسے پڑھاتے ہیں، چنانچہ میں نے ایک جگہ کی نشاندہی کی کہ یہ جگہ میرے سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں اور نہ کتاب کی طرف، اچھا پڑھو، میں نے پڑھنی شروع کی، انہوں نے اس کا مطلب بتانا شروع کردیا، پہلا لفظ جو اس میں تھا وہ یہ تھا ''جوجہ ماکیان'' انہوں نے کہا یہ ''جوجہ'' نہیں ہے چوزہ ہے، چوزہ کو بدل کر جوجہ کردیا، ماکیان کو اردو میں مرغی کہتے ہیں، اس طریقہ سے انہوں نے جدید فارسی کو اتنی بے تکلفی سے بتایا کہ میں تو حیران رہ گیا، اللہ اکبر، بہت بڑا ذہن ہے، میں واپس استغفار پڑھتا ہوا آیا کہ یہ تو نیت نہیں کرنی چاہئے، واقعی وہ اس کے اہل ہیں کہ مجھے ہر چیز پڑھا سکتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کی زبانی ایک بات سنی، اور وہ بات انہوں نے کس انداز سے کہی مجھے نہیں معلوم، میں نے اسے جس انداز سے سمجھا وہ میں بتا رہا ہوں، ہوسکتا ہے ان کا مقصود کچھ اور ہو، اور میں کچھ اور سمجھا ہوں، گفتگو یہ تھی کہ ٹخنے سے نیچے پاجامہ نہیں ہونا چاہئے، لیکن اگر کوئی عذر ہو اور وہ ٹخنے سے نیچے آجائے تو وہ کوئی اتنی بری بات نہیں ہے اور فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پاجامہ کبھی کبھی نیچے آجاتا تھا، اور ان کے بارے میں یہ فرمایا چونکہ ان کا پیٹ تھوڑا سا گول تھا اور یہاں پر ازار بند رکتا نہیں تھا اور وہ نیچے آجاتا تھا۔

اب اس کے برعکس میں نے تاریخ الخلفاء میں یہ خود پڑھا تھا کہ کمزوری کی وجہ سے ان کے حقوے

پر گوشت نہیں تھا۔ [1]

اس وجہ سے وہ اس جگہ نہیں ٹھہرتا تھا، اب وہ حقوے سے نیچے ڈھلک جائے تو وہ دوسرا عذر ہے، میں نے قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کی اس بات کو مستند مانا جو میں سمجھا تھا، ایک مجلس میں میں اسی بات کو بیان کر رہا تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب حضور ﷺ نے ٹخنوں سے نیچے ازار و کپڑا لٹکانے سے منع فرمایا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کبھی کبھی میرا پاجامہ ٹخنے پر آ جاتا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا "لست منهم" کہ آپ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں اور آپ کا ازار بغیر قصد کے نیچے آ جاتا ہے۔ [2]

اور حضرت قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کی جو بات میں سمجھا تھا کہ ان کا پیٹ آگے سے بڑھا ہوا تھا وہ میں نے کہہ دی، والد صاحب رحمہ اللہ نے پکڑ لیا یہ کیسے کہا تم نے، کہاں یہ لکھا ہوا پڑھا تھا؟ میں نے کہا تاریخ الخلفاء میں پڑھا تھا، تم دکھا سکتے ہو، ہاں میں دکھا سکتا ہوں، میرے پاس تاریخ الخلفاء تھی، مگر میں نے یہ سوچ کر کہ والد صاحب میں اتنی قابلیت تو ہے نہیں کہ تاریخ الخلفاء کی عربی عبارت میں کیا لکھا ہے، میں عربی عبارت دکھا دونگا، لیکن جب میں نے ذہن پر زور ڈالا تو مجھے خیال ہوا کہ حقوی تثنیہ کا صیغہ ہے اور انہیں عربی آتی ہے وہ یہ تو سمجھ جائیں گے، اب تاریخ الخلفاء میں وہ باب نکال کر مقام بھی نکال لیا، اب میں بالا خانہ پر بیٹھا ہوا ہوں، کتاب میرے پاس ہے، اور وہ آواز دے رہے ہیں کہ تو نیچے آ جا، اس کتاب کو لے کر یا ویسے ہی آ جا، اس میں پریشانی اور شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہے، جب میں نیچے آ گیا تو فرمانے لگے کہ دیکھو یہ میری نصیحت ہے کہ کسی عالم کی کسی بات پر جوان کی تقریر کے دوران بیان کی ہوئی ہو اعتماد مت کرو، جب تک کہ کتاب سے اس کی تصدیق نہ کرلو، سب عالم ایک سے نہیں ہوتے، ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی غلط یادداشت پر کہہ دیتے ہیں کوئی بات، تو اس سے بہت بڑا مفسدہ پیدا ہو جاتا ہے، تحقیق کی عادت ڈالو، ہر ایک پر اعتبار مت کرو، ہوسکتا ہے دو چار عالم ایسے بھی ہوں، لیکن عام یہ بات یاد رکھنا اور

[1] وكان سبب استرخائه نحافة جسم ابى بكر (فتح البارى، جلد ١٠ كتاب اللباس، باب من جر ازاره من غير خيلاء)

[2] كذا فى فتح البارى، جلد ١٠ كتاب اللباس، باب من جر ازاره من غير خيلاء)

ایک بات جوانہوں نے کہی وہ بڑے تعجب سے آج تک میرے ذہن میں آتی ہے فرمانے لگے کہ کوئی غلط بات کبھی میرے سامنے کرنے کی کوشش مت کرنا،صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سلسلہ میں یا حضور اکرم ﷺ کے سلسلہ میں کوئی بات حدیث کی یا قرآن کی میرے سامنے غلط کہوگے وہ میرے سامنے نہیں چل سکتی،اور کیا تم یہ سمجھتے ہوا گرتم چاہو تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پیٹ بڑا تھا یا حقوی پر گوشت نہیں تھا،تمہیں دکھا سکتا ہوں،یہ بات ان کی بہت بڑی تھی میں ان سے بہت زیادہ متاثر تھا اس لئے میں نے کوئی جواب نہیں دیا،چونکہ میری غلطی تھی اس پر میں نادم تھا اور نہ بعد میں تو یہ سوچا کہمیں اس وقت کہہ دیتا کہ اچھا دکھادو مجھے،اس وقت ذہن کام نہیں کررہا تھا،بلکہ میں اپنی ندامت کی وجہ سے خاموش کھڑا تھا،ان کا اصل میں مزاج سخت تھا،یہ بھی ان کی بڑی بزرگی کی بات تھی۔

ایک چیز اخیر عمر میں جو مجھے واضح طور پرمحسوس ہوئی وہ یہ کہ ایک دفعہ ہوا،دودفعہ ہوا،تین دفعہ ہوا،چار دفعہ ہوا،میرے بھائی بہت پیدا ہوئے،پنشن آنے کے بعد جب والدصاحب مستقل گھر پر رہتے تھے،بچہ پیدا ہوا اس کا نام رکھا دبیر احمد،پھر دوسرا پیدا ہوا عبیر احمد،پھر تیمور احمد پھر محمد اسلم خان،محمد طیب خان،کئی بھائی پیدا ہوئے بہت خوبصورت بہت حسین،لیکن یہ ہوتا تھا کہ ایک سال یادوسال کے عرصہ میں ہی بیمار ہوتے رہے اور مرتے رہے،والد صاحب رحمہ اللہ یہ فرماتے تھے کہ میری اولاد اب زندہ رہے گی نہیں جتنے پیدا ہونگے سب ایسے ہی ہونگے مرجائیں گے،کیوں بس میرا اور اللہ میاں کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ جس چیز سے مجھے ذرا سا پیار ہوجائے اور وہ بیچ میں حائل ہوتو وہ ہٹ جاتی ہے،اب چونکہ یہ اولاد ہے اچھی بھی لگتی ہے تو تعلق کچھ نہ کچھ پیدا ہوجاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے جدا ہوجاتی ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں دہلی سے آیا ہوا تھا تو بھیا جی (یعنی والد صاحب) رحمہ اللہ وہاں ہی تھے،میرے دل میں آیا کہ کچھ وقت ایسا نکالوں کہ میں تنہائی میں والدصاحب سے بات کیا کروں اور تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا کروں،میں نے ان سے وقت پوچھا،فرمایا مغرب کے بعد جب میں نماز پڑھ کر آتا ہوں اس وقت تم مجھ سے بات کرلیا کرو،خیر میں نے ملنا شروع کیا،بڑی بڑی

عجیب باتیں، عجیب عجیب نصیحتیں، واقعات، بزرگوں کے تذکرے، یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ دس دن یا بارہ دن جاری رہا، وہ اتنا وقت ہوتا تھا کہ اس وقت کے بعد اباجی (دادا) رحمہ اللہ اور سب گھر والے مل کر کھانا کھاتے تھے، یہ پون گھنٹہ کا بیچ میں وقت ہوتا تھا، اس کے بعد عشاء کا وقت ہو جاتا تھا، بارہ دن کے بعد میں جب والد صاحب کے پاس اوپر بالاخانہ پر گیا ہوں، ان کی نظر بالکل عجیب طریقہ سے بدلی ہوئی تھی، اور انہوں نے کہا کہ تنویر یہ میں کسی اور وجہ سے بات نہیں کہہ رہا ہوں کبھی تم اس کا کوئی غلط مقصد لو، لیکن میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تمہارے آنے سے اور گفتگو کرنے سے تم سے ایک تعلق سا مجھے پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور یہ تمہارے لئے بہت مہلک سبب ہوسکتا ہے، تمہاری بہتری کے لئے اب میری تمہیں یہ نصیحت ہے کہ اب تم میرے پاس مت آؤ، مجھ سے دور رہو، اور یہاں کا بیٹھنا بند کر دو، اس میں تمہارا فائدہ ہے میرا کوئی فائدہ نہیں، خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنس جاؤ گے، جاؤ۔

بہت عجیب عجیب باتیں ہوتی تھیں، اس طریقہ سے ہوتی تھیں کہ میں انہیں بیان بھی نہیں کرسکتا، بہت اونچی بھی باتیں ہوتی تھیں، روحانیت کی بھی اور ویسی بھی، لیکن اچانک انہوں نے مجھے بہت کرخت انداز میں منع کر دیا۔ شاید ان کا زیادہ سننا میرے لئے مضر تھا۔

جس وقت والد صاحب کو دوسروں کی طرف سے مجبور کیا گیا کہ وہ اس قصبہ سے ہجرت کر جائیں یہ پٹیالہ اسٹیٹ ہے یہاں فسادات اور گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے، یہ گھر میں مشورہ ہو رہا تھا مجھ سے والد صاحب نے یہ فرمایا کہ تم دہلی میں ایک مکان لے لو، پھر میں وہاں آ جاؤنگا، میں نے ایک مکان لے لیا، کچھ لوگوں کو بہاولپور میں زمین لینے کے لئے وفد کی صورت میں بھیجا تھا، وہ بھی وہاں سے واپس آ گیا تھا، جب میں گھر گیا تو والد صاحب نے فرمایا بس میں کچھ دنوں کے بعد دہلی آ جاؤنگا، لیکن جب صغیر چچا گئے اور انہوں نے بہت زور دیا تو اچانک ان کو جوش سا آیا، اور فرمایا کہ صغیر میں اور میرے بچے یہیں شہید ہونگے، یہ مقدر ہو چکا ہے، اور اباجی (دادا) رحمہ اللہ سے بھی جب کہا گیا کہ آپ کیا کہتے ہیں تو انہوں نے بھی انکار کر دیا کہ میں اپنے بزرگوں کی ہڈیوں کو چھوڑ کر جاؤنگا نہیں۔

میرے دادا ''ابّا جی'' رحمہ اللہ کے حالات وواقعات

سب لوگ یعنی میرے چچا وغیرہ دادا ابا رحمہ اللہ کو ابا جی کہتے تھے، باقی سب بچے بھی، میں بھی ابا جی ہی کہتا تھا، اس لئے دادا ابا کے لئے آئندہ تحریر میں ابا جی ہی آئے گا۔

میرے دادا جی جنہیں ہم ابا جی کہتے تھے صوبیدار دوست محمد خان رحمہ اللہ جو صوبیدار صاحب کے نام سے مشہور تھے، فوج میں ملازم رہے ہیں، اس کے بعد وہاں سے پنشن لے کر گھر پر آ گئے، اور پھر ساری زندگی گھر پر ہی رہے، ہم نے ان کو پنشن کے بعد گھر پر ہی دیکھا۔

ابا جی رحمہ اللہ بڑے بھولے اور معصوم سے آدمی تھے، اور بہت عجیب بزرگ تھے۔

میری معلومات کے مطابق غیر منقسم ہندوستان میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں کوئی تکوینی بزرگ ہو اور اس کو ابا جی نہ جانتے ہوں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی بہت سے بزرگوں کو جانتے تھے۔

تکوینیات میں بھی وہ قطب الاقطاب کے درجہ پر تھے، اور تمام مجاذیب وغیرہ ان کے ماتحت تھے، اور یہ احکامات ہوتے تھے، کہ کسی کو بھگایا جا رہا ہے، کسی کا تبادلہ ہو رہا ہے، کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے، اس زمانہ میں جو باتیں ہم نے دیکھیں، اور جس طریقہ سے ابا جی رحمہ اللہ نے بتایا، آج فلاں آ رہا ہے، آج یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے، یہ باتیں ایسی تھیں کہ اس کے بعد پھر آج تک دیکھنے میں نہیں آئیں، وہ ساری بڑی عجیب تھیں، وہ بھی ایک زمانہ رہا، جب تک ان کے ذمہ تفویض وتکوین رہی، اس قسم کا بھی معاملہ چلتا رہا، اور وہ باتیں بھی اتنی عجیب ہیں کہ اگر آپ کبھی ان کو سنیں تو آپ کو خود بڑی حیرت ہوگی کہ یہ باتیں بھی کبھی ہو سکتی ہیں، ہمارے لئے تو وہ روزمرہ کی باتیں تھی، دوسروں کے لئے وہ بہت بڑی باتیں ہیں۔

جب دوسری جنگِ عظیم ہوئی اس میں ان کے لڑکے بھی گئے ہوئے تھے، صغیر چچا، نصیر چچا، رفیق چچا، بڑے چچا رفیق احمد خاں جن کو ہم غُصیلی چچا کہتے تھے کیونکہ ان میں غصہ بہت تھا، اور گھر میں سب ان سے ڈرتے تھے، یہ سیکنڈ رائل لانسرز میں ملازم تھے، اور رسالداری کے عہدے پر تھے، اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے، تقسیمِ ہند کے وقت یہ ابا جی رحمہ اللہ کے ساتھ شہید ہوئے، ان سے

چھوٹے کبیر احمد خاں جن کو ہم منشی چچا کہتے تھے یہ فوجی نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے تھے، اور اباجی رحمہ اللہ کے ساتھ رہتے تھے، بہت خوش الحان اور مزاحیہ طبیعت کے آدمی تھے، یہ بھی بھیا جی رحمہ اللہ کے ساتھ شہید ہوئے، ان دونوں کا تذکرہ تفصیل سے آئے گا، تیسرے چچا صغیر احمد خاں یہ فرسٹ اسکنر ز ہارس میں ملازم تھے، رسالداری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور تقسیمِ ہند کے وقت ملازم تھے، پاکستان آ کر ریٹائر ہوئے۔ یہ تین لڑکے ان کے جنگ میں گئے ہوئے تھے، اور ہندوستان سے باہر جو جنگ ہورہی تھی اس میں جا چکے تھے، اباجی رحمہ اللہ بہت گڑگڑا کر بڑے تضرع سے دعا مانگا کرتے تھے، اور اپنی اولاد سے انہیں بہت محبت تھی، اور بڑی عجیب محبت تھی۔

اسی دوران ایک دن میں نے دیکھا کہ اباجی رحمہ اللہ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں، بالا خانہ سے اترتے ہوئے میں نے کہا آج تو آپ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں، انہوں نے کہا ہاں بھئی آج میں بڑا خوش ہوں، پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا آج حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مجھے حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا اور عرض کہ یہ دوست محمد خان کچھ پریشان ہیں، تو مجھ سے حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا پریشانی ہے؟ میں نے کہا میرے تین بچے اس جنگ میں گئے ہوئے ہیں، ان کے سلسلہ میں پریشانی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا اچھا! تمہارے بچے! تمہارا تو شہر کا کوئی آدمی بھی اس جنگ میں نہیں مارا جائے گا، تو حضور ﷺ نے میرے بچوں کو ہی نہیں بلکہ پورے شہر کو پناہ وحفاظت کی بشارت دی ہے، اور اب اس شہر کا کوئی آدمی جنگ میں نہیں مارا جائے گا۔ یہ اباجی رحمہ اللہ کا کھلا کشف تھا۔

مجھ سے اباجی نے فرمایا تم شہر میں اعلان کردو، یہ جنگ کی بہت ابتدائی بات تھی، یعنی جنگ شروع ہوئی ہی تھی، ۴۰ء کی ابتداء ہی تھی، مجھے کچھ تھوڑا سا تأمل ہوا کہ اباجی سوچ لیجئے، بڑی عجیب سی بات ہے، کیونکہ اس میں ہندو بھی ہیں، جاٹ بھی ہیں، سکھ بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، شہر میں تو سب آ گئے، کیا اس میں مسلمانوں کی قید ہے، فرمایا حضور ﷺ نے یہاں ایسی کوئی قید تو نہیں لگائی، عام بات کہی ہے، مسلمان کا نام نہیں لیا، کہ اس شہر کے مسلمان، بس تم اعلان کردو، میں نے اعلان کردیا، اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔

چنانچہ جب یہ بات ہوئی تو لوگوں نے میرے اعلان پر کہا کہ ابھی تو جنگ شروع ہوئی ہے، میں نے

کہا کہ مجھے اس سے بحث نہیں یہ تو جنہوں نے کہا ہے ان سے پوچھئے۔

سب کے اعتماد اور اعتبار میں یہ بات تھی کہ صوبیدار صاحب جو بات کہہ دیں وہ غلط نہیں ہوسکتی، یہ سارے قصبہ کا بھرم تھا، اعتماد تھا۔

جب ۴۴ء میں جنگ ختم ہوگئی ہمارے محلّہ کے دو آدمی غائب تھے، اور ابا جی رحمہ اللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی بیویوں کے نکاحِ ثانی کی بات ہورہی ہے تو بہت ناراض ہوئے، اور مجھ سے فرمانے لگے کہ ان سے جا کر کہو کہ وہ زندہ ہیں اور ان شاء اللہ وہ ضرور آئیں گے، بلکہ بڑے جذبہ سے یہ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ دوست محمد نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، بہرحال وہ رک گئے، دو تین دن میں ہی ان کا خط جو حکومت کی طرف سے چھپا ہوا تھا آ گیا کہ ہم جاپان کی قید میں تھے، عنقریب آرہے ہیں، چنانچہ آ گئے، کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس پوری جنگ میں مارا گیا، حتیٰ کہ زخمی بھی نہیں ہوا، تو ابا جی کی یہ اور اس قسم کی بدیہی کشف وکرامات تھیں۔ [1]

ابا جی رحمہ اللہ کی خصوصیت کیا تھی کہ سارے قصبہ اور شہر کے آدمی سب ان کو بزرگ مانتے تھے، ان میں ایک جو بیّن وجہ تھی وہ یہ تھی کہ جب وہ تہجد کے وقت ذکر کرتے تھے اور بطور کرامت ان کے جوارح وقلب سے جو خاص قسم کی آوازیں نکلتی تھیں وہ ایسی ہوتی تھیں کہ پورا شہر سنتا تھا، اتنی بلند آواز سے اور اس طریقہ سے ذکر کرتے تھے کہ کہیں بھی کوئی ہو ایک میل تک ان کی آواز سن لیتا تھا، اور یہ سب کو پتہ تھا کہ یہ صوبیدار صاحب کی عبادت کا وقت ہے، یہ سب کچھ تہجد کے وقت ہوتا تھا، ذکر کا سننا یہ ان کی بڑی کرامت تھی۔

غرضیکہ جو اُن کے ذکر کی آواز تھی وہ میلوں سنی جاتی تھی، چاہے بالا خانہ پر ہوں یا نیچے گھر میں ہوں اور اس میں جو اُن کے جوارح سے آوازیں نکلتی تھیں، اس کی وجہ سے آواز میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ باہر سننے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کون کون ذکر کررہا ہے، بعضے لوگ معلوم کرتے

---

[1] یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ شریعت کا تو اصول یہ ہے کہ کسی ولی اور بزرگ کا کشف والہام دوسرے پر حجت نہیں ہوتا، لہٰذا خواتین کو نکاحِ ثانی سے روکنا کیسے درست تھا؟ کیونکہ شوہر کی موت کی تصدیق نہ ہونے یا پھر قضاءً موت کا فیصلہ ہونے کے بعد عدت بھی گزارنی پڑتی ہے تب نکاحِ ثانی کی شرعاً اجازت ہوتی ہے، اس لیے یہاں صرف کشف والہام ہی نہیں بلکہ شریعت کا تقاضا بھی یہی تھا، الہام اور کشف وکرامات کی حقیقت اسی کتاب کے تکوین وتشریع والے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

تھے کہ ذکر میں کتنے آدمی بیٹھتے ہیں، بعضے یہ کہتے تھے کہ وہ تو ان کی دادی اور دادا مل کر ذکر کرتے ہیں، کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ کہتا تھا، اور کسی کو یہ خبر نہیں تھی کہ یہ ایک شخص ہی ذکر کرتے ہیں۔

بہت بڑے ذاکر تھے، میری نگاہ میں اور میری یادداشت اور میرے مشاہدہ میں اس نوعیت کا ذاکر میں نے نہیں دیکھا۔

اتنے ذاکر تھے کہ یوں فرمایا کرتے تھے میں جب بیتُ الخلاء جاتا ہوں تو مجھے اپنی زبان کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے، بہت مشکل سے میں اس کو روکتا ہوں، رکتی نہیں، یہ ان کی بات جو انہوں نے مجھے بتائی انتہائی حیرت کی ہے، عام لوگوں سے وہ بہت کم بات کرتے تھے۔

ان کی زندگی کی ایسی باتیں تھیں جن کو ہم یہ کہا کرتے تھے کہ یہ آپ کی کھلی ہوئی کرامت ہیں۔

ایک بات یہ تھی کہ وہ قصبہ جس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ یا اس کے لگ بھگ تھی اور تقریباً دو میل کی لمبائی میں وہ قصبہ پھیلا ہوا تھا، اور اس قصبہ میں ابتدائی مکان ہمارا تھا اس سے پہلے کسی کا مکان نہیں تھا، ابا جی رحمہ اللہ کا معمول یہ تھا کہ رمضان المبارک میں اپنے بالا خانہ کی چھت پر کھڑے ہو کر آواز لگاتے تھے، آواز یہ ہوتی تھی۔

سحری والو! سحری کھانے کا وقت ہوگیا ہے، بیٹھے ہوجاؤ، سحری کھالو، سحری کا وقت ہوگیا ہے۔

یہ ان کی صدا تھی، قصبہ کے لوگ تو یہ کہتے تھے کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر کسی نے ہمیں آواز دی ہے اور اٹھایا ہے، لیکن جو پانچ دس میل گاؤں میں رہنے والے لوگ تھے وہ یہ کہتے تھے کہ ہم بھی یہاں ان کی آواز سنتے ہیں، پورے قصبہ میں اور کوئی سحری کے وقت لوگوں کو اٹھانے کا طریقہ نہیں تھا اور لاؤڈ اسپیکر کی اس زمانہ میں عدم موجودگی کی وجہ سے مسجدوں سے بھی اعلان نہیں ہوتا تھا، صرف ابا جی رحمہ اللہ اپنی آواز سے چاروں طرف منہ کرتے تھے جگاتے تھے یہ ان کی کھلی کرامت تھی۔

ان کے پاس دنیا آتی تھی، وہ کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے، بس ابتدائی مذہبی کتابیں اور کچھ فارسی، بس انہوں نے اتنا ہی پڑھا تھا۔

جب لوگ عام طور پر اپنی حاجت لے کر آتے تو وہ یہ فرماتے کہ بس میں اور کچھ نہیں جانتا، دعا کروں گا، اور دوسرے یہ کہ جب کوئی بیمار وغیرہ آتے تو یہ فرماتے کہ میرا ایک پانی ہے، اپنے اوراد سے فارغ ہو کر میں اس پر پھونک مارتا ہوں وہ لے جاؤ اور اس مریض کو پلا دو اور اسے ختم مت ہونے دو، چاہے میں ہوں یا نہ ہوں گھر سے لے لیا کرو، اور اسی میں پانی ملاتے رہو۔

ایک ہنڈیا ان کی چوکی کے پاس جہاں وہ عبادت کرتے تھے ڈھکی ہوئی رہتی تھی، اور جب وہ ذکر وغیرہ سے فارغ ہوتے تھے، تو اس میں پھونک مار دیتے۔

اور وہ ہنڈیا بھی کوئی بیس سال کی ہوگئی تھی، یہ ان کی بڑی عجیب کرامت تھی کہ وہ ہنڈیا ذکر کرنے لگ گئی تھی، جب اس کا ڈھکن کھولتے تھے تو ایک آواز لاالـــہ الااللہ کی اس میں گونجتی تھی، اور بڑی حیرت سے گھر کے لوگ اسے سنتے اور دیکھتے تھے، اب اتنا بڑا ذاکر کہاں ہوسکتا ہے، کہ جس کے ذکر کا رسوخ دوسری چیزوں میں سرایت کر جائے، اس پانی کو ہندو بھی لے جاتا تھا، مسلمان بھی لے جاتا تھا۔

ایک طرف چار پائی بچھی ہوئی ہوتی تھی، اس پر میں اور اماں جی لیٹے ہوتے تھے، اور اس کے برابر میں ابا جی رحمہ اللہ کا قالین اور مصلیٰ عبادت کا تھا، جس پر وہ بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، تو ایک رات میں نے ایک دفعہ کروٹ لی، اور کروٹ لینے میں ابا جی رحمہ اللہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ گر نہ جائے، اس وقت وہ لاالـہ الا اللہ کی ضرب لگا رہے تھے، اس طریقہ سے انہوں نے گردن گھماتے ہوئے نظر اٹھائی تو مجھے دیکھا، اور اپنی ذکر کی حالت میں انہوں نے الااللہ کی ضرب بھی لگائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس طاقت سے اٹھ کر ان کی گود میں جا کر گرا، اپنی چار پائی سے۔ جب میں گرا تو میں نے شور مچایا، چونکا، اماں جی کی بھی آنکھ کھل گئی، وہ بھی پریشان کہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کچھ نہیں کچھ نہیں۔

اماں جی نے کہا یہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟ کہہ دیا کچھ نہیں ہوا، تم اس کو اٹھا لو، اب وہ ابا جی رحمہ اللہ کی جان پر اٹک گئیں، تمہارے پاس یہ کیسے گیا، انہوں نے کہا گیا نہیں، میں نے اس کو اتفاق سے دیکھ لیا تھا، تو یہ میری نگاہ سے اٹھ کر میرے پاس آ گیا تھا، یہ خود سے گیا نہیں، اتنی قوت ان کی نگاہ میں

تھی۔ [1]

ابا جی رحمہ اللہ جب نفی واثبات کا ذکر فرماتے تو پوری گردن گھما کر بائیں طرف الا اللہ کی ضرب لگاتے تھے، اور اس وقت زبان نہیں بلکہ قلب سے عجیب آواز الا اللہ کی آتی تھی۔

میرے ابا جی رحمہ اللہ ایک میانہ قسم کی شلوار پہنتے تھے، اس میں گھیر زیادہ نہیں ہوتا تھا، سیدھے، پاجامہ سے کچھ زیادہ، کف والی قمیص پہنتے تھے، کرتہ انھوں نے نہیں پہنا، اور لمبے قسم کے کوٹ، ڈبل اور سنگل بٹن کے پہنتے تھے اور عمامہ باندھتے تھے، ان کا یہ لباس حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی خدمت میں جانے تک رہا ہے، اور اس وقت تک جب وہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے مجازِ صحبت بنے یہی لباس رہا ہے، حضرت کی جو شریعت وتصوف چھپی ہے اس میں جو حضرت کے مجازینِ صحبت کی فہرست چھپی ہے اس میں ابا جی رحمہ اللہ کا سب سے پہلے نام درج ہے۔

ہمارا سارا خاندان ابا جی رحمہ اللہ کی وجہ سے پکا موحد تھا، ہمارے یہاں کوئی شرک وغیرہ کی بات نہیں تھی، بلکہ بعد میں تو ابا جی رحمہ اللہ نے ساری برادریوں کو بٹھا کر اور تمام کو پنچایت میں بلا کر اور سارے شہر نے مل کر یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ رسوماتِ بد ہم چھوڑ دیں گے، چنانچہ پورے شہر کا یہ

---

[1] اگر اس پر یہ شبہ کیا جائے کہ یہ تو ایک تصرف تھا، اور حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے تصرف میں بعض مضرتیں بیان فرمائی ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

> دنیوی مضرت تو یہ ہے کہ اس کی کثرت کرنے سے عامل کے قویٰ دماغیہ اور قلبیہ ضعیف ومضمحل ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ ہے، جیسا کہ بکثرت مشاہدہ وتجربہ ہوا ہے اور مضرتِ دینی یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت اور بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں؛ اور یہ ایک اعتقادی ضرر ہے، اور مرید کا یہ ضرر ہے کہ وہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں اور یہ عملی ضرر ہے اور انہیں مضرتوں کی وجہ سے محققینِ طریق نے اس کا استعمال چھوڑ دیا، اور سلفِ صالحین کے زمانے میں یہ مضرتیں بوجہ مضبوطیٔ قویٰ اور سلامتِ فطرت اور خوش فہمی کے موجود نہ تھیں، لیکن خلف کو سلف پر قیاس نہیں کیا جاسکتا؛ خوب سمجھ لو! (بوادرُ النوادر صفحہ ۷۸۶، رسالہ التعرف فی تحقیق التصرف)

اس شبہ کا جواب بھی حضرت کی مذکورہ عبارت ہی میں موجود ہے کہ جہاں کوئی دینی ودنیوی ضرر نہ ہو، وہاں اس کا استعمال جائز ہے، اور مذکورہ واقعہ میں اس قسم کا کوئی ضرر نہ تھا، بلکہ دوسرے کو اس ضرر سے بچانا تھا، اس لیے مذکورہ تصرف کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔

کراماتِ اولیاء حق ہیں، اور کرامات کے بارے میں معتدل نقطۂ نظر تکوین وتشریع والے حصہ میں درج کردیا گیا۔

فیصلہ ہوگیا تھا کہ اب رسومات نہیں کریں گے، تو غلط قسم کی رسومات مثلاً لڑکی والوں کی طرف سے شادی کا کھانا وغیرہ، اسی طرح موت کی سب غلط رسومات ختم کر دی تھیں، سب نے پنچایتی طور پر تسلیم کرلیا تھا، کہ یہ سب چیزیں غلط ہیں ان کو چھوڑ دو، اور اس کے سب سے بڑے داعی ہمارے اباجی رحمہ اللہ تھے، ان کا للّٰہی رعب تھا، اگر کوئی غلط کام کر رہا ہوتا، یا لوگ کہیں تاش کھیلتے ہوتے، اتفاق سے اباجی وہاں سے گذر رہے ہوتے اور دور سے انہوں نے دیکھ لیا کہ صوبیدار صاحب آ رہے ہیں فوراً کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، کوئی ادھر، کوئی پتے چھپا رہا ہے، کہ کہیں ان کی نظر نہ پڑ جائے، بینڈ باجے والے جو شادی میں بجاتے ہیں، آپ یقین نہیں کریں گے کہ شادی کی جگہ سے اباجی رحمہ اللہ گذر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ بینڈ باجے والے اجرت پر آتے ہیں لیکن ان کی شکل دیکھ کر وہ بھاگ جاتے تھے کہ صوبیدار صاحب آ رہے ہیں، اور انہیں یہ خطرہ ہوتا تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک بید ہوتا تھا، وہ عام طور پر مار بھی دیتے تھے لوگوں کو، اور ان کے ساز واز بھی توڑ دیتے تھے، تو ان کو یہ بھی خطرہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ڈھول وغیرہ توڑ ہی نہ دیں، بھاگ جاتے تھے، اور جب وہ یہ دیکھ کر یقین کر لیتے تھے کہ صوبیدار صاحب چلے گئے ہیں تو دوبارہ آ جاتے تھے، یہ ان کا للّٰہی رعب تھا۔

یہ رعب خداداد ہوتا ہے، میں ایک اور قصہ بیان کرتا ہوں، جو حضرت رائے پوری رحمہ اللہ کا ہے، حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمہ اللہ کا یہ حال تھا کہ جب آپ بازار سے گذرتے تو ہندو سارے کھڑے ہو جاتے تھے، مسلمان تو سب کھڑے ہوتے ہی تھے، ہندو بھی کھڑے ہو جاتے، یہ بات سہارنپور تک مشہور ہوگئی، ہندوؤں کو تعجب ہوتا تھا کہ تم کیوں کھڑے ہو جاتے ہو، وہ ایک مسلمان ہے تم اس کی اتنی تعظیم کیوں کرتے ہو، ایک ہندو باقاعدہ اس سلسلہ میں سہارنپور سے چل کر آیا، اور وہ کسی لالہ والہ کے پاس بیٹھا، اور اس سے کہا کہ ہم نے یہ سنا ہے؟ اس نے کہا ہاں ٹھیک سنا ہے، اس نے کہا تم کیوں اٹھتے ہو۔

اس نے کہا بات یہ ہے کہ اب ان کے آنے کا وقت ہونے والا ہے تم مت اٹھنا پھر تمہیں پتہ چل جائے گا، کہ اٹھتے ہیں یا نہیں اٹھتے ہیں اور کیوں اٹھتے ہیں اس نے کہا میں تو نہیں اٹھوں گا اور اٹھنا

ہی نہیں چاہیئے، کہاں ہندو، کہاں مسلمان، اس نے کہا اس میں جھگڑنے کی تو کوئی بات نہیں، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد حضرت رائے پوری وہاں سے گزرے، تو سب ہندو کھڑے ہوگئے، اور وہ ہندو جو چیخ پکار کر رہا تھا وہ بھی کھڑا ہوگیا، جب حضرت گذر گئے، تو دوسرے ہندوؤں نے اس سے کہا کیوں بھئی تو کیوں کھڑا ہوگیا، تُو تو ہمارے ساتھ لڑ رہا تھا، اس نے کہا کہ میں کھڑا نہیں ہوا ہوں، مجھے تو کسی نے کھڑا کیا ہے، تو انہوں نے کہا تو ہمیں ایسا ہی سمجھتا ہے کہ ہم یونہی کھڑے ہو جاتے ہیں، ہمیں بھی کوئی کھڑا کر دیتا ہے، بہر حال تو یہ للٰہی چیز ہے جو اللہ کی طرف سے بعضوں کو عطا ہوتی ہے، وہی ابا جی رحمہ اللہ کو بھی منجانب اللہ عطا تھی کہ سب لوگ ان کے رعب و دبدبہ میں کھڑے ہو جاتے تھے۔

میرے ابا جی رحمہ اللہ ذکر وغیرہ تو فوج میں بھی کرتے تھے اور داڑھی انہوں نے فوج میں رکھی ہوئی تھی، اور انگریزوں کی طرف سے اس کی فوج میں ممانعت نہیں تھی، بلکہ وہ اس کو اچھا سمجھتے تھے، اور داڑھی وہاں بھی وجاہت کی دلیل تھی، البتہ داڑھی وردی کے وقت اوپر چڑھا لیتے تھے، بعد میں وہ گھر آ کر صحیح کر لیتے تھے، داڑھی چڑھانے کے لئے کسی چیز سے باندھتے نہیں تھے، جب ابا جی پنشنی ہو کر تشریف لائے تو ان کی شرعی داڑھی اور شرعی بال تھے، یعنی پیچھے پٹّھے رکھے ہوئے تھے۔

میں نے جب ابا جی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ کو یہ تہجد پڑھنا اور یہ ذکر وغیرہ کرنا کس نے سکھایا، انہوں نے فرمایا بیٹے میں نے کسی سے نہیں سیکھا، مجھے تو یہ سب چیزیں حضور ﷺ سے عطا ہیں، اور آپ ﷺ نے ہی مجھے ان سب چیزوں کی تعلیم دی ہے۔

ہماری اماں جی کا یہ دستور تھا کہ وہ تقریباً رات بارہ بجے تک اپنے تمام پوتوں اور بیٹوں کو لیکر بات کرتی رہتی تھیں، اس کے بعد اٹھ کر وضو کرتیں اور نماز پڑھتی تھیں، ابا جی رحمہ اللہ نے اس معاملہ میں ان کو بہت سمجھایا، ایسا مت کرو اور جلدی سو جایا کرو، انہوں نے کہا مجھے تشویش سی رہتی ہے، فلاں کیا کر رہا ہے وہ کہاں ہے؟ میں ایسی نماز نہیں پڑھنا چاہتی، ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر نماز پڑھنا چاہتی ہوں، ابا جی رحمہ اللہ نے کہا اچھا تمہاری مرضی۔

اور ہمارے ابا جی رحمہ اللہ کا یہ حال تھا کہ فوراً عشاء کے بعد آئے اور تھوڑی دیر بات کی اور خدا حافظ

کہتے ہوئے اوپر تشریف لے جاتے، کیونکہ ان کو علی الصبح اٹھنا ہوتا تھا، ہماری اماں جی صبح اٹھنے میں بڑی کسل مند تھیں، ابا جی رحمہ اللہ اٹھاتے تھے وہ مشکل سے اٹھ کر صبح کی نماز پڑھتی تھیں۔

ہم اماں جی کے پاس بیٹھ کر دنیا بھر کی باتیں کرتے تھے، مسئلہ مسائل کی باتیں بھی ہوتی تھیں، کبھی مجھ سے تلاوت بھی سن لیتی تھیں، اور ابا جی رحمہ اللہ کے جو معمولات تھے، وہ بالا خانہ پر جو کچھ کرتے رہتے تھے، ہم اس سے یہ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ اب کیا کر رہے ہیں، ان کی حرکات سے ہم یہ سمجھتے رہتے تھے کہ وہ اب یہاں پہنچ گئے ہیں اب یہ کر رہے ہیں، مثلاً سرمہ وہ لگاتے تھے تو سرمہ دانی جو لکڑی کی تھی زور سے اس طریقہ سے اس میں سلائی مارتے تھے کہ اس کی آواز ہمیں نیچے آتی تھی، کہ اب سرمہ لگایا جا رہا ہے، پھر وہ ٹائم پیس میں چابی بھرتے تھے اس کو بھی وہ اتنے زور سے بھرتے تھے کہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اب گھڑی میں چابی دے رہے ہیں، پھر اخیر میں جوان کا الارم ہوتا تھا یہ کہ وہ کچھ پڑھ کر تالی بجاتے تھے، اس سے پہلے پہلے تو اگر ہمیں کوئی بات پوچھنی ہو تو پوچھ سکتے تھے، اس کے بعد وہ منع کر دیتے تھے، الا ماشاء اللہ، شدید عذر کی حالت میں تو ہم چلے جاتے تھے، لیکن عام طور پر ہم ان سے کوئی بات نہیں کر سکتے تھے، اور کبھی اتفاق ہوتا تو ابا جی رحمہ اللہ نے کھڑکی سے ایک آدھ بات کر لی تو کر لی، ورنہ سو جاتے تھے۔

اس کی انتہا یہ ہے کہ ان کے لڑکے جب جنگ سے واپس آئے ہمارے یہاں رات کو گاڑی آتی تھی ۱۲ بجے کے قریب وہ آئے، اب وہ ظاہر ہے کہ جنگ سے آئے ہیں اور بڑی خوشی کا وقت ہے، لیکن جب شور ہوا تو ابا جی رحمہ اللہ نے کھڑے ہو کر پوچھا خیریت سے آ گئے، ٹھیک ہو، اچھا خدا حافظ، اس لئے کہ یہ ان کی نیند کا ایک چھوٹا سا وقت تھا، اس میں بھی اگر وہ نہ سوئیں تو پھر کس وقت سوئیں، رات تین بجے وہ اٹھ جاتے تھے۔

اور جیسا کہ میں نے کہا کہ ان کا تکوینیات کے شعبہ سے تعلق تھا، اس کا اندازہ آپ کو ان چند واقعات سے ہوگا۔

میں اپنے ابا جی رحمہ اللہ کے ساتھ بطورِ قلی کے جاتا تھا، اور اکثر میں ان کے ساتھ جاتا تھا، سودا سلف اٹھانے کے لئے، اور ہمارے ابا جی رحمہ اللہ کا یہ معمول تھا کہ محلّہ کی عورتیں جو بیوائیں تھیں یا ان

کے شوہر کہیں گئے ہوئے ہوتے تھے ان سے پوچھتے تھے کہ کچھ منگانا ہوتو منگالیں،تو وہ کچھ نہ کچھ منگا لیتیں،جب ہم بازار پہنچتے تو مجذوبوں کا ایک گروہ ہوتا تھا،وہ اباجی رحمہ اللہ کی جان پر اٹک جاتا تھا،ان میں ایک عورت تھی اس کا نام بھمبو تھا،وہ ننگی رہتی تھی،ایک یحییٰ خان تھے،ایک بالا بھائی تھے جو دراصل ایک سقہ تھا،جو کہ انہی مجذوبوں میں سے تھا،اور صاحبِ خدمت تھا،ایک کوئی اور تھا۔یہ چار مجذوب تھے۔

یہ چاروں مجذوب اباجی کو وقتِ مقررہ پر جب وہ بازار جاتے ملا کرتے تھے،اور اباجی سے پیسے بھی مانگتے تھے،اباجی ان کو دو دو پیسے دیا کرتے تھے،اس زمانے میں روپے کے سولہ آنے ہوتے تھے،اور ہر آنہ میں چار پیسے ہوتے،میں نے ایک دن اباجی رحمہ اللہ سے پوچھا آپ نے یہ کیا پال رکھے ہیں؟ خواہ مخواہ پیچھے لگائے ہوئے ہیں،فرمایا بیٹے یہ سب یہاں کے صاحبِ خدمت ہیں،ان کی ڈیوٹیاں یہاں لگی ہوئی ہیں،ان سے زیادہ کچھ بات مت کیا کرو......بہت اچھا۔

بھمبو یہ ایک گجرات کی رہنے والی ادھیڑ عمر کی عورت تھی،یہ ننگی رہتی تھی،کیسے آئی کہاں کہاں سے ہوکر آئی،یہ معلوم نہیں،عام طور پر یہ شہر میں پھرتی رہتی تھی،بچے گھروں کی عورتیں باہر نکل آتی تھیں اور شور ہوتا تھا،بھمبو آ گئی! بھمبو آ گئی! یہ نام بھی عام لوگوں نے اس کا رکھا تھا،اس کے موٹاپے کی وجہ سے،کبھی کبھی یہ ایک تنکوں کا گھٹا لے کر بیٹھ جاتی تھی یہ تنکے ایک بالشت کے قریب بڑے ہوتے تھے،پھر یہ ان کو حکم دیتی تھی سب کھڑے ہوجاؤ،وہ کھڑے ہوجاتے تھے،ایک لائن میں ہوجاؤ وہ ایک لائن میں ہوجاتے،پھران کا ایک مربع بناتی تھی پھر اس پر چھت ڈالتی تھی،بس اسی طرح وہ ان سے کھیلتی رہتی تھی،عام لوگ کھڑے دیکھتے رہتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ راستے میں اباجی سے جب سب پیسے لے چکے تو بھمبو نے لینے سے انکار کیا،اور یہ کہا کہ میں ایک آنہ لوں گی،ایک آنہ ایک آنہ،چار پیسے کی ایک اکنّی ہوتی تھی،آدھے بازار تک اسی طریقہ سے چلی آئی،اباجی رحمہ اللہ نے تنگ آ کر یہ کہا لیتی ہو یا جیب میں رکھ لوں،غصے سے فرمایا لیتی ہے یا نہیں؟ اس نے دبی آواز میں کہا اچھا دے دو،اور وہ لے کر چلی گئی۔جب وہ چلی گئی تو میں نے اباجی رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ کمال کرتے ہیں دو پیسے کے لئے اسے ایک گھنٹہ ہوگیا،وہ

پیچھے لگی ہوئی ہے آپ اسے دو پیسے نہیں دے رہے، آپ بڑے کنجوس ہیں، دو پیسے کوئی چیز ہے آپ اسے دو پیسے دے دیتے، اس پر ابا جی رحمہ اللہ مسکرائے، فرمانے لگے یہ دو پیسے کا قصہ نہیں تھا، میں نے پوچھا اور کیا قصہ ہے؟ فرمایا تجھے کیوں بتادوں، میں نے کہا بتادو، اتنی دیر تک تو جھک جھک میں نے سنی ہے اب آپ کہہ رہے ہیں کہ کیوں بتادوں، کہنے لگے یہ عہدہ مانگ رہی تھی، کہ مجھے اوپر کا عہدہ دے دو، میں اُسے یہ کہہ رہا تھا کہ نہیں تجھے اسی عہدے پر کام کرنا ہے، تو یہ جھگڑا پیسوں کا جھگڑا نہیں تھا۔

میری عمر غالباً چودہ سال تھی میرے ابا جی رحمہ اللہ کا معمول تھا عشاء کے بعد اوپر بالا خانے پر چلے جاتے تھے، پھر فجر میں نیچے آتے تھے، البتہ ہماری دادی اماں رات بارہ بجے تک بیٹھی رہتی تھیں، اور ان کے بیٹے، پوتے اردگرد بیٹھے رہتے تھے، ایک دن رات گیارہ بجے کے قریب ابا جی رحمہ اللہ اوپر سے نیچے تشریف لائے، ہم سب حیران ہو کر کھڑے ہوگئے، انہوں نے مجھے فرمایا ''تینا بیٹے'' (یہ میرا پیار کا نام تھا) ایک کام ہے تم ڈرو گے تو نہیں؟ میں نے عرض کیا کیا کام ہے ایسا؟ فرمانے لگے! ایک مجذوب تبادلہ ہو کر ابھی آیا ہے اور وہ بھوکا ہے، تمہاری اماں جی (یعنی دادی اماں) کھانا گرم کرلیں گی، تم ان کو جا کر لے آؤ اور باہر ڈیوڑھی میں بٹھا کر کھانا کھلا دینا اندر مت لانا، اس لئے کہ وہ ننگا ہے، اس سے نام پوچھ لینا اس کا نام یحیٰ ہے، وہ چونگی ناکے پر گھوم رہا ہے، جو وہاں سے آدھا میل تھا، میں نے عرض کیا میں جاتا ہوں اور اس کو لا کر کھانا کھلا دونگا، ابا جی رحمہ اللہ نے اماں جی کو کچھ ہدایات دیں اور اوپر بالا خانے پر چلے گئے، میں نے ایک ڈنڈا اپنے ہاتھ میں لیا کتوں سے حفاظت کے لئے اور ان کو لینے چلا، وہ اسی جگہ پر گھوم رہے تھے، میں نے ان سے نام دریافت کیا، اس نے جلدی جلدی کہا یحیٰ! یحیٰ! میں نے کہا ٹھیک سے نام بتاؤ ورنہ رات بھر بھوکے رہو گے، انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا یح یا! میں نے کہا ٹھیک ہے میرے ساتھ آجاؤ وہ میرے ساتھ آگئے اور حسبِ ہدایت ان کو کھانا کھلا کر رخصت کر دیا، نہ تو میری اماں جی کے لئے کوئی اچنبھے کی بات تھی، نہ ہی میرے لئے چونکہ جو میرا ماحول اور ابا جی رحمہ اللہ کی معیت تھی، اس میں ایسے بہت قصے سنتا رہتا تھا اور کچھ کچھ دیکھتا بھی رہتا تھا، اس لئے اس کا میں نے

اپنے دوستوں سے تذکرہ نہیں کیا البتہ نہ جانے کیوں؟ اپنی نانی اماں سے یہ واقعہ رات کا بیان کردیا، میری نانی اماں بڑی عبادت گذار، تہجد گذار تھیں، اور اپنا بڑا مقام رکھتی تھیں، ایک دفعہ مجھے فرمایا تینا بیٹے! میں ایک روز تہجد پڑھ کر کچھ پڑھ رہی تھی کہ اچانک آسمان سے دو پرندے جن کے جسم سے بہت روشنی نکل رہی تھی اور بہت خوبصورت تھے، میرے سامنے آکر بیٹھ گئے، میں ان کو دیکھ کر ڈر گئی، اور میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان سے مجھے ڈر لگ رہا ہے آپ ان کو واپس بلا لیجئے، وہ چلے گئے اور پھر کبھی نہیں آئے، اکثر روزے بھی رکھتی تھیں، بہرحال انہوں نے فرمایا بیٹے تم میرا ایک کام کردو، میں نے عرض کیا کیا کام؟ فرمانے لگیں تم یحییٰ بھائی کو میرے پاس لے آؤ، میں نے کہا نانی اماں کیا کروگی اس کو بلا کر وہ ویسے بھی ننگا رہتا ہے، پھر کہنے لگیں تم اس بات کو چھوڑو وہ کیسے رہتا ہے مجھے اس سے ایک کام ہے، بس تم اس کو لے آؤ، میں نے عرض کیا بہت اچھا، میں مدرسے سے جب آؤں گا تو وہ اسی جگہ گھومتا رہتا ہے میں لے آؤں گا، چنانچہ جب میں مدرسے سے نکلا تو یحییٰ بھائی مجھے مل گئے، میں نے کہا یحییٰ بھائی میرے ساتھ آؤ، اور وہ میرے ساتھ بلا کچھ کہے چل پڑے، ہمارے محلے کا ایک چوک تھا، ایک طرف ہمارا گھر اس کے بالکل سامنے نانی اماں کا گھر تھا، میں نے اس کو چوک میں کھڑا کر کے نانی اماں کو اطلاع دی کہ یحییٰ بھائی آ گئے ہیں، وہ گھر سے نکل کر اس کے قریب آکر نیچی نظر کر کے کھڑی ہوگئیں، اور انہوں نے کہا یحییٰ بھائی ہمارا مکان نہیں بنتا، سب کے مکان پکے بنے ہوئے ہیں ہمارا ابھی تک کچا ہے، چھپر پڑا ہوا ہے، اس نے ایک لکڑی کا پتلا سا ڈنڈا زمین سے اٹھایا اور کہنے لگا! تمہارا مکان! تمہارا مکان! لو بن گیا! بن گیا! یہ کہتے ہوئے اس نے مکان کے چاروں طرف لائن کھینچنی شروع کی، ایک جگہ جب وہ لائن کھینچ رہا تھا نانی اماں نے کہا یحییٰ بھائی یہ جگہ ہماری نہیں ہے، مگر وہ یہ کہتا رہا بن گیا، اور اس جگہ کو بھی شامل کرلیا، اس کے بعد وہ چلا گیا، دوسرے روز میرے بڑے ماموں تفضّل حسین خان مرحوم نے بذریعہ ٹیلی گرام پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیجا اور اس میں تحریر تھا کہ مکان بنانا شروع کردو۔

آپ آج یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پانچ سو روپے میں مکان کیسے بنے گا، جی ہاں! اس زمانے میں ایسا ہی ہوتا تھا پانچ سو روپے میں مکان بن جاتا تھا، روپے کے سولہ آنے ہوتے تھے، مزدور ایک

آنہ مزدوری لیتا تھا اور راج یعنی معمار دو آنے، دو روپے کی ہزار پختہ اینٹ آتی تھیں، اب یہ باتیں خواب وخیال بن گئیں، یہ غالباً 1932ء کا واقعہ ہے، اور وہ جگہ نانی اماں کی نہیں تھی، جب بنیاد کھودی جارہی تھی اور اس جگہ پر پہنچے تو وہ صاحب بھی جن کی جگہ تھی موجود تھے اور دوسرے لوگ بھی، اُن سے کہا گیا کہ بھئی اگر تم اس جگہ کے پیسے لے کر دے دو تو یہ مکان سیدھا بن جائے گا، انہوں نے جواب دیا یہ کوئی جگہ ہے جس کے پیسے لئے جائیں دو چار گز تو یہ کل جگہ ہے آپ ایسے ہی لے لیجئے، تو جہاں یحییٰ بھائی نے لکیر کھینچی تھی اسی کے مطابق مکان بن گیا، اب یہ بھی دیکھیں کہ دوسرے دن ہی وہ منی آرڈر ٹیلی گرافیکلی موصول ہوتا ہے، دوسرے طریقے سے منی آرڈر اجمیر شریف سے پانچ چھ روز میں ملتا ہے، اتنی تاخیر بھی تکویناً گوارا نہیں تھی۔ یہ ان کی کرامت تھی۔ [1]

دو تین ماہ بعد یحییٰ بھائی کا تبادلہ ہوگیا، اور وہ غائب ہوگئے، میں نے جب اباجی رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ یحییٰ بھائی آج کل نظر نہیں آرہے تو اباجی رحمہ اللہ نے فرمایا ہاں ان کا تبادلہ کردیا گیا، میں نے پوچھا آخر کیوں؟ وہ تو بڑا اچھا آدمی تھا، فرمایا نہیں! وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتا تھا، میں خاموش ہوگیا، کیا لٹاتا تھا؟ کیوں لٹاتا تھا؟ یہ معلوم نہیں۔

اس کے بعد میں نے اباجی سے پوچھا اس کی جگہ کون آیا؟ فرمایا وہ سخت مزاج ہے تم اس کے پاس مت جانا، میں نے کہا میں اس کے پاس جاؤں گا، بات نہیں کروں گا، نہیں تم کچھ نہ کچھ اسے چھیڑو گے، میں نے کہا میں خواہ مخواہ اسے کیوں چھیڑوں گا، میرا دماغ خراب ہے کیا؟ آپ مجھے یہ بتادیں، فرمانے لگے بازار کے بیچ میں جو فلاں دوکان ہے قاضی پنواڑی کی، اس کے سامنے ایک مدراسی لڑکا ہوگا، دس گیارہ سال کا وہ ننگا پڑا ہوا ہے، وہ اس کی جگہ آیا ہے،

میں وہاں پہنچا دیکھا کہ ایک گول مٹول سا کالا بھجنگ لڑکا لیٹا ہوا ہے، میں اس کو کھڑا غور سے دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا، اللہ اکبر! اس عمر کے بچے بھی ڈیوٹی دیتے ہیں، اور سرکاری آدمی ہوتے ہیں، ابھی میں کھڑا دیکھ رہا تھا تقریباً تین یا چار منٹ گذرے ہونگے کہ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا

[1] حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ مجذوبین کے بارے میں فرماتے ہیں:
وہ کشف کی بناء پر بطور پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ یوں ہوگا، سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا، اس طرح ہوجانا کچھ ان کے کہنے کے سبب سے نہیں ہوا (الرفیق فی سواء الطریق صفحہ ۴۷)

اس کی آنکھوں سے دو شعاعیں نکلیں، اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگے، سارا جسم پسینے سے تر ہوگیا، میں ڈر کر وہاں سے بھاگا اور سیدھا ابا جی رحمہ اللہ کی خدمت میں گیا، اور شکایت کی آپ کے آدمی نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا، وہ فرمانے لگے بیٹا اسے معاف کردو، غلطی سے ایسا ہوگیا، میں نے پھر کہا کہ میں نے تو اس سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ بس تم اسے معاف کردو، اصل میں تم کافی دیر تک اسے دیکھتے رہے جس کی وجہ سے اسے غلط فہمی ہوئی، بات یہ ہے کہ اس کی عمر نابالغی کی ہے پھر ننگا پڑا رہتا ہے، اس کو خود کی حفاظت کے لئے ایک زائد قوت دے رکھی ہے، کیونکہ وہ ابھی بچہ ہے، وہ اپنی حفاظت بے چارہ کیسے کرے گا، اس لئے اس کے پاس ایک قوتِ زائد بھی ہے، تاکہ وہ اپنی حفاظت کرسکے، غلط فہمی سے اس نے وہ قوت استعمال کرلی، چلو کوئی بات نہیں اس کو معاف کردو، اور میں نے معاف کردیا، اس کے بعد مجھے کبھی اس کے پاس جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

بالا بھائی جو تھے یہ ہمارے ہی شہر کے رہنے والے تھے، یہ بہشتی یعنی گھروں میں پانی بھرنے والوں میں سے تھے، ان کی والدہ زندہ تھیں، اس وجہ سے آخر تک شہر ہی میں رہے، ان کی داڑھی تھی، کپڑے پہنتے تھے، پان بڑے شوق سے کھاتے تھے،

ان کا بھی یہ تھا کہ ایک خاص ایسا وقت آتا تھا کہ وہ اس وقت ہم سے نہیں رکتے تھے، فوں فوں کرکے وہ جناب ایسی آوازیں نکالتے تھے کہ ہم سب خائف ہوجاتے تھے، اور وہ وہاں سے بھاگ جاتے تھے، جہاں کہیں ان کی ڈیوٹی کا وقت ہوتا تھا یا طلبی ہوتی تھی اس طرح بھاگ جاتے تھے، ویسے ہم ان کو بٹھا کر رکھتے تھے، اور ہم سے الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے تھے، ایک یہ بھی تھا کہ ہمارے یہاں ایک طوائف تھی جس کو سب زلفی کہتے تھے یہ اس کے پاس جا کر بھی بیٹھتے تھے بلکہ بظاہر اس کے عاشق بھی تھے، جب کبھی کوئی کہتا بالا بھائی زلفی تو وہ بڑے زور سے سینہ پر ہاتھ مار کر کہتے تھے ''ہائے زلفی'' وہاں پان وغیرہ بھی کھاتے تھے۔

یہ ہمارے مدرسہ زینت الاسلام میں یا اس کے اردگرد رہتے تھے، ماں کے پاس بھی چکر لگاتے تھے، ان کی کیا ڈیوٹی تھی مجھے معلوم نہیں، کبھی شہر کے حالات خراب ہوتے یا ہندو مسلم فساد ہوتے تو یہ

ادھر ادھر دوڑتے نظر آتے تھے، ایک دفعہ یہ کسی خاص ڈیوٹی پر جانا چاہتے تھے، مگر میرا بچپن تھا، میں ان کو روک رہا تھا، کہ بالا بھائی کیوں جا رہے ہو، مت جاؤ، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ مجھے نہیں جانے دے گا، اچانک انہوں نے اپنی شکل خوفناک بنا کر ایسی آواز نکالی کہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، اور وہ فوراً وہاں سے بھاگ کر غائب ہو گئے، اباجی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا کہ یہ سرکاری آدمی ہیں، اباجی رحمہ اللہ سے یہ روزانہ ملتے تھے۔

بہرحال اس قسم کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اباجی صاحب کے پاس تکوینیات میں سے کوئی اونچا عہدہ تھا اور کافی عرصہ رہا۔

ایک اُن کا یہ معمول تھا کہ اگر کسی شخص پر جن آیا، اباجی رحمہ اللہ کو اطلاع ملی وہ بزرگ ہی تھے عامل نہیں تھے، اب کسی نے آکر اطلاع دی کہ صوبیدار صاحب فلاں کو اثر ہو گیا ہے وہ تو اس طریقہ سے چیخ و پکار کر رہا ہے یہ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے، اچھا، انہوں نے اپنا بید یا عصا اٹھایا، ایک موٹا سا بید ہاتھ میں رکھتے تھے چل دیئے، وہاں پہنچ کر اسے دیکھا، اس کے بعد انہوں نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا، اول درجہ کے ملعون، نالائق ہو، تم نے یہ وعدہ کیا ہوا ہے کہ کسی انسان کو تکلیف نہیں دو گے، پھر یہ وعدہ خلافی تم نے کیوں کی، کیسے تجھے جرأت ہوئی، وہ بتاتا کہ مجھے اس شخص نے اس طریقہ سے اذیت پہنچائی ہے، کچھ بھی ہے بہرحال تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا، بس تم چلے جاؤ، دفع ہو جاؤ یہاں سے، وہ کہتا بہت اچھا صاحب میں جا رہا ہوں، یہ ان کا عمل تھا، بعض دفعہ یہ بھی ہوا کہ وہ جن پھر آ گیا، کیسے آنا ہوا اور یہ کیا حماقت ہے، اجی آپ نے مجھے اس وقت حکم دیا تھا میں چلا گیا تھا، میں نے آپ سے وعدہ تو نہیں کیا تھا کہ دوبارہ نہیں آؤں گا، اچھا اب تم بتاؤ یہ وعدہ کرتے ہو یا نہیں، اجی میں یہ کیسے وعدہ کر سکتا ہوں، نہیں تمہیں کرنا پڑے گا، اب اس سے وعدہ لے لیا، چلا گیا، پھر نہیں آتا تھا، یہ بھی ان کی کھلی ہوئی کرامات میں سے ہے۔

ہمارے گھر کے پیچھے ہندو برہمن رہتا تھا اس کا لڑکا جب بیمار ہوا تو وہ آیا اس سے ہماری کافی مقدمہ بازی بھی رہی، دشمنی بھی رہی، بہرحال اس نے اباجی رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ میرا لڑکا بیمار ہے، اباجی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ دیکھو بھئی موت زندگی تو اللہ کے اختیار میں ہے یہ پانی تم لے

جاؤ،اس سے یہ سہولت ہو جائے گی کہ وہ سہولت سے مر جائے گا اور جلدی مر جائے گا،اس سے زیادہ اب کچھ ہو نہیں سکتا،بعض دفعہ وہ اس قسم کی بات بھی فرمادیا کرتے تھے،لاگ لپیٹ اور دنیاداری کی بات ان میں نہیں تھی ،بہت سیدھے اور بھولے قسم کے تھے،ان کی بعض باتوں کا تو گھر والے مذاق بھی اڑاتے تھے،خاص طور پر ہمارے چچا وغیرہ تفریحاً۔

سادگی کا یہ عالَم تھا کہ ایک دفعہ ان کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی جب کھانا کھانے بیٹھتے تو دادی اماں سے پوچھتے کہ کیا پکایا ہے،وہ فرماتیں جو کچھ پکایا ہے وہ سامنے آجائے گا،نہیں مجھے بتاؤ کیا پکایا ہے؟ مجھے بتادو؟ ایک دفعہ دادی اماں نے چڑ کر کہا انڈے پکائے ہیں’’ حالانکہ اُس وقت مونگ کی بھُنی ہوئی دال پکائی تھی‘‘ ،یہ بات دادی اماں نے چِڑ کر کہی تھی ،کھانا سامنے آ گیا،ابا جی رحمہ اللہ کھانے لگے ،اب مستقل یہ فرمائے جارہے تھے کہ سبحان اللہ آج انڈے بہت مزیدار پکے ہیں،اب دادی اماں بھی ہنس رہی ہیں اور دوسرے بھی ہنس رہے ہیں کہ لو جی دال کو انڈے سمجھ کر کھائے جارہے ہیں یہ ان کی گویا بھولے پن کی بات تھی۔

اپنی زندگی کے جو واقعات وہ بڑے عجیب وغریب سناتے تھے،واقعی وہ بہت عجیب ہیں،ایک دفعہ مجھ سے یہ فرمانے لگے کہ مراد آباد چھاؤنی میں کسی جگہ ہماری رجمنٹ پڑی ہوئی تھی اور میری جمعداری (نائب صوبیداری) کا معاملہ یہ تھا کہ جمعدار (نائب صوبیدار) بنوں گا یا نہیں؟اس بارے مجھے تھوڑی سی تشویش تھی میرے ایک اور ساتھی تھے وہ بھی اسی تشویش میں مبتلا تھے،ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں کوئی جنگل ہے اور اس میں کوئی بزرگ ہیں وہ جنگل ہی میں رہتے ہیں،ایک دن ہم نے پروگرام بنایا کہ ان سے چل کر ملیں،اس زمانہ میں گھوڑے ہوتے تھے ہم نے اپنے گھوڑے لئے ان پر بیٹھ کر ہم چل دیئے،اب جنگل میں گھوم رہے ہیں پتہ تو تھا نہیں یہ پتہ تھا کہ وہ فلاں جنگل میں ہیں،اب اس جنگل میں تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ ایک جھونپڑی سی بنی ہوئی ہے، گئے اور نیچے اتر کر گھوڑے کھڑے کئے ،جھانکا تو بزرگ بیٹھے ہوئے تھے،ہم نے جا کر کہا السلام علیکم اُنہوں نے کہا وعلیکم السلام آیئے میں آپ لوگوں کا انتظار کررہا تھا تشریف رکھئے فرمایا کہ آپ لوگ چائے پئیں گے،میں نے کہا حضرت یہاں چائے،انہوں نے فرمایا نہیں نہیں یہ بتاؤ کہ چائے پئیں گے

، بالکل پئیں گے، کیوں نہیں پئیں گے، انہوں نے ایسے ہاتھ کیا اور ایک چائے کا ہاتھ میں پیالہ آ گیا، وہ مجھے دے دیا، دوسری مرتبہ ایسے ہی کیا اور دوسرا پیالہ آ گیا وہ میرے ساتھی کو دے دیا اور تیسری مرتبہ خود آپ نے لے لیا۔

ابا جی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ پھر ایسی چائے اتنی لذیذ کبھی نہیں پی، چائے پینے کے بعد بزرگ نے فرمایا برخوردار تمہارا کام تو ہو گیا وہ تو پہلے سے منظور ہے تم جمعدار (نائب صوبیدار) بن گئے، اوران کا نہیں ہوگا اور تم جتنی جلدی ہوسکے اپنی رجمنٹ میں پہنچ جاؤ، ہم نے کہا کہ کوئی بات ہے اس لئے جلدی نکل چلو، چنانچہ وہاں سے گھوڑے دوڑائے جس وقت ہم اپنی بیرکوں سے آدھے میل دور رہ گئے تھے، ہم نے دیکھا کہ پیچھے سے ایک ریلہ زبردست آندھی طوفان اور بارش کا چلا آ رہا ہے، جیسے ہی ہم اپنے بیرکوں میں داخل ہوئے دھڑ دھڑ بارش شروع ہوگئی، بزرگ نے صحیح فرمایا تھا، خیریت کے ساتھ ہم پہنچ گئے۔

اور ابا جی نے یوں فرمایا کہ کتنی ہی بار ہم دوبارہ اس جنگل میں گئے لیکن وہ ملے ہی نہیں اور نہ ہی جھونپڑی ملی، ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس آ گئے، پھر وہ نہیں ملے ایسے بزرگوں سے بھی ابا جی کی ملاقات ہوئی۔

ایک وہ لطیفہ کے طور پر سنایا کرتے تھے کہ جب پہلی جنگِ عظیم ہوئی تو میں اس جنگ کے لئے روانہ ہوا، محاذ پر جب پہنچ گیا اور لڑائی میں شریک ہوا تو میں نے اللہ میاں سے دعا کی کہ میں اس جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتا تو آپ کوئی ایسا سبب بنا دیں کہ میں اس جنگ سے فارغ رہوں، جنگ تو بہت لمبی تھی، اچانک مجھے یہ معلوم ہوا کہ منجانب اللہ بیت المقدس میں سپلائی کا ایک بہت بڑا ڈپو بنا ہوا تھا جہاں سے تمام راشن کی سپلائی تمام فوجوں کو ہوتی تھی، وہاں کا انچارج بنا کر مجھے بھیج دیا گیا کہ آپ وہاں جائیں اور وہاں کا انتظام سنبھالیں، اور جہاں جہاں محاذ پر ضرورت ہو راشن پہنچائیں، بیت المقدس میں آنے کے بعد میرا کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا دن بھر راشن وغیرہ کا چارٹ بنایا اور اس کے مطابق کلرک بناتے رہتے، اور سپلائی ہوتی رہتی تھی، اور جو میری عبادت ہوتی تھی وہ خاص بیت المقدس میں بیٹھ کر کرنے لگا، کبھی حضرت زکریا علیہ السلام کے مزار کے

قریب کبھی حضرت یحیٰ علیہ السلام کے مزار کے پاس بیٹھ گیا، کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مزار پر، ایک دفعہ میں ذکر کر رہا تھا تو مجھے کسی نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دوسری طرف پھیر دیا جب میں نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف متوجہ تھا ادھر سے مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف متوجہ کر دیا گیا، اس کے بعد پھر میں مستقل ان کے مزار کے ساتھ بیٹھنے لگا۔

یہ ہیں اباجی کے تکوینیات سے متعلق ہونے والے واقعات اور ان کی کرامات۔

اباجی رحمہ اللہ کے جتنے معمولات تھے، ان میں وہ بالکل مشین کی طرح چلتے تھے، سفر میں حضر میں اور کسی چیز کی وجہ سے کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنے ذکر کا بھی ناغہ نہیں کرتے تھے، ہمہ وقت ذکر میں مشغول رہتے تھے، سب سے الگ تھلگ کسی دوسری دنیا میں کھوئے رہتے تھے۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ ہوا کہ دہلی میں سول لائن تھانہ میں میرے چچا شبیر احمد خان کے پاس گئے اور وہاں سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اس پر ایک مسجد تھی، اس میں ایک پٹھان کابلی بزرگ تھے، جو اس وقت بہت مشہور تھے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ان کو کوئی نسبت تھی یا خط و کتابت سے تعلق تھا، طبیعت کے وہ بہت گرم تھے، اور بہت کچھ اس مسجد میں لکھا ہوا تھا، میرا وقت ضائع نہ کریں، یہ نہ کریں، ایسا کریں، فلاں بات ہو تو اس طریقہ سے کریں، گھڑے تھے ان پر لکھا ہوا تھا ان میں سے پانی لے جائیں اور فلاں فلاں تعویذ دیتا ہوں جس کے فلاں اوقات ہیں۔

میں خود ان سے ملا ہوں اور کئی دفعہ ملا ہوں، بڑے سرخ وسفید وجیہہ آدمی تھے۔

اباجی رحمہ اللہ سول لائن میں یہ سوچ کر کہ یہاں سارے پولیس والے ہیں میں یہاں ذکر کروں گا تہجد پڑھوں گا تو پتہ نہیں پولیس والوں کو کیا محسوس ہوگا، کیوں نہ میں پہاڑی والی مسجد میں جا کر اپنے معمولات پورے کرلوں تو وہاں سے چل کر وہاں پہنچ گئے، وہاں کپڑا اچھا کر شروع ہو گئے وہ کابلی بزرگ جو تھے وہ اندر سے نکلے انہوں نے اباجی رحمہ اللہ سے کہا کہ آپ عجیب آدمی ہیں کہ نہ کسی کی نیند کا خیال ہے نہ کسی کے آرام کا، یہاں آکر آپ نے جہراً ذکر شروع کر دیا، کس کی اجازت سے آپ یہاں آئے؟ اباجی رحمہ اللہ نے فرمایا ٹھیک ہے اگر آپ کی نیند میں خلل پڑ رہا ہے تو میں

ذکر خفی کرلوں گا، وہ اندر چلے گئے، تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور ابا جی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ نہیں پتہ کہ ان کے ساتھ وہاں کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا لیکن انہوں نے میرے پیر پکڑ لئے اور مجھ سے معذرت ومعافی مانگی کہنے لگے مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، آپ مجھے معاف کردیں اور آپ جس طریقہ سے ذکر کرنا چاہیں، کریں، میں آپ کے معمولات میں دخل نہیں دوں گا، میں نے ان سے کافی کچھ کہا لیکن وہ یہی کہتے رہے آپ مجھے دل سے معاف کریں اور آپ اسی طریقہ سے ذکر کریں جیسے آپ پہلے کررہے تھے، جب وہ اندر چلے گئے تو میں نے اپنا ذکر روز کے معمول کے مطابق شروع کردیا۔

یہ واقعہ ابا جی رحمہ اللہ نے خود مجھے سنایا۔

ایک اور واقعہ ایسا ہے جو تکوینی سلسلہ کا ہے میرے بڑے چچا رسالدار رفیق احمد خان صاحب (جن کو ہم غصیلی چچا کہتے تھے) ان سے میری بڑی خالہ صاحبہ کی شادی ہوئی، لیکن اولاد نہیں ہوئی، اوراس سلسلہ میں کافی کچھ کیا، جو اس زمانہ میں ہوتا تھا، بعد میں میری خالہ صاحبہ کی اجازت سے یہ طے ہوا کہ ان کی دوسری شادی کردی جائے اس وقت چچا کی کافی عمر تھی وہ گویا جمعدار (نائب صوبیدار) ہوچکے تھے رسالدار ہونے والے تھے، تو یوپی میں ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ اہار میں ایک رشتہ تھا جو چچا کے کوئی دوست تھے ان کے ذریعہ سے وہاں بات چیت ہوئی اور وہ رشتہ طے ہوگیا، گھر آکر انہوں نے اطلاع دی اور تاریخ وغیرہ طے ہوکر بارات یہاں سے چلی، بلند شہر سے آگے جہانگیر آباد کی سرائے پر والد صاحب تو اس میں شریک نہیں تھے ابا جی رحمہ اللہ، ہمارے کبیر چچا تھے اور گھر کے دوسرے افراد، سرائے میں ٹھہرے اور ابا جی رحمہ اللہ سرائے میں آرام کررہے تھے، اور رفیق چچا جن کی شادی ہورہی تھی یہ باہر سرائے سے نکلے ہوئے تھے، وہاں ایک مجذوب سے جو سرائے کے باہر بیٹھا ہوا تھا ان کا جھگڑا ہوگیا، اوراس مجذوب نے چچا کو ڈانٹنا شروع کردیا، جیسے ہی اس کی ڈانٹ اور تکرار کی آواز ابا جی رحمہ اللہ نے سنی تو وہ فوراً سرائے سے باہر نکلے تو وہ مجذوب یہ جملے اس وقت ادا کررہا تھا کہ ”بیٹا لینا چاہتا ہے تُو، اولاد کے لئے شادی کررہا ہے، دُوں تجھے“

یہاں تک وہ پہنچا تھا، اس وقت اباجی رحمہ اللہ باہر نکل آئے اور جیسے ہی نکلے پہلا جملہ آپ نے یہ کہا کہ خبردار، آگے اگر تم نے ایک لفظ بھی بولا، وہ مجذوب ایک دم خاموش کھڑا رہ گیا، اباجی نے کہا کہ تو کون ہوتا ہے اولاد کو روکنے والا، جاؤ ورنہ تمہارا سب کچھ چھین لیا جائے گا، اب جناب وہ معذرت پر اتر آیا بجائے اس کے کہ وہ کچھ اور کہتا، کہنے لگا کہ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کے صاحبزادے ہیں، کیسے نہیں معلوم تھا۔

چنانچہ شادی ہوئی، ان کا ایک لڑکا ابھی تک زندہ ہے، ایک کا انتقال ہوگیا، انتقال کیا وہ تو شہید ہوگیا تھا، دوسرے جن کا نام شفیق احمد خان ہے، اسلام آباد میں ٹی اینڈ ٹی میں ملازم ہے۔

اس واقعہ سے بھی اباجی رحمہ اللہ کے صاحبِ تکوین بزرگ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایسے ہی نارنول میں ایک بزرگ تھے مولانا ممتاز علی خان صاحب بڑے مجاہد آدمی تھے، اچھے بزرگوں میں سے تھے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے وہ بیعت تھے، اور وہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے چلہ اور مجاہدہ وریاضت کے لئے جنگل میں بھیجا تھا، وہاں میں کچھ عرصہ رہا، تقریباً چھ ماہ، اباجی رحمہ اللہ سے ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور مولانا ممتاز علی خان صاحب ہی کی وجہ سے ہمارے قصبہ میں دیوبندی علماء کی آمدورفت اور عقائد کا زوروشور ہوا، اور دراصل بدعقائد پر تنکیر ابتداءً مولانا ممتاز علی خان صاحب نے شروع کی تھی، اور وہ بڑے شمشیر برہنہ تھے، ببانگِ دہل ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے، اور ان کے شانہ بشانہ اباجی رحمہ اللہ ہوتے تھے، ان کی صحبت میں اور تو کوئی ہوتا نہیں تھا، اباجی رحمہ اللہ ان کو اچھے بزرگوں میں سے بیان فرماتے تھے۔ مولانا کی ایک عام کرامت جو ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ ہمارے یہاں وعظ یا تقریر میں گیس کے ھنڈے روشنی کے لئے جلایا کرتے تھے اور اس سے روشنی حاصل کرتے تھے، بجلی تو وہاں تھی نہیں، گیس کا ھنڈا جل رہا تھا، اور مولانا وعظ فرما رہے تھے، اس میں انہوں نے ضمناً بات کہی کہ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر کسی چیز کی طرف اشارہ کرکے یہ کہیں کہ شق ہوجا تو خدا کی قسم وہ شق ہوجاتی ہے، اور وہ ھنڈا گیس کا تڑاق تڑاق کرکے دو ٹکڑے ہوگیا اور پھٹ گیا، یہ ان کی کرامت مشہور تھی، اشارہ اس وقت اتفاقاً اُس ہنڈے کی طرف تھا۔

ابا جی رحمہ اللہ کے وہ بہت اچھے دوستوں میں سے تھے، جب ان کا انتقال ہوا، ابا جی رحمہ اللہ ان کے انتقال کی وجہ سے کافی دنوں تک مغموم سے رہے، کہ ایک ہی آدمی تھا اس سے تقویت تھی، سہارا تھا، ایک دن ابا جی رحمہ اللہ فرمانے لگے کہ ایک دن مولوی ممتاز علی صاحب میرے پاس آئے تھے، میں نے کہا کیسے! ہاں آئے تھے، وہ مجھ سے فرما گئے ہیں کہ صوبیدار صاحب آپ کو کیا پریشان ہونے کی ضرورت ہے، میں تو آپ کے ساتھ رہتا ہوں، مولانا ممتاز علی خان نارنول میں رہتے تھے، ابا جی رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ جب پینشن لینے ریواڑی جاتے تو واپسی پر ان کے انتقال کے بعد ان کے گھر جاتے تھے اور ان کی اہلیہ اور بچوں کی مدد کرتے تھے، ایک دفعہ فرمایا کہ میں اناج منڈی سے ان کے گھر کی طرف کو جارہا تھا تو وہ سامنے سے آئے اور سلام کر کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے رہے اور کچھ باتیں کرتے رہے، جب ان کا مکان نزدیک آیا تو وہ اچانک غائب ہوگئے پھر مجھے خیال آیا کہ اوہو اُن کا تو انتقال ہو چکا ہے؛ یہ اُن کی کرامت تھی، اور کرامت کے بارے میں بزرگوں نے لکھا ہے کہ موت کے بعد بھی ظاہر ہوسکتی ہے۔

ہمارے ابا جی رحمہ اللہ کی ایک خصوصی بات یہ تھی کہ زندگی میں تین کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہیں، فتوحُ الشام، فتوحُ العرب اور فتوحُ المصر ، اس کے علاوہ کوئی کتاب وہ نہیں پڑھتے تھے، جب کبھی ان کو تھوڑا سا وقت ملتا تھا انہیں کتابوں میں سے کسی کو دیکھا اور جب نیند آنے لگی سو گئے، فتوحُ الشام اور فتوحُ المصر کے تو وہ حافظ تھے، بڑے بڑے علماء ابا جی رحمہ اللہ کو جانتے تھے، وہ واقعات بیان کرتے ہوئے ابا جی رحمہ اللہ سے پوچھتے تھے، کہ صوبیدار صاحب یہ واقعہ کیسے ہوا وہ بتادیتے کہ ایسے ہوا۔

پھر اس کے بعد ایک مرتبہ ابا جی رحمہ اللہ نے فرمایا آج کل کچھ اور معاملہ چل رہا ہے یہاں ایسا مقام ہے کہ میں اب اپنے لب بھی نہیں ہلا سکتا، معلوم نہیں وہ کیا مقام تھا۔

پھر حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بیعت کے بعد ایک دفعہ میں نے ابا جی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ابا جی آج کل کیا ہو رہا ہے؟ تو انہوں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور فرمایا کہ اب ہمیں زبان ہلانے کی اجازت نہیں، اس لئے اب ہم تمہیں کچھ نہیں بتا سکتے، اس کے بعد انہوں نے کچھ بات نہیں بتائی۔

اور جس وقت ۴۷ء میں فسادات ہونے لگے اور ان سے باقاعدہ کہا گیا کہ یہاں سے نکل چلئے، یہ ایسے حالات ہورہے ہیں، یہ ہورہا ہے، وہ ہورہا ہے، والد صاحب رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا کہ میں اور میرے بچے یہیں شہید ہونگے، اور اباجی رحمہ اللہ نے یہی فرمایا، حالانکہ وہ سارے ذرائع موجود تھے اور وہ وہاں سے منتقل ہوسکتے تھے، اور سب آسانی سے منتقل ہوجاتے، لیکن انہوں نے یہی فرمایا کہ یہیں شہید ہونگے، چنانچہ وہیں شہید ہوگئے، اور میں دہلی میں تھا، دہلی سے ان سے ملنے گیا ہوں ان کی شہادت سے کچھ دن پہلے، اباجی رحمہ اللہ سے بھی اور والد صاحب سے بھی عرض کیا کہ میں نے دہلی میں ایک مکان لے لیا ہے کم از کم کچھ دنوں کے لئے وہاں آجائیں۔

اباجی رحمہ اللہ کے بارے میں ان کے ہم عصر لوگوں سے ان سے بڑی عمر کے لوگوں سے بارہا میری گفتگو ہوئی، ان کے لنگوٹیا یاروں نے اور ان کے ہم عمر بزرگوں نے متفقہ طور پر یہ بات بیان کی کہ ہم نے بچپن سے تمہارے دادا کو نہایت صالح، عبادت گذار اور متقی پایا، اور جس کو پیدائشی ولی کہتے ہیں وہ تمہارے دادا تھے، ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو بچپن کے لنگوٹیے ہوتے ہیں ان کو ہر اچھی بری بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اباجی رحمہ اللہ ایک ایسے تھے کہ جن کے کردار پر کسی لنگوٹیے نے انگلی نہیں رکھی، وہ سب ان کے بے حد معتقد تھے بہت احترام کرتے تھے، اور سب ان سے ڈرتے تھے، اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ بچپن سے منجانب اللہ وہبی ولی تھے۔

اباجی رحمہ اللہ کا حضرت تھانوی سے بیعت ہونا

اباجی رحمہ اللہ جب حج سے واپس تشریف لائے، تو اس وقت انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا کہ حج کے سفر میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری نے مجھے بیعت کرلیا، میں نے کہا یہ تو روحانی بیعت ہے، فرمایا ہاں ٹھیک ہے، اب جب بیعت کی ضرورت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔

اباجی رحمہ اللہ نے اپنی شہادت سے تقریباً ۴ سال پہلے فرمایا کہ میں اب بیعت ہونا چاہتا ہوں، میں نے کہا کس سے اور کہاں ہونا چاہتے ہو؟ فرمایا اب تو میں مولانا اشرف علی صاحب سے ہی ہونگا، میں نے کہا بسم اللہ کیجئے، فرمایا وہ تو بہت قانونی آدمی ہیں، پہلے ان کا قانون دیکھ لوں، ان

کا کیا طریقہ ہے؟ میں نے کہا ان کے قانون کا تو ہمیں سب پتہ چل گیا ہے، میں چند دنوں میں آپ کو بیعت کرادوں گا، فرمایا ہاں بس کرادو، میں نے پوچھا آپ کس کو اپنا مصلح تجویز فرمائینگے، پوچھا تمہارا مصلح کون ہے، میں نے کہا مولانا مسیح اللہ صاحب رحمہ اللہ، فرمایا بس میرے بھی وہی مصلح ہیں ان کا ہی نام لکھ دو، چنانچہ خط میں یہ تحریر کیا حضرت کی طرف کہ میں نے اپنا مصلح مولانا مسیح اللہ خان صاحب کو تجویز کرلیا ہے، آپ سے بیعت کی درخواست ہے براہِ کرم بیعت فرما کر ممنون فرمائیں، حضرت نے جواب میں فرمایا میں نے بیعت کیا، آپ کو مبارک ہو، غالبًا حضرت نے دوسرے خط میں بیعت فرمالیا تھا۔

ابا جی رحمہ اللہ کی حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضری

ابا جی رحمہ اللہ نے خط وکتابت سے بیعت ہونے کے بعد اجازت مانگی کہ میں آپ سے ملنے کے لئے آنا چاہتا ہوں، فرمایا آجایئے، اجازت مل گئی، وہ اجازت کا خط لے کر چلے، میں اس وقت جلال آباد میں تھانہ بھون سے دومیل کے فاصلہ پر حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے یہاں رہتا تھا، جلال آباد میں سیدھے میرے پاس ہی آئے، اور ان کے فوج کے ساتھی بھی قریب میں رہتے تھے، لوہاری میں جہاں کے مولانا سلیم اللہ خان صاحب ہیں، صوبیدار فقیر محمد خان ایک اور تھے، دونوں ابا جی رحمہ اللہ کے رسالے کے ساتھی تھے، مجھے بھی ابا جی رحمہ اللہ نے بتادیا تھا، کہ ان سے جا کر مل لینا، وہ کبھی کبھی میرے پاس آیا بھی کرتے تھے، اور آم کے موسم میں آم بھی بھجوایا کرتے تھے۔

بہرحال ابا جی رحمہ اللہ تشریف لے آئے، اور میں حضرت رحمہ اللہ کی مجلس میں لے کر چلا، اس وقت پیدل جانا ہوتا تھا، میں نے راستہ بھر سارے قواعد وضوابط بتائے، ایسے جانا ہے، ایسے سلام کرنا ہے، ایسے پھر بیٹھنا ہے، اور مصافحہ کرکے اپنا پرچہ دے دینا، کہ آپ کا اجازت نامہ میرے پاس ہے، آپ کی اجازت سے آیا ہوں، اور یہ میں نے بڑی تاکید سے کہا کہ آپ کھڑے مت رہنا، وہاں جا کر سلام کرکے بیٹھ جانا، حضرت ان چیزوں سے بڑے ناراض ہوتے ہیں، فرمایا ہاں

بھئی میں سب سمجھ گیا ہوں، بار بار کہنے کی ضرورت نہیں، اور میں نے یہ بھی کہا کہ ملاقات اور گفتگو کے اختتام پر اس جگہ سے اٹھ کر جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا۔

سب کچھ طے ہو گیا، لیکن اب جیسے ہی ابا جی رحمہ اللہ مجلس میں داخل ہوئے، ان کی آواز تو بہت بلند اور گرجدار تھی، فوجی آدمی تھے، تو انہوں نے بڑے دبنگ طریقے سے سلام کیا، حضرت نے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور وعلیکم السلام جواب دیا، وہ سارا پرچہ ورچہ ہاتھ میں تھا، وہاں جا کر بجائے اس کے کہ بیٹھ جائیں کھڑے ہو گئے، مجھے تو پسینہ آنا شروع ہو گیا، میں نے دل میں خیال کیا کہ اب جھگڑا شروع ہو گا، حضرت فرمائیں گے کھڑے کیوں ہو؟ کچھ دیر کے بعد حضرت نے نگاہ اٹھائی اور اوپر دیکھا اور فرمانے لگے کہ آپ بیٹھ جایئے، ابا جی رحمہ اللہ نے یہ سن لیا اور اس کے بعد بھی نہیں بیٹھے، میں بڑا پریشان، لو بھئی ایک دفعہ حضرت فرما بھی چکے ہیں، اب میرے دل میں یہ آیا کہ جا کر ابا جی رحمہ اللہ کو زبردستی بٹھا دوں، لیکن میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا، ویسے بھی خانقاہ میں دوسرے کے معاملہ میں کوئی دخل در معقول کر ہی نہیں سکتا تھا، یہ بھی وہاں کے قواعد وضوابط میں شامل تھا، اب میں کیا کرتا، مجھے پسینے آرہے تھے اور بے حد پریشانی کے عالم میں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

مجلس میں حضرت کا معمول تھا کہ خطوط کے جواب لکھتے رہتے تھے، اور ملنے والوں سے برابر گفتگو بھی ہوتی رہتی تھی۔

حضرت رحمہ اللہ لکھ رہے تھے پھر کچھ دیر کے بعد اچھا وقفہ گذر گیا تھا، نگاہ اٹھائی، دیکھا اور فرمایا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ بیٹھ جایئے، لیکن اب بھی جناب عالی نہیں بیٹھے اور نہ ہی جواب دیا، اب مجھے اور بھی زیادہ پریشانی ہوئی، کہ کچھ معاملہ گڑبڑ ہو گا، یا ہونے والا ہے۔

نتیجہ یہ کہ حضرت نے تیسری مرتبہ اپنا تھوڑا سا لہجہ بدلا، اور یہ فرمایا کہ آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟ اس وقت ابا جی رحمہ اللہ نے یہ عرض کیا کہ حضرت میں بیٹھ رہا ہوں مگر بیٹھے پھر بھی نہیں، میں نے کہا عجیب مصیبت ہے، تین دفعہ بات ہو چکی ہے اور اب یہ بھی کہہ دیا کہ میں بیٹھ رہا ہوں پھر اب کیا مصیبت ہے بیٹھ کیوں نہیں رہے، خیر کچھ دیر بعد بیٹھ گئے لیکن بیٹھنے میں یہ طرز اختیار کیا کہ اپنا زانو حضرت کے زانو کے بالکل قریب ملا لیا اور بیٹھ گئے، وہاں کے قواعد میں ایک تو یہ بات تھی

کہ فوراً بیٹھ جاؤ، دوسرے یہ بھی کہ اپنی بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ جاؤ، اور جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جاؤ، حضرت والا کی جہاں مجلس ہوتی تھی وہ مسجد سے ملحق ایک سہ دری تھی جسمیں حضرت والا رحمہ اللہ غربی حصے کی طرف تشریف فرما ہوتے تھے۔

چونکہ وہ سہ دری اتنی تنگ تھی کہ دو طرف آدمی بیٹھنے کے بعد بیچ میں راستہ جو حضرت تک جاتا تھا، وہ تنگ ہو جاتا تھا، اگر وہاں کوئی بیٹھ جائے تو پھر حضرت تک کوئی پہنچ نہیں سکتا تھا، بڑی مشکل سے مصافحہ یا گفتگو ہو سکتی تھی، اب بجائے اس کے کہ حضرت ان سے کوئی مؤاخذہ کی بات کرتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ آپ بڑے لوگ ہیں آپ کی بڑی باتیں ہیں، کہاں سے آپ تشریف لائے ہیں، جواب میں کہا کہ مہندر گڑھ سے آیا ہوں، اور آپ کی اجازت سے آیا ہوں، حضرت نے استفسار فرمایا کہ میری اجازت آپ کے پاس ہے؟ جی ہاں، اچھا، کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے اور کتنے دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟ عرض کیا میرا لڑکا جلال آباد میں مولانا مسیح اللہ صاحب کے مدرسہ میں پڑھتا ہے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے میں وہاں ٹھہرا ہوا ہوں، اور وہیں سے آپ کے پاس آتا جاتا رہوں گا، فرمایا ٹھیک ہے، اب یہ کہ ابا جی رحمہ اللہ اخیر مجلس تک اسی ھیئت سے وہیں بیٹھے رہے، وہاں سے اٹھ کر پیچھے نہیں آئے، اور دوسرے لوگ حضرت سے ملنے آ رہے ہیں وہ اُدھر سے ہاتھ بڑھا کر مل رہے ہیں، کوئی کچھ کر رہا ہے اور کوئی کچھ کر رہا ہے، نہ حضرت ان کو اٹھا رہے ہیں اور نہ وہ اٹھ رہے ہیں، ورنہ وہاں حضرت کسی کو ایک سیکنڈ نہیں بیٹھنے دیتے تھے اور فرماتے تھے، یہاں کیوں بیٹھے ہو اٹھو، غرض اسی طرح ابا جی رحمہ اللہ اخیر مجلس تک بیٹھے رہے۔

جب مجلس ختم ہوگئی واپسی پر میں نے راستہ میں پوچھا کہ ابا جی کیا قصہ تھا؟ میرے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا، فرمایا ارے بیٹا یہ بات تمہارے سمجھنے کی نہیں، میں نے کہا پھر بھی کیا بات تھی، فرمایا کہہ دیا کہ تمہارے سمجھ میں نہیں آئے گی، میں خاموش ہو گیا۔

پھر ایک دفعہ میں ابا جی رحمہ اللہ کے پیر دبا رہا تھا اس وقت وہ کچھ زیادہ خوش تھے، ویسے بھی وہ مجھ سے بہت خوش رہتے تھے، اور انہیں مجھ سے بہت محبت تھی، میں نے کہا ابا جی ایک بات پوچھنا چاہ

رہا ہوں کیا آپ بتائیں گے؟ فرمایا ہاں بتادونگا، میں نے دوبارہ کہا، بتائیں گے بھی آپ؟ فرمایا ہاں بتاؤنگا، میں نے جب ان سے وعدہ لے لیا، تو میں نے کہا، وہ کیا بات تھی، جب آپ حضرت کے پاس مجلس میں گئے تھے، اور کافی دیر کھڑے رہے، فرمایا اوہو، بات تو تمہاری سمجھ میں آئے گی نہیں لیکن میں بتادیتا ہوں، میں جس وقت مجلس میں داخل ہوا، تو میں روحانی مقام کے اعتبار سے بہت عروج پر تھا، اور حضرت بہت نزول کئے ہوئے بیٹھے تھے، تو وہاں سے مجھے نیچے آنے میں وقت لگا، اور میں اس انتظار میں تھا کہ میں اس درجہ تک نزول کرلوں، جو حضرت کا درجہ ہے بلکہ اس سے بھی نیچے ہوجاؤں، تب بیٹھوں، تو میں نے کوشش شروع کی، اس دوران حضرت نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ کہہ دیا کہ آپ بیٹھ جایئے، تو میں اس کوشش میں لگا ہوا تھا، اسی دوران پھر دوسری مرتبہ حضرت نے کہا، اس وقت بھی میں نے دیکھا کہ میں عروج پر ہوں اور نزول پر نہیں آیا، اب میں مزید کوشش کرنے لگا، تیسری مرتبہ جب حضرت نے اپنا لہجہ بدلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے جھٹکا دیا، میں نے اس وقت دیکھا تو میں حضرت کی سطح کے تقریباً برابر تھا، اس سے نیچے ہوکر پھر میں بیٹھ گیا، میں نے کہا کہ اچھا یہ قصہ تھا، تو یہ حقیقت ہے کہ یہ بات ہمارے سمجھ میں آنے کی نہیں، انہیں حضرات کی باتیں ہیں، کہ نہ معلوم تکوینی طور پر اس وقت اباجی کس عروج کے مقام پر ہوں گے؟

(تکوینی وتشریعی شعبے الگ الگ ہیں، لہٰذا اس سے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے مقام ومرتبہ کا کم ہونا نہ سمجھا جائے)

پھر میں نے کہا کہ اچھا یہ بات تو سمجھ آگئی لیکن آپ اپنی جگہ سے کیوں نہیں اٹھے، بعد میں آنے والے حضرات بڑی مشکل سے حضرت والا سے ملاقات اور مصافحہ کررہے تھے، فرمایا کہ مجھے حضرت والا نے یہ فرمایا کہ اب یہاں سے مت اٹھنا، میں نے عرض کیا ایسی کوئی بات تو میں نے نہیں سنی، فرمایا ہاں ایسی بات تو نہیں سنی گئی لیکن ہماری ایک اور زبان ہوتی ہے جس میں آواز کے بغیر بات ہوجاتی ہے۔

اب اس سے اندازہ لگایئے کہ ان کا کیا مقام تھا جن کے ساتھ حضرت والا رحمہ اللہ کا یہ معاملہ ہو۔

جب اخیر عمر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے اور وہاں سے یہ سوال آیا کہ آپ کے معمولات کیا ہیں میں اپنے قلم سے خود اباجی رحمہ اللہ کے خطوط لکھتا تھا میں نے سارے معمولات

لکھ دیئے ،حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے وہاں سے دوازدہ تسبیح کے معمولات بھیج دیئے کہ آپ یہ اختیار کریں ،اباجی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ جاری معمولات تو میں چھوڑونگا نہیں اس لئے کہ یہ تو حضور ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں ہاں ان کا اضافہ اس کے ساتھ مزید کرلوں گا،اور کچھ دنوں بعد حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو ایک خط میں یہ لکھوا کر بھیجا کہ الحمدللہ اپنے معمولات کے ساتھ آپ کے وظائف بھی باقاعدگی سے ہورہے ہیں اس میں کوئی تعب یا پریشانی نہیں، دوازدہ تسبیح میں نفی واثبات، اثبات یہ پہلے سے تھا،البتہ اسمِ ذات کے ذکر میں اباجی رحمہ اللہ حق اللہ کا ذکر کرتے تھے جو اباجی رحمہ اللہ کی اتباع میں احقر نے بھی اپنے حلقے میں رائج کردیا۔

میں نے حضرت مسیح الامت کی خدمت میں اباجی کی طرف سے لکھا اوراس میں ان کی یہ کیفیت لکھی تھی کہ میں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسی پہاڑی کے دامن سے گذررہا ہوں کہ جہاں بہت سارے آدمی ہیں اور میں اس پہاڑی پر چڑھ رہا ہوں کچھ آدمی مجھے راستے میں بھی نظر آتے رہے یہاں تک کہ میں اس پہاڑی کے اوپر تک پہنچ گیا،اور میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر دیکھا سوائے لق ودق میدان کے کچھ دکھائی نہ دیا اور ہو کے عالم میں اس میں میں کھڑا ہوں،تو حضرت نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ الحمدللہ آپ اس وقت روحانیت کے اعلیٰ مقام پر ہیں۔اباجی رحمہ اللہ کی موجودگی اوران کی صحبت میں مجھے اس طرح کا احساس ہوتا تھا کہ گویا میں ایک صحابی کی موجودگی میں ہوں اوران کی میں نے معیت اختیار کی ہوئی ہے،یہ وہ احساس ہے جو عام طور پر میرے دماغ میں تھا،اسی بچپن کا اثر سمجھ لیجئے یا اباجی رحمہ اللہ کی دعاؤں کی برکات کہ اکثر وبیشتر حضور ﷺ اورصحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں جب میں کوئی چیز پڑھتا ہوں چاہے وہ تلاوت میں ہو یا احادیث میں ہو میرے دماغ میں یہ ہوتا ہے کہ میں وہاں بیٹھا ہوا ہوں اور وہاں موجود ہوں یہ گویا میرے دماغ میں ہمیشہ سے ہے ،بہت کم ایسا ہوا کہ میں صرف قاری کی حیثیت سے یا سامع کی حیثیت سے سنوں یا پڑھوں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ گویا کہ یہ باتیں میرے سامنے ہورہی ہیں میرے خیال میں اس طرح کی کیفیت رہتی ہے۔یہ اباجی رحمہ اللہ کی مجھ پر توجہ کا اثر یا تصرف تھا اوراللہ تعالیٰ کی عطا تھی۔بندہ نے یہ صرف چند واقعات عرض کیے ہیں ورنہ ان کے اور بھی بے شمار واقعات ہیں

فراغت کے بعد دھلی میں قیام اوراس عرصہ کی داستان

بندہ کا فراغت کے بعد پاکستان میں ہجرت تک دھلی میں قیام رہا، والد صاحب چونکہ دنیوی مال ومرتبہ سے مالا مال تھےاوراس معاملے میں وہ کچھ سخت گیر بھی تھے،لہٰذا ان کی خواہش پر دہلی میں ہمدرد دواخانہ میں ملازمت اختیار کی اور منیجر کے منصب پر ایک عرصہ وہاں کام کیا، پھر وہاں سے شریفی دواخانہ آیا جو اس زمانہ کا ایک ممتاز اور بڑا دیسی دواساز ادارہ تھا اس کے بھی اہم ذمہ دارانہ عہدے پر مامور رہا، اس کے بعد جنگ اخبار سے وابستہ ہوا، اس دوران تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا، اورفسادات ٹوٹ پڑے اور بندہ کی پاکستان عجیب غریب انداز میں ہجرت ہوئی، جس کی ایک لمبی داستان ہے۔

جب پاکستان بننے کی تحریک چل رہی تھی ،تو راقم دہلی میں رہ رہا تھا ،اس زمانے میں کچھ تکوینی حضرات تھے، جن سے اس فقیر کا بھی ملنا جلنا تھا، جن کی باتوں سے پاکستان کے تکوینی طور پر وجود میں آنے کا اشارہ ملتا تھا۔

دہلی میں ایک بزرگ تھے جو جنگل سے لکڑی لاتے تھے ایک گٹھا بیچنے کے لئے اور کچھ لکڑیاں اپنے لئے رکھتے تھے ۔عجیب بزرگ تھے مجھے ان کا نام معلوم نہیں، صائم الدھر تھے ۔لکڑیاں بیچ کر سیدھے ایک دوکان پر جاکر گندم خریدتے تھے اور جامع مسجد دہلی میں حافظ جی نام کے ایک اور بزرگ کے قریب میں ایک سیڑھی پر وہ لکڑیاں جلاتے تھے اور سیڑھی کا ایک حصہ پانی سے دھوکر اس پر وہ گندم ایک پتھر سے کوٹتے تھے، پھر ان کو پیس کر ایک پیڑا بناتے تھے ،اس میں کچھ نمک بھی ملاتے تھے ،جب وہ پیڑا تیار ہوجاتا تو وہ لکڑیاں جو جل رہی ہوتی ان کو ہٹا کر اس پر روٹی بنا کر ڈالتے اور پتھر پر سینکنے کے بعد باقی کوئلوں پر یا انگاروں پر سینکتے تھے،اور چٹنی رگڑ کر اس سے وہ روزہ افطار کرتے تھے۔ یہ نہیں معلوم سحری میں کچھ کھاتے تھے یا نہیں ،عجیب بزرگ تھے نہ تو ان کا گھر تھا نہ کوئی ٹھکانہ ’’دست خود دہان خود‘‘ والا معاملہ تھا،صاحبِ خدمت تھے، مگر معلوم نہیں کیا کرتے تھے،کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے نہ ہی کسی سے بات کرتے تھے۔

ایک بزرگ جو مرزا جی کے نام سے مشہور تھے، اور یہ دہلی میں مٹیا محل کے علاقہ میں رہتے تھے ،نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے،عصر کی نماز کے بعد یہ جامع مسجد دہلی کے مشرقی حصے پر حوض کے ایک کونے پر بیٹھتے تھے،ان کے برابر میں دوسرے بزرگ پیر جھولا صاحب بیٹھتے تھے اور کچھ لوگ نیچے فرش پر بیٹھتے تھے،مرزا جی بڑے سخت مزاج تھے، بڑی سختی سے گفتگو کرتے تھے، کافی لوگ ان سے ملنے آتے تھے،سلام کر کے بیٹھ جاتے تھے، بہت کم گفتگو ہوتی تھی، کبھی کبھی مرزا جی کچھ نصیحت فرماتے تھے یہ دراصل ایک تکوینی بزرگ تھے، ہمارے ابّا جی رحمہ اللہ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا تھا کہ جب کبھی دہلی جاؤ تو مرزا جی سے ضرور مل لیا کرو، پھر ایک مرتبہ جب ہمارے نصیر چچا جنگ پر جانے لگے،تو ابّا جی رحمہ اللہ نے ان کو ہدایت کی کہ دہلی جا کر مرزا جی سے ملنا اور ان سے دعا کرانا۔یہ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے (میرے دو چچا، بڑے جن کو ہم غصیلی (بہت غصہ والے) چچا کہتے تھے،جن کا نام رفیق احمد خان تھا اور نصیر احمد خان جو سب سے چھوٹے چچا شبیر احمد خان مرحوم سے بڑے ہیں، یہ میرے دونوں چچا سیکنڈ رائل لانسرز میں ملازم تھے، یہ ایک فوجی رسالہ تھا، **1940**ء میں جب یہ رسالہ ہندوستان سے باہر جنگ میں شرکت کے لئے روانہ ہوا تو اس وقت ابّا جی رحمہ اللہ نے نصیر چچا سے فرمایا، بھئی دہلی میں مرزا جی سے مل کر اُن سے دعا کرا لینا ،تیسرے چچا رسالدار صغیر احمد خان تھے جو فرسٹ اسکنر زہارس میں تھے جنگ پر گئے، چنانچہ وہ دہلی پہنچ کر اُن سے ملنے گئے، جب ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے بڑی سختی سے پوچھا کون ہو۔کیا بات ہے؟اس موقع پر پیر جھولا صاحب بولے!اجی یہ صوبیدار صاحب دوست محمد خان کے صاحبزادے ہیں آپ سے ملنے آئے ہیں، یہ پیر جھولا صاحب بڑے صاحبِ کشف بزرگ تھے۔بغیر کچھ تعارف کے ہمارے خاندان کو جانتے تھے، جب کبھی کوئی جاتا یہ فوراً بول پڑتے کہ یہ صوبیدار دوست محمد خان کے صاحبزادے ہیں۔

پیر جھولا کو رعشہ کی بیماری تھی اور بیٹھے ہوئے سامنے کی طرف ہلتے رہتے تھے، جیسے کوئی جھول رہا ہو اسی نسبت سے ان کا نام پیر جھولا پڑ گیا تھا، یہ بھی مٹیا محل میں رہتے تھے اور سفر بھی کیا کرتے تھے ،میری ملاقات ان سے جلال آباد ضلع مظفر نگر میں جب کہ میں مدرسہ مفتاح العلوم میں پڑھتا تھا

رئیس اسماعیل خان صاحب مرحوم کے مکان پر ہوئی تھی، یہ ان کے مردانہ مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے، یہ رئیس اسماعیل خان صاحب، مرحوم بڑے خوش مزاج، مہمان نواز تھے، ان کی مردانہ بیٹھک میں لوگ جمع رہتے تھے اور ان کی گفتگو سُنتے تھے، ان کا بلا کا حافظہ تھا، بڑے شاعروں کے کلام اور عبارتیں بھی ان کو یاد تھیں، بڑے لطیفہ گو اور علمِ مجلسی کے ماہر تھے، میں بھی ان کی خدمت میں جا کر بیٹھتا تھا، یہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت تھے، لوگوں کو ہنساتے تھے اور لوگوں کی خدمت بھی کرتے تھے، بہر حال پیر جھولا صاحب سے وہاں بھی ملاقات ہوئی اور کافی باتیں بھی ہوئیں۔

مرزا جی رحمہ اللہ نے نصیر چچا صاحب سے فرمایا ''دیکھو جب تک موت نہیں آتی چاہے گولیاں چلتی رہیں چاہے گولے برستے رہیں کچھ نہیں ہوگا، اور جب موت آئے گی تو اس کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، تم جنگ پر جاؤ اور یہ بات یاد رکھو''

نصیر چچا نے اپنے دل میں سوچا، سبحان اللہ! یہ باتیں تو میں پہلے سے جانتا ہوں، یہ کیا دعا ہوئی؟ چنانچہ وہ ملاقات کے بعد واپس ہو گئے۔

دہلی میں ایک بزرگ جو بہت بڑے مجذوب اور حافظ جی کے نام سے مشہور تھے، یہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں میں پڑے رہتے تھے، اور تقریباً برہنہ رہتے تھے اور راکھ کے بھرے ہوئے کنستر اور ٹین کے ڈبے ان کے پاس رکھے ہوئے ہوتے تھے اور یہ راکھ اپنے اوپر ڈالتے رہتے تھے، دو کہار ڈولی لئے ان کے پاس موجود رہتے تھے، یہ کہار صبح سے مغرب تک ان کے پاس ہوتے تھے، پھر مغرب سے فجر تک دوسرے دو کہار ڈولی کے ساتھ ان کے پاس موجود رہتے تھے، یہ خود چل بھی نہیں سکتے تھے، بس جب کبھی یہ فرماتے چلو! چلو! تو کہار ان کو اٹھا کر ڈولی میں بٹھا لیتے تھے اور جدھر یہ اشارہ کرتے رہتے وہ چلتے رہتے تھے، یہ دہلی میں بہت مشہور تھے، دہلی کے پنجابی سوداگر جو صدر بازار میں تھوک کا کاروبار کرتے تھے۔ وہ سارے ان کے بڑے معتقد تھے، یوں تو ساری دلّی ان کو جانتی تھی، حتیٰ کہ وائسرائے بھی جو کہ انگریز تھا وہ بھی ان کی بڑی عزت کرتا تھا، ان سے ملاقات کے لئے یہ بھی جاتے اور وہ بھی ملنے آتا تھا، وائسرائے کا ان کے لئے یہ آرڈر تھا کہ جہاں بھی وہ جانا چاہیں، ان کو کسی جگہ جانے سے روکا نہ جائے، وہ کبھی سرکاری خزانہ کھلواتے تھے اور

روپوں کے توڑے، اشرفیوں کی تھیلیاں نکلواتے اوران پر ہاتھ پھیرتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ سپاہی کی تنخواہ دو روپے ہوتی تھی، جو کہار اِن کی خدمت کرتے تھے اُن کی مزدوری یہ تھی کہ گھومتے گھماتے جب وہ صدر بازار کا رُخ کرتے، تو کسی پنجابی سوداگر کی دوکان کے سامنے فرماتے میری ڈولی یہاں رکھ دو، بس وہ سوداگر سمجھتا تھا میری عید ہوگئی، حافظ جی میری دوکان کے سامنے رک گئے، یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ حافظ جی کیا کچھ کھاتے پیتے تھے اور وہ لوگ ان کی کیا خدمت کرتے تھے، البتہ یہ سوداگر کہاروں کو دس دس پندرہ پندرہ روپے دے دیتے تھے اور یہی ان کی آمدنی تھی اس وجہ سے وہ رات دن حافظ جی کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ مجاذیب بڑی بڑی ڈیوٹیاں دیتے ہیں، لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کی اتنی بڑی ڈیوٹی بھی ہوتی ہے۔ جس میں ہندوستان بھر کا نظام بھی شامل ہے۔

بھیّا جی (والد صاحب) رحمہ اللہ دہلی تشریف لائے ہوئے تھے، میں ان کی معیت میں عصر کی نماز کے لئے دہلی کی جامع مسجد گیا، نماز سے فراغت کے بعد فرمانے لگے، چلو مرزا جی سے مل لیتے ہیں، یہ فرما کر وہ ان کی طرف چل پڑے، مرزا جی کے پاس بھیّا جی رحمہ اللہ پہنچے سلام کیا اور کچھ تیز قسم کی گفتگو تھوڑی دیر ہوئی جو مجھے یاد نہیں، پھر بھیّا جی رحمہ اللہ ان کے پاس بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد بھیّا جی رحمہ اللہ نے اِن سے یہ سوال کیا، مرزا جی یہ انگریز کب جائیں گے؟ مرزا جی نے گھور کر بھیّا جی رحمہ اللہ کو دیکھا اور کہنے لگے، ابھی نہیں جائیں گے، بھیّا جی رحمہ اللہ نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے ''حافظ جی نہیں مانتے'' یہ وہی حافظ جی مجذوب جو جامع مسجد کی سیڑھیوں میں برہنہ پڑے رہتے تھے۔ [۱]

بات ختم ہوگئی بعد میں نمازِ مغرب ادا کر کے ہم واپس آ گئے اور بھیّا جی رحمہ اللہ انصاری صاحب کے ہاں چلے گئے۔

---

[۱] حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ ایک مجذوب بزرگ جن کا نام اشراقی صاحب تھا، ان کے بارے میں فرماتے ہیں: وہ (اشراقی صاحب) فرماتے تھے، مجذوبوں میں اس میں اختلاف ہے کہ انگریزی سلطنت باقی رہے یا اس کو بدل دیا جائے (الافاضات الیومیہ، جلد ا صفحہ ۹۵، ملفوظ نمبر ۱۰۶)
اس سے بھی مندرجہ بالا واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔

غالباً **1946**ء کا آخر تھا، کہ اچانک خبر مشہور ہوگئی کہ حافظ جی کا انتقال ہوگیا، بڑی شہرت تھی ان کی، ان کے نماز جنازہ میں ہزاروں آدمی شریک ہوئے اور تدفین ہوگئی، اس کے کچھ دنوں بعد میں اکیلا ہی مرزا جی کی خدمت میں گیا، تھوڑی دیر بیٹھا، ویسے کبھی کبھار میں ان کی خدمت میں جاتا رہتا تھا، میں نے مرزا جی سے عرض کیا مرزا جی حافظ جی کا تو انتقال ہوگیا، فرمانے لگے ہاں کیوں؟ میں نے عرض کیا اب انگریز کب جائیں گے؟ انہوں نے ایک سخت نظر کے ساتھ مجھے دیکھا، پھر اپنے برابر میں دیکھا جہاں پیر جھولا صاحب رحمہ اللہ بیٹھے ہوئے جھول رہے تھے، مجھے مخاطب ہوکر فرمایا ،نہیں ابھی نہیں جائیں گے، انہوں نے پیر جھولا صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''یہ بھی نہیں مانتے'' مجھے بڑا تعجب ہوا، چونکہ میں پیر جھولا صاحب سے پہلے سے بھی واقف تھا، جلال آباد میں تعلیم کے زمانے میں یہ کبھی کبھار جلال آباد بھی آتے تھے اور وہاں کے رئیس اسماعیل خان صاحب مرحوم کے ہاں قیام فرماتے تھے، میں کبھی کبھی ان سے مذاق بھی کر لیتا تھا، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ پیر جھولا صاحب رحمہ اللہ تو بڑی ہستی ہیں، ہندوستان کی حکومت ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں، اس کے بعد سے میں ان کا بہت ادب کیا کرتا تھا۔

یہ غالباً ماہ فروری **1947**ء کا واقعہ ہے کہ پیر جھولا صاحب نمازِ عصر جامع مسجد میں ادا کر کے واپس مٹیا محل جا رہے تھے، جیسے ہی جامع مسجد کی سیڑھیاں اترنے لگے پیر پھسل گیا اور بری طرح گرے اور نیچے گرتے پھسلتے چلے گئے ،اور اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے، ان کا انتقال بھی حادثاتی طور پر ہوا، بہت مشہور ہستی تھی ان کے جنازے میں بھی ہزاروں لوگوں نے شرکت کی ان کی تدفین ہوگئی میں ایک دن پھر مرزا جی کی خدمت میں گیا، اور میں نے پھر سوال کیا مرزا جی پیر جھولا بھی اللہ کو پیارے ہوئے، اب انگریز کب جائیں گے؟ مرزا جی نے جواب میں فرمایا۔

> اب انگریزوں کے باپ کو بھی جانا پڑے گا، دنیا کی کوئی طاقت ہندوستان سے جانے کو اب نہیں روک سکتی۔

اور یہی ہوا ، انگریزوں نے کہنا شروع کیا ، ہم جا رہے ہیں ، مسلم لیگ اور کانگریس حکومت سنبھالے۔ پہلے ایک انٹیرم (عارضی حکومت) بنی ، بعد میں تقسیم **(Partition)** ہوگئی اور

پاکستان بن گیا، مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ [1]

بہت اندوہناک، خوف ناک، بھیانک زمانہ تھا، مشرقی پنجاب ہندوستان کو مل گیا اور وہاں کی آبادی کو جو مسلم تھی، پاکستان ہجرت کرنا پڑی، گھر بار سب کچھ چھوڑنا پڑا، مگر یہ تو کچھ بھی نہیں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ مارے گئے، ہزاروں عورتیں اغواء ہوئیں، بوڑھے بچے سب قتل ہوئے، بڑا کسمپرسی کا عالم تھا، ہمارا علاقہ اگرچہ راجپوتانے کا علاقہ تھا، مگر ریاست پٹیالہ میں شامل تھا، غدر کے بعد یہ علاقہ انگریزوں نے سکھ ریاست پٹیالہ کو بطور رشوت دے دیا تھا، اور ریاست کے قانون کے تحت سارا نظام تھا، مہندر گڑھ جس کا اصلی نام کانوڈ تھا اور یہ نواب جھجر کی راجدھانی کا مرکزی علاقہ تھا، کانوڈ ہی کے قلعے میں غدر کے وقت نواب جھجر موجود تھے، اور انگریزوں سے نبرد آزما تھے، کسی صورت بھی انگریز فتح حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، یہ بہت بڑی مسلم ریاست تھی، اس کے زیرِ نگیں بہت بڑا علاقہ تھا، روہتک جھجر ما، کرنال، ریواڑی، بھوانی حصار، کلانور، پانی پت، نارنول، الور، جیند، پھلیرہ، نابھ، سرسہ، اجمیر شریف تک اس کے حدود پھیلے ہوئے تھے، انگریزوں کے لئے بہت بڑی مزاحمت تھی، چونکہ دہلی کے بالکل قریب گڑگانوہ بھی اسی ریاست میں شامل تھا، بہرحال کافی عرصے تک لڑائی جاری رہی، آخر نواب صاحب کو دھوکے سے کہ ہم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، پھر آپ کا علاقہ ہم آپ کو واپس دے دیں گے، آپ قلعے

---

[1] حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمہ اللہ کو بھی قبل از وقت نیند یا کشف کے ذریعے سے تقسیمِ ہند کا علم ہو گیا تھا، چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب صدیقی (کلکتہ) اوائل 1946ء کا واقعہ نقل کرتے ہیں:

(حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے) نمازِ عشاء کے بعد گیارہ بجے طعام تناول کیا اور تقریباً بارہ بجے سونے کی غرض سے آرام فرمانے لگے، راقم الحروف پاؤں دباتا رہا کچھ دیر کے بعد آپ کو نیند آ گئی، اور ہم لوگ دوسرے کمرے میں بعض ضروری کاموں کی تکمیل میں مصروف ہو گئے، تقریباً دو بجے شب کو راقم الحروف اور چوہدری محمد مصطفیٰ (ریٹائرڈ) انسپکٹر مدارس کو طلب فرمایا، ہم دونوں فوراً حاضرِ خدمت ہوئے، ارشاد فرمایا کہ: لو بھئی! اصحابِ باطن نے ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ کر دیا اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ بنگال و پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا، یہ سن کر راقم الحروف نے عرض کیا کہ اب ہم لوگ جو تقسیم کے مخالف ہیں کیا کریں گے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہم لوگ ظاہر کے پابند ہیں، اور جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس کی تبلیغ پوری قوت کے ساتھ جاری رکھیں گے (شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات، صفحہ ۴۴، مرتب: ابوالحسن بارہ بنکوی، مطبوعہ، مکتبہ رشیدیہ، قاری منزل، پاکستان چوک، کراچی، تاریخِ اشاعت 14 ستمبر 1965ء)

سے باہر آ کر بات چیت کریں، اس قلعہ میں بڑا توپ خانہ تھا، جو ابھی تک موجود تھا اور توپ کے گولے جن سے کئی کمرے بھرے ہوئے چاروں طرف خندقیں کھدی ہوئی تھیں، مہینوں لڑائی کا سامان موجود تھا، انگریزوں کے لئے اس کو تسخیر کرنا بہت مشکل تھا، بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا، جو تکوینی حضرات اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں وہ اپنی جگہ درست تھے، ان کو وہ قتل وغارت گری، لوٹ مار، عصمت دری، عورتوں کا اغواء، لوگوں کا بے گھر ہونا، مال واملاک کا لٹنا، یہ سب کچھ ناپسند تھا۔ دوسری طرف جو تکوینی حضرات تھے ان کا موقف یہ تھا، کسی بھی صورت انگریز ہندوستان سے چلے جائیں، پاکستان بن جائے قیمت کچھ بھی ادا کرنی پڑے......لیکن آزادی مل جائے اور ایک مسلم حکومت ایک علاقہ پر قائم ہو جائے، جس کے نتیجے میں آج آپ پاکستان کو دیکھ رہے ہیں۔

یہ دور بڑا عجیب تھا، چاروں طرف جلسے جلوس تھے، ہر طرف انگریز کے خلاف نعرے تھے، مسلم لیگ ایک زمانے تک بڑی کمزور حالت میں تھی، تا آنکہ حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اس کی حمایت کا اعلان فرمایا، جس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ، قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ، مولانا احتشام الحق صاحب رحمہ اللہ وغیرہ نے حصہ لینا شروع کیا اور کچھ عرصہ میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ ہندوؤں کے ماتحت رہیں گے، مسلمانوں کا اپنا ملک ہو وہاں ان کو ہر قسم کی آزادی تو میسر ہوگی میں اس لئے یہ چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کا علیٰحدہ ملک پاکستان بن جائے۔

میرے ابا جی رحمہ اللہ سے جب میری آخری ملاقات ہوئی تو میرا ہاتھ پکڑ کر علیٰحدہ لے گئے اور کچھ جملے تکوینی طور پر فرمائے۔

> بیٹے! پاکستان بن جائے گا، تم وہاں جاؤ گے، ہم وہاں نہیں ہونگے، تم وہاں جا کر بہت بڑے آدمی ہو گے، اور ساری دنیا میں تمہارا نام ہوگا، جاؤ اللہ کے سپرد۔

یہ تینوں جملے حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ اور مجھے یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ ابا جی رحمہ اللہ

نے کیا فرمایا، بلکہ جب میں واپس دہلی پہنچ گیا، تب معلوم ہوا کہ ابا جی رحمہ اللہ نے کیا فرمایا تھا۔
بہرحال لاکھوں قربانیوں کے بعد جن کی ایک مستقل تاریخ ہے، پاکستان بن گیا، اور یہ ان شاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گا اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایٹمی طاقت نہیں، تمام اسلامی ممالک میں سوائے پاکستان کے سب غیر ایٹمی ہیں۔
پاکستان بڑے عجیب ادوار سے گذرتا رہا ہے، کبھی جمہوری حکومت، کبھی فوجی حکومت، جیسے حالات کے مطابق ضرورت ہوتی ہے حکومت بنتی رہتی ہے، وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن پاکستان ایک خاص مقصد کے لئے معرضِ وجود میں آیا ہے، جب تک وہ مقصد پورا نہیں ہوتا پاکستان ایٹمی طاقت ہونے کے ساتھ قائم رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

میری دہلی سے پاکستان آمد کی داستان

ہمارے خاندان کے افراد ۴۷ء کے فسادات میں شہید ہوئے ہیں، دادا ابا، دادی اماں، میرے والد، والدہ، میرے دو جوان بھائی مشیر احمد خاں شہید، عزیر احمد خاں شہید میرے بڑے چچا رسالدار رفیق احمد خاں اور کبیر احمد خاں، میری چچیاں، خالائیں، ان کی اولاد سمیت تقریباً چالیس افراد شہید ہوئے، بہت بڑا خاندان تھا اور بہت بڑی شہادت تھی۔
میں نئی دھلی گورنمنٹ کے اے کلاس کوارٹر ٹیگور، روڈ پر خواجہ عبدالحکیم انصاری رحمہ اللہ کے ساتھ رہتا تھا، دلّی کے حالات دن بدن خراب ہو رہے تھے، ہر طرف فسادات شروع ہو چکے تھے، میں ان دنوں ''جنگ'' اخبار میں کام کر رہا تھا، لال کنواں اس کا دفتر تھا، اخبار کے اسٹاف کو گورنمنٹ کی طرف سے کرفیو پاس ملے ہوئے تھے، میرے چھوٹے چچا شبیر احمد خان مرحوم پولیس میں ملازم تھے اور ٹریفک پولیس ڈیوٹی انجام دے رہے تھے، ان کی رہائش حوض قاضی پر نمک کے پھاٹک میں تھی، اور اسی جگہ میرے بہنوئی ریاض احمد خان مرحوم بھی رہتے تھے، ان کا ایک بڑا کارخانہ جس میں لیتھ مشینیں اور دیگر مشینیں تھیں، اس کارخانے کے بالائی حصے پر ان کی رہائش تھی، میں دفتر آتے جاتے یہاں آتا جاتا رہتا تھا، ہمارے ابا جی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی شیر احمد خان مرحوم کے

بڑے بیٹے شریف احمد خان مرحوم کی صاحب زادی سے ریاض احمد خان کا نکاح ہوا، وہ بھی اسی جگہ رہائش پذیر تھیں، میری ہم عمر تھیں، بچپن میرا ان کے ساتھ گزرا تھا، اس لیے ایک قلبی تعلق ان کے ساتھ تھا، بھائی ریاض احمد خان مرحوم بھی میرے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔

میرے چھوٹے بھائی ظہیر احمد خان صاحب یہ بھی دلی میں ایک الیکٹرک ٹریننگ کالج دریا گنج میں الیکٹرک کورس کر رہے تھے، اور اس کے ہوسٹل میں رہائش پذیر تھے، میری پھوپھی صاحبہ مرحومہ ان کے صاحبزادے سخاوت علی خان مرحوم ان کے چھوٹے بھائی مقصود احمد خان صاحب مرحوم یہ بھی نئی دہلی میں رہائش پذیر تھے، سخاوت علی خان مرحوم پی ڈبلیوڈی میں ملازم تھے، سرکاری رہائش ملی ہوئی تھی۔

جب ہندو مسلم فسادات میں شدت آئی اور سبزی منڈی قرول باغ پہاڑ گنج پر ہندوؤں کا حملہ ہوا جس میں پولیس اور آرمی بھی ہندوؤں کے ساتھ ہوتی تھی، ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے کوئی بچاؤ کی صورت نہیں تھی، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج سے مسلمان بچے کُھچے اپنی جگہ سے قافلے کی صورت میں گھر بار چھوڑ کر جامع مسجد دلی آ کر اس کی سیڑھیوں پر پڑ گئے تھے۔

یہ قافلے حوض قاضی سے ہوکر چاوڑی بازار سے گزر کر جامع مسجد جاتے تھے، حوض قاضی، لال کنواں، چاوڑی بازار میں آرمی موجود ہوتی تھی، لیکن وہ ہندوؤں کے لیے ہوتی تھی، ایسی بیکسی اور خوف کا عالم ان قافلوں پر ہوتا تھا کہ ان کے درمیان سے اگر کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیتے تھے تو نہ آرمی حرکت میں آتی تھی اور نہ قافلے والے، مزاحمت تو درکنار مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اور برابر چلتے رہتے تھے۔

میں حسبِ سابق دفتر آتا جاتا تھا، کرفیو پاس میری جیب میں ہوتا تھا، عام طور پر جب آرمی والے کرفیو پاس چیک کرتے تھے اور اس میں کوئی اسلامی نام ہوتا تو اس کو بلوائی ہندو مار دیتے تھے، پھر میں بلی ماران، جامع مسجد، لال کنواں، حوض قاضی جاتا رہتا تھا، مجھے میرے دوست منع کرتے تھے کہ تم ایسے کرفیو ٹائم میں مت گھوما کرو، بات تو ان کی درست تھی لیکن اصل حفاظت تو اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور میرے کرفیو پاس کو سوائے ایک دفعہ کے کبھی کسی نے چیک بھی نہیں کیا، یہ بتاتا چلوں

کہ والد صاحب نے ایک مرتبہ مجھے حکم دیا کہ تم فوج میں بھرتی ہو جاؤ، چنانچہ بھرتی ہونے کے لیے مجھے داڑھی منڈانا پڑی اور میں اپنے منشی چچا شبیر احمد خان کے ہمراہ ریکروٹنگ سینٹر گیا جہاں میرا معائنہ کیا گیا میرا قد اور سینہ ناپا گیا جب مجھے ریکروٹنگ آفیسر نے پوچھا کہ کس لائن میں تم جانا چاہتے ہو تو میں نے کہا میں ٹیکنیکل لائن میں جانا پسند کرتا ہوں، اتفاق سے اس وقت ٹیکنیکل بھرتی بند تھی، جس پر اس انگریز نے کہا، سوری آپ دس پندرہ دن بعد آئیں، اس وقت یہ عارضی طور پر بند ہے، میں واپس آ گیا اور مجھے دھلی ہمدرد دواخانے میں ملازمت مل گئی۔

ہوا یوں کہ ایک دن جو کرفیو کا اعلان ہوا کہ وہ ایک آدھ دن کا نہیں بلکہ مسلسل تین چار دن کا تھا، میں دفتر سے نمک کے پھاٹک شبیر چچا کے پاس تھا، وہ بھی اپنی ڈیوٹی سے آ کر گھر پر تھے، انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ تم نئی دہلی مت جاؤ، حالات خراب ہیں اور میں بھی اب ڈیوٹی پر نہیں جاؤنگا، اتفاق سے میرے چھوٹے بھائی ظہیر احمد خان بھی دریا گنج سے آئے ہوئے تھے، ان کو بھی روک لیا گیا، اگرچہ ان کو اصرار تھا کہ میرا وہاں جو سامان ہے، اس میں بزرگوں کی کچھ یادگار چیزیں ہیں، مگر ان کو بھی نہیں جانے دیا گیا۔ اس سے قبل میرے دوسرے بھائی زبیر احمد خان صاحب بھی مہندر گڑھ سے میرے پاس آ گئے تھے کہ میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا، اس کا نتیجہ نکل آیا ہے، مجھے کسی جگہ ملازم کرادو۔

میں نے ان کو مشورہ دیا کہ تم پھوپھی صاحبہ کے ہمراہ پاکستان چلے جاؤ، اب یہاں کیا ملازمت کرنا، اس پر انہوں نے مجھے کہا کہ میں تو والد صاحب اور والدہ صاحبہ سے اس قسم کی اجازت نہیں لایا ہوں، میں نے کہا کہ تم پاکستان چلے جاؤ، اجازت وغیرہ میں لے لونگا، چنانچہ وہ پاکستان جانے والی سب سے پہلی اسپیشل ٹرین جو سرکاری ملازمین کو لے کر جا رہی تھی اس میں سوار ہو کر پاکستان چلے گئے، یہ پہلی اسپیشل ٹرین تھی جو محفوظ طریقے سے پاکستان پہنچی اور ہر اسٹیشن پر رک کر آؤ بھگت ہوئی، استقبال ہوا اور مسلمانوں نے جو بھی وہاں رہ رہے تھے کھانا وغیرہ اور مشروبات سے تواضع کی، اس کے بعد تو کوئی اسپیشل ٹرین حفاظت سے نہیں پہنچی، بلکہ ان پر حملے شروع ہو گئے، لوگوں کو مارنا، سامان لوٹنا اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، پہلی اسپیشل ٹرین کے پہنچنے کی اطلاع ہمارے پاس

آ گئی تھی، دوسری طرف مہندر گڑھ جہاں میرے دادا دادی والدہ والد چچا کبیر احمد صاحب اور رفیق احمد خان صاحب ان کی بیویاں بچے اور میرے دو بھائی مشیر احمد خان عزیر احمد خان موجود تھے۔

میرے چچا رسالدار صغیر احمد خان جو باقاعدہ آرمی میں فرسٹ اسکنر ز ہارس میں ملازمت پر موجود تھے چونکہ مہندر گڑھ جو ریل گاڑی جاتی تھی، اس میں مسلمانوں کا سفر بند ہو گیا تھا، سارے ہندوستان کے حالات خراب ہو گئے تھے، مسلمان کسی جگہ سفر نہیں کر رہے تھے، میں ڈیڑھ ماہ قبل مہندر گڑھ گیا تھا، اس وقت میرے والد صاحب اور والدہ صاحبہ جن کو میں بھیا جی رحمہ اللہ اور بھابھی صاحبہ کہتا تھا انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ اگر تم دہلی میں کرایہ کا مکان لے لو تو ہم دہلی تمہارے پاس آ جائیں گے، چنانچہ میں نے مٹیا محل میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا، اور یہ میں نے ان سے کہا کہ آپ حسبِ وعدہ میرے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے عذر کر دیا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں چونکہ ابا جی رحمہ اللہ اور اماں جی یہاں ہیں ان کے بغیر یہ کام مشکل ہے، ادھر ابا جی رحمہ اللہ اور اماں جی بھی کسی اور جگہ منتقل ہونے کو تیار نہیں تھیں، بہر حال میں ان سے رخصت ہو کر سامان وغیرہ لے کر واپس دہلی آ گیا لیکن چلنے سے پیشتر ابا جی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر یہ فرمایا کہ تنویر بیٹے، پاکستان بن جائے گا، تم وہاں جاؤ گے ہم وہاں نہیں جائیں گے، اور وہاں جا کر تم بہت بڑے آدمی بنو گے، دنیا میں تمہارا نام ہوگا، جاؤ اللہ کے سپرد۔

اصل میں یہ نپے تُلے تکوینی جملے تھے جو میں نے سُن لیے، نہ تو میں نے کوئی سوال کیا نہ ہی کوئی بات کی بلکہ ایک سحر زدہ کی طرح میں ابا جی رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہو گیا، دہلی واپس پہنچنے تک یہ خیال ہی نہیں آیا کہ ابا جی رحمہ اللہ نے مجھے کہا کیا تھا، ادھر صغیر چچا مرحوم ایک فوجی گاڑی لے کر خاندان والوں کے لینے کے لیے مہندر گڑھ پہنچ گئے، ان کے ساتھ کچھ فوجی جوان بھی تھے، لیکن کوئی بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوا، جب بھیا جی رحمہ اللہ سے انہوں نے اصرار کیا تو انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ زور دے کر یہ فرمایا، صغیر میں اور میری اولاد بیوی بچے اسی جگہ شہید ہوں گے تقدیر کوئی نہیں بدل سکتا، یہ بات مقدر ہو چکی ہے، تم جاؤ اور وقت مت ضائع کرو، ابا جی رحمہ اللہ نے بھی یہ فرمایا کہ میں اپنے بزرگوں کی ہڈیاں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، علیٰ ہذا القیاس، میرے دونوں چچا

رسالدار رفیق احمد خان اور کبیر احمد خان صاحب نے بھی یہی جواب دیا کہ جب بڑے نہیں جا رہے تو ہم کیسے جا سکتے ہیں، میں مہندر گڑھ کے حالات پہلے اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ ہمارے پاکستان ہجرت سے پہلے مہندر گڑھ میرے خاندان کے تمام افراد شہید ہو چکے تھے اور ان کے مکمل حالات ہمارے علم میں آ چکے تھے۔

میرے والد صاحب جن کو میں بھیاجی بلکہ میرے سب بھائی بہن بھیاجی ہی کہتے تھے، بھیاجی رحمہ اللہ 1940 میں پینشن آ چکے تھے، مہندر گڑھ میں کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی، یہ ایک سکھوں کی ریاست تھی، ریاست پٹیالہ جس کے ماتحت مہندر گڑھ نارنول جو کہ راجپوتانے کے علاقہ تھا، غدر کے بعد انگریزوں نے یہ علاقہ پٹیالہ اسٹیٹ کو دیدیا تھا، اصل میں یہ علاقہ نواب جھجر کی ریاست کا حصہ تھا، یہاں پر ایک بڑا قلعہ بھی تھا، نواب جھجر اسی قلعے میں محصور ہو کر انگریزوں سے نبرد آزما تھے، ان کی بہت بڑی ریاست تھی، اس میں ریواڑی ہانسی، حصار، سرسہ، کرنال، روہتک، کلانور، الور گڑگانوہ جیند تک شامل تھا۔

جب انگریز جنگ میں عاجز آ گئے تو انہوں نے دوسرا منافقانہ حربہ استعمال کیا کہ آپ ہم سے گفت وشنید کریں ہم چند شرائط کے ساتھ آپ کا تمام علاقہ آپ کو دیدیں گے، جب وہ قلعے سے باہر آئے تو ان کو شہید کر دیا گیا اور ان کی ریاست کے حصے بخرے کر کے غداروں کو دیدیے گئے، مہندر گڑھ کا اصل نام ''کانوڈ'' تھا، یہ نواب جھجر کا دار الخلافہ تھا۔

1946 میں بھیاجی رحمہ اللہ نے مہندر گڑھ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی، جس میں وہ صدر مقرر ہوئے، جنرل سیکرٹری مرزا عبدالسلام بیگ، خزانچی شمس الدین صندل مقرر ہوئے اور دیگر عہدیداران وغیرہ قابلِ ذکر نہیں، مسلم لیگ کی بنیاد سے ہندوؤں میں ہلچل مچ گئی، اور انہوں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی، بھیاجی رحمہ اللہ ہندوؤں کے سب سے بڑے دشمن تھے، ہمارا محلّہ راٹھوڑان فوجیوں کا محلّہ تھا، اس محلے میں اکثر لوگ فوج سے متعلق تھے، اس میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ صوبیدار تھے، بھیاجی رفیق احمد خان رسالا دار پینشنر تھے، لیفٹینیٹ احمد علی خان پینشنر تھے، اور شہر کے آنریری مجسٹریٹ بھی تھے، اباجی رحمۃ اللہ علیہ شہر اور ان کے نواح کی پنچایت کے صدر تھے اس کے علاوہ جمعدار (نائب

صوبیدار) سلطان احمد خان جمعدار (نائب صوبیدار) نثار احمد خان، جمعدار (نائب صوبیدار) ولی محمد خان یہ سرداروں میں شامل تھے، جب فسادات شہر میں شروع ہوئے تو فوج پولیس ہندوؤں کے شانہ بشانہ لڑائی میں شریک تھی، ہمارے محلّہ کا محاصرہ ہو چکا تھا، مورچے بن گئے تھے اور لڑائی جاری تھی، شہر کی دوسری مسلمان آبادی اپنے گھر بار چھوڑ کر ہمارے محلے میں پناہ گزیں تھے اور اچھا خاصہ مہاجر کیمپ بن گیا تھا، اس وقت جو بھی ہتھیار محلے والوں کے ساتھ تھے اور ایک توپ بھی تھی، اس سے مقابلہ ہو رہا تھا، ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد جان دینا نہیں تھا، بلکہ لوٹ مار کا تھا، اس لیے وہ مقابلے سے ہٹ جاتے تھے ادھر محلے کی حالت یہ تھی کہ راشن ختم ہو چکا تھا، چونکہ سارا شہر یہاں پر آ گیا تھا ان کی حفاظت اور کھانا پینا محلے والوں کی ذمہ داری تھی، پھر صفائی کا مسئلہ بھی تھا، اکثر میرے منشی چچا کبیر احمد خان اپنی ساتھ چند لڑکوں کو لے کر جاتے تھے اور قریب کی ہندوؤں کی دوکانیں توڑ کر وہاں سے راشن کی بوریاں اٹھا کر لاتے تھے، جس سے خوراک کا مسئلہ چل رہا تھا، اسی دوران سکھوں اور ہندوں کے ساتھ مذاکرات شروع ہو چکے تھے، جو یہ کہہ رہے تھے آپ خود کو سرینڈر کر کے باہر آ جائیں اور اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر دیں، ہم بحفاظت آپ سب کو پاکستان پہنچا دیں گے، اس گفتگو میں لیفٹینٹ احمد علی خان مرحوم حصہ لے رہے تھے، انہوں نے مذکورہ بالا شرائط پر معاہدہ کر لیا جس کے والد صاحب رحمہ اللہ سخت مخالف تھے کہ جب ہتھیار دے کر ان کے سامنے آ جائیں گے تو پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیں پاکستان حفاظت سے بھیج دیں گے جس پر یہ بتایا گیا کہ انہوں نے قسمیں کھائی ہیں کہ سکھوں نے گرنتھ اٹھایا ہے، اس لیے یہ معاہدہ ہو گیا، بہر حال بھیا جی رحمہ اللہ نے فرمایا میں تقدیر نہیں بدل سکتا، اب جب سب کا شہید ہونا ہی لکھا ہے تو وہ ہو کر ہی رہے گا سب باہر آ گئے، ہتھیار حوالے کر دیے گئے، اس کے بعد انہوں ے مردوں کو علیحدہ اور عورتوں کو علیحدہ کیا اور اسٹیشن کی طرف روانہ کر دیا، پورے قافلے کی کمان بھیا جی رحمہ اللہ کر رہے تھے، ایک یہ مصیبت کا عالم تھا دوسرے بارش بھی برابر ہو رہی تھی، اسی عالم میں سب اسٹیشن پہنچ گئے، انتظار تھا کہ اسپیشل ٹرین آئے گی جو سب کو لے کر پاکستان جائے گی، اسی عالم میں بھوکے پیاسے اسٹیشن پر پڑے ہوئے تھے، رات بارہ بجے ٹرین آئی جس میں آدھے لوگ سوار ہو گئے،

ابا جی رحمہ اللہ اور غصیلی چچا رسالدار رفیق احمد یہ پیچھے رہ گئے، باقی سب مرد عورتیں ٹرین میں سوار ہو گئے، ہمارے خاندان کو خصوصی طور پر ایک ڈبہ یعنی ایک گاڑی کی بوگی دی گئی کہ آپ اس میں سوار ہوں۔

اس کے بعد گاڑی چل پڑی، اگلا اسٹیشن چار میل کے فاصلے پر ستنالی کا تھا، وہاں گاڑی رُک گئی، جہاں پہلے سے بلوائی اور سکھ فوجی موجود تھے، باقاعدہ سازش کے ساتھ یہ کیا گیا، اور سب سے پہلے ایک آواز آئی، رسالدار محمد حنیف خان، بھیا جی رحمہ اللہ نے اپنا آدھا جسم دروازے سے باہر نکال کر جواب دیا، کیا بات ہے؟ جیسے ہی آپ نے جسم باہر نکالا، ایک سنسناتی گولی آئی جو بھیا جی رحمہ اللہ کے سینے سے پار ہو گئی، آپ زخمی حالت میں نیچے زمین پر گر پڑے، جس پر ان کے دونوں بیٹے مشیر احمد خان وعزیر احمد خان ان پر گر پڑے اور ایک بیٹی فضیلہ بھی، ان پر کلہاڑیاں اور برچھے پڑنے شروع ہو گئے، کبیر احمد خان رحمۃ اللہ علیہ جو سب سے بڑے شہید تھے، اور بڑے شہہ زور تھے وہ دو آدمیوں کے سر پکڑ کر آپس میں ٹکرا کر مار رہے تھے، آخر انہوں نے یہ طے کیا کہ نیزے لے کر دور سے ان کے جسم کو زخمی اور لہولہان کیا جائے اور ایسا ہی ہوا ان کا پورا جسم زخموں سے چُور تھا، اور وہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑے، کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے، پورا خاندان عورتیں بچے ختم ہو چکے تھے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اب آگے اللہ تعالیٰ کی حکمتیں کہ ابا جی رحمہ اللہ کی ہر اولاد کی نسل کو باقی رکھنا منظور تھا، کبیر احمد خان شہید کی پوری نسل ساتھ تھی، سب شہید ہو گئے لیکن ایک بچہ خون خرابے سے ڈر کر سیٹ کے نیچے گھس گیا جس کا نام خلیق احمد خان ہے، اس طریقہ سے وہ بچ کر پاکستان پہنچ گیا، اصل میں تو ان کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا، صرف ہمارا خاندان تھا، جس کو وہ ختم کرنا چاہتے تھے، باقی لوگ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ایک اور ساتھ والا ڈبہ جس میں نثار احمد خان جمعدار (نائب صوبیدار) سوار تھے، ان کے پاس ایک بندوق موجود تھی، جسے کسی طرح بچا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے، جس سے انہوں نے ہوائی فائر کیا، جس کی وجہ سے کوئی بلوائی اس ڈبے کی طرف نہیں گیا، جب یہ سارا خونی سانحہ ختم ہوا اس کے بعد یہ ٹرین وہاں سے چلی اور لوہار و اسٹیشن پر آ کر رُکی۔

ہمارے رشتے کے دادا عباس علی خان جو اسی ٹرین میں تھے، وہ بیان کرتے ہیں جب میں نے کبیر احمد خان شہید کو اُٹھانا چاہا تو میرے دونوں ہاتھ ان کے جسم میں اس طرح چلے گئے، جیسے کسی دھنی ہوئی روئی میں جاتے ہوں، سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا، یہاں آکر ان کا دم آخر ہوا، اس وقت تک وہ برابر کلمہ پڑھتے رہے، ان کی سب سے بڑی خواہش شہادت تھی جو پوری ہوئی۔

میری والدہ اور بھائی بہن اپنے والد رسالدار محمد حنیف خان شہید اول پر گر کر لپٹ گئے اور اسی حالت میں شہید ہوگئے، بہن جو بہت چھوٹی تھیں، زخمی ہوکر ان ہی لاشوں میں پڑی رہی، دن میں ایک راجپوت ہندو وہاں سے گزر رہا تھا، اس نے اس زندہ دیکھ کر گود میں اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور بعد میں جب زخم وغیرہ ٹھیک ہوئے اور اسے معلوم ہوا کہ یہ کس کی لڑکی ہے؟ تو وہاں سے وہ جے پورے آیا جہاں ٹرین کے بچے کھچے لوگ موجود تھے، اس میں کچھ ہمارے عزیز بھی تھے، جو کھوکراپار کے راستے سے پاکستان پہنچے۔ ان کے ساتھ وہ بھی آ گئی، الحمد للہ اب تک بقیدِ حیات ہے، اور ان کے بیٹے مسعود احمد خان، محمد یوسف، احتشامُ الحق اور دو بیٹیاں موجود ہیں، دوسری طرف میرے غصیلی چچا جن میں غصہ بہت تھا، اس وجہ سے ان کا یہ نام پڑ گیا، ان کی اولاد اور وہ خود سب شہید ہوگئے، ان کا ایک بڑا بیٹا جس کو میرے چچا رسالدار صغیر احمد خان یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ اگر آپ لوگ میرے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو خیر اس کو میرے ساتھ بھیج دو، اس طرح ان کی نسل کا واحد بچنے والا شفیق احمد خان آج بھی بحمد اللہ تعالیٰ بقیدِ حیات ہے، میرے منشی چچا کبیر احمد خان کی بڑی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت کی موت عطا فرمائیں، ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ شہید ہوکر واصل بحق ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔

اب وہ دوسرا مرحلہ جس میں اباجی رحمۃ اللہ علیہ اور غصیلی چچا لفٹیننٹ احمد علی خان ان کے اکلوتے بیٹے شمشاد علی خان ان کے بڑے بھائی محمد علی خان یہ سب دوسری ٹرین میں جانے والے تھے، جس کا ان کو انتظار تھا، اس دوران سکھ آرمی والوں نے احمد علی خان شہید مرحوم کو یہ پیشکش کی کہ آپ اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ ہماری پناہ میں قلعے میں آ جائیں، ہم کرفیو کے بعد میں عزت کے

ساتھ پاکستان بھیج دیں گے اور وہ قلعہ چلے بھی گئے تھے لیکن ان کے صاحبزادے شمشاد علی خان کے اصرار پر کہ ہمیں محلے والوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے جو کچھ مرنا جینا ہے ان کے ساتھ ہی ہونا چاہیے چنانچہ وہ واپس آ گئے ادھر عُصیلی چچا کو رات کو فائرنگ کی آواز سنائی دی وہ بغیر کسی کو اطلاع دیے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اسپیشل ٹرین والوں کے ساتھ کیا گزری، ستلانی اسٹیشن (مہندر گڑھ سے چار میل کے فاصلے پر) پہنچ گئے، اور اپنے گھر والوں کی لاشوں کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے، واپس اباجی رحمہ اللہ کی خدمت میں آئے اور ان کو واقعے کی اطلاع دی اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہاں سے رات کے اندھیرے میں چل پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہم پاکستان پہنچ جائیں گے لیکن اباجی رحمہ اللہ نے اسے قبول نہیں کیا اور یہ فرمایا جو کچھ ہونا ہے سب کے ساتھ ہو جائے گا۔

چنانچہ دن کے بارہ بجے ایک ٹرین آئی لیکن اس کے ساتھ ہی بلوائیوں اور آرمی نے حملہ کر دیا، میرے عُصیلی چچا بہت بہادر اور لٹھ چلانا جانتے تھے، انہوں نے ایک بلوائی کے ہاتھ سے ایک ''فرشی'' جو ایک لمبی لکڑی کے ساتھ چوڑے پھل کی کلہاڑی لگی ہوئی ہوتی ہے چھین کر ان پر حملہ آوار ہو گئے اور آرمی کی فائرنگ سے بچنے کے لیے ہجوم میں گھس کر مارنا شروع کیا۔ بہت دیر تک وہ ہندو بلوائیوں کو مارتے رہے، جبکہ آرمی بلوائیوں کو یہ ہدایت کر رہی تھی کہ کہ ان سے علیٰحدہ ہو جاؤ تاکہ ہم ان پر فائرنگ کر سکیں، اسی دوران اباجی رحمہ اللہ پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا، جس پر اباجی رحمہ اللہ نے عُصیلی چچا کو آواز دی، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اباجی رحمہ اللہ پر حملہ ہو رہا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر اباجی رحمہ اللہ کی طرف دوڑے اور ہجوم سے علیٰحدہ ہو گئے ان پر فائر شروع ہو گئے، پہلے ایک گولی لگی وہ دوڑتے رہے دوسری لگی پھر بھی وہ اباجی کی حفاظت کے لیے دوڑتے رہے لیکن جب تیسری گولی لگی تو یہ جانباز گر پڑا، اور یوں اباجی رحمہ اللہ کے قدموں کے قریب انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

احمد علی خان ان کے بڑے بھائی محمد علی خان اکلوتے بیٹے شمشاد علی خان اور دیگر ان کے خاندان کے افراد سب شہید ہو گئے، اباجی رحمہ اللہ نے بھی اسی حالت میں جامِ شہادت نوش کیا، بے شک شہید

زندہ ہوتے ہیں، اور وہ آج بھی زندہ ہیں، میں دلی میں ظہر کی نماز پڑھ کر مصلے پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ابا جی رحمہ اللہ سامنے آئے اور یہ فرمایا بیٹا ہم جا رہے ہیں، خدا حافظ یہ کہہ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے، ان کو میرے ساتھ محبت ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا عشق تھا، جو بالکل غیر اختیاری تھا، میں نے اسی وقت شبیر چچا سے عرض کیا کہ ابا جی رحمہ اللہ شہید ہو چکے اور خاندان والے بھی، انہوں نے غصے سے فرمایا کہ بکواس کر رہے ہو، میں نے عرض کیا بکواس نہیں حقیقت ہے۔ ابھی ابا جی تشریف لائے تھے اور یہ فرما کر رخصت ہو گئے، بعد میں تحقیق ہوئی، وہی وقت تھا، اور وہی دن تھا جب وہ شہید ہوئے اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔

ہندوؤں نے غصیلی چچا کو اس جانبازی اور بہادری سے لڑتے دیکھا کہ سینکڑوں بلوائیوں کو انہوں نے ختم کیا، لیکن ایک خراش تک بھی نہیں آئی جبکہ بعد میں آرمی نے فائرنگ کر کے ان کو شہید کیا۔

ہندوؤں کے نزدیک وہ عام آدمی نہیں بلکہ اوتار تھے، چنانچہ وہاں ہندوؤں نے ان کی ایک سمادھی بنائی ہوئی ہے، اس پر وہ چڑھاوے چڑھاتے ہیں، اصل میں تمام ہندوؤں اور سکھوں کو میرے بھیا جی رحمہ اللہ سے دشمنی تھی، محض اس وجہ سے کہ انہوں نے یہاں مسلم لیگ قائم کی، اس لیے سب سے پہلے ان کو نشانہ بنایا، جب سے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سارے شہداء، میرے جوان دو بھائی مشیر احمد خان شہید عزیز احمد خان شہید میرے سامنے آ جاتے ہیں، پھر کبھی ابا جی رحمہ اللہ بھیا جی رحمہ اللہ منشی چچا، اور میری اماں جی (دادی اماں) خالہ، چچیاں، نظر آ جاتی ہیں، میں لکھنا بند کر کے بے قابو ہو کر رونے لگتا ہوں، کبھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ لکھنا بند کرنا پڑتا ہے، پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ ان کی قربانیوں کو پاکستان میں کون جانتا ہے، کسی کا سارا خاندان پاکستان کے لیے قربان ہو گیا، آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں، کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ان کی قربانیوں کے عوض ہمیں پاکستان نے کیا دیا؟

لیکن یہ سوچ کر تنویر تو اکیلا تو نہیں، ایسے تو سینکڑوں خاندان ہونگے، جو پاکستان کے لیے قربان ہو گئے، ان کو کون جانتا ہے؟ یہ بھی آج 60 سال بعد خیال آیا کہ یہ تحریر کروں تاکہ آنے والی نسلوں کو یہ معلوم رہے کہ ان کے آباؤ اجداد کون تھے؟ کیسے تھے؟ کیسی کیسی قربانیاں دے کر اپنے خون

سے، پاکستان کی بنیادوں کو سینچتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، لاکھوں رحمتیں ان کی ارواح پر نازل ہوں، کروڑوں درجات اللہ تعالیٰ ان کے بلند فرمائے، اورہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

میرے ایک چچا نصیر احمد خان صاحب وہ بھی آرمی میں سکنڈ رائل لانسرز میں دفعدار میجر کے عہدے پر تھے، لیکن ان کا رسالہ اس وقت سنگا پور میں تھا، اس لیے وہ اس سلسلے میں کوئی خاص کرداد ادا نہیں کر سکے، بعد میں وہ پاکستان آ گئے، اب ریٹائر ہونے کے بعد ایمن آباد میں رہائش پذیر ہیں۔الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں، ماشاء اللہ ان کی کافی اولاد ہے۔ چچاؤں میں سب سے عیالدار وہ ہیں، میری چھوٹی خالہ صاحبہ ان سے منسوب تھیں، جو مہندر گڑھ میں شہید ہو گئیں، پاکستان آ کر انہوں نے دوسری شادی کی، یہ سب اولاد ان ہی سے ہے۔

میں میرا بھائی ظہیر احمد میرے چچا شبیر احمد خان، چچی صاحبہ اور میری اماں جی (دادی اماں) کے بھائی محمد نبی خان یہ سب ہم ایک جگہ شبیر چچا صاحب مرحوم کے ساتھ رہ رہے تھے، ایک دن ایسا ہوا کہ کٹہرہ رضیہ بیگم جو کہ شبیر چچا کے مکان سے متصل تھا، اس پر ہندوؤں نے حملہ کر دیا، نمک کے پھاٹک کے تمام مکین مقابلہ کے لیے آ گئے، اورانہوں نے اپنی عورتوں کو لال کنواں منتقل کر دیا، جب شبیر چچا اپنی بیوی اور ایک بیٹا بلال احمد کو لے کر چلنے لگے تو میں نے پوچھا کہاں لیجا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا، محلے کے تمام لوگوں نے اپنی عورتوں کو لال کنواں منتقل کر دیا ہے، میں بھی یہی کچھ کر رہا ہوں، اس پر میں نے سختی سے کہا یہ کیا حماقت ہے کہ ہم تو مر جائیں اور عورتیں اولاد دوسروں کے حوالے ہو جائے، اگر ہم بچے تو یہ بچ جائیں گے ورنہ ہمارے ساتھ یہ بھی قربان ہو جائیں گے، انہوں نے جب یہ سنا تو فرمانے لگے بات سمجھ میں آ گئی تم نے بالکل ٹھیک کہا، چنانچہ چچی صاحبہ اور بلال میاں گھر پر ہی رک گئے لوگوں نے اپنی چھتوں پر اینٹیں پتھر جمع کیے ہوئے تھے انہوں نے بلوائیوں پر پتھر اینٹیں برسانا شروع کیں، قصہ مختصر وہ پسپا ہو کر واپس چلے گئے، مصیبت ٹل گئی، رات بھر جاگ کر گذری، صبح فجر کے بعد میں نے چچا صاحب سے عرض کیا میں کچھ دیر سوؤں گا، آپ ظہیر کا خیال رکھیے، یہ کسی طرح دریا گنج نہ جائے، یہ کہہ کر میں سو گیا۔

تقریباً نو بجے میری آنکھ کھلی میں نے پوچھا ظہیر کہاں ہے؟ چچا صاحب نے جواب دیا کہ وہ تو دریا گنج چلا گیا، میں نے کہا ٹھیک ہے، اب ایک ظہیر نہیں بلکہ تنویر بھی اس کے ساتھ مرے گا، یہ کہہ کر میں جامع مسجد کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا، چچا صاحب نے بہت روکا لیکن بھائی کی محبت سے مجبور تھا، میں چل پڑا، جب میں نمک کے پھاٹک سے نکل کر جامع مسجد روانہ ہوا تو دو تین مسلمان کھڑے ہوئے جس میں ایک باریش تھے، انہوں نے مجھ سے پوچھا، بھائی آپ کہاں جارہے ہو، میں نے کہا جامع مسجد، انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو، ایک لمحے کے لیے تو خیال آیا کہ ان کے داڑھی ہے، پھر لاحول پڑھ کر ان کو ساتھ لیا لیکن اُن سے کہا کہ شرط یہ کہ کسی گڑبڑ پر تم بھاگو گے نہیں، چاوڑی بازار سے گزرتے ہوئے جب بڑشاہ بُلاّ پر پہنچے تو کچھ ہندو بلوائی وہاں مسلمانوں کی دوکانیں توڑ رہے تھے، انہوں نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ میں نے جواب دیا جامع مسجد، جس پر وہ میری طرف بڑھا، اسی اثناء میں وہ حضرات بھاگ پڑے، اور کچھ فاصلے پر مرغوں والی گلی تھی، جہاں مسلمان کھڑے رہتے تھے مسلمانوں کی مدد کے لیے، وہ وہاں پہنچ گئے، میں کھڑا رہا، اور میں نے ان کو کہا آگے آؤ، بس اللہ کی طرف سے مدد تھی کہ وہ آگے نہیں آئے اور وہیں سے کچھ چھوٹے ٹین کے ڈبے میری طرف پھینکے جو مجھے نہیں لگے اور میں وہاں سے جامع مسجد پہنچ گیا، جامع مسجد کے سامنے بہت بڑا پریڈ گراؤنڈ تھا، اس کو عبور کرنے کے بعد دریا گنج کی سڑک تھی، جہاں سے ظہیر احمد خان کے ہوسٹل کا راستہ تھا، میں بہت غصے میں تھا کہ ظہیر کو ماروں گا، اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ اسی کشمکش میں میں چل رہا تھا اور گراؤنڈ ختم ہونیوالا تھا، میں نے دیکھا سامنے ظہیر خان آرہے ہیں لیکن اس کی حالت دیکھ کر غصہ وغیرہ سب ختم ہو گیا، نہ جانے کیسے وہاں سے بچ بچا کر یہ آیا تھا، مجھے وہ سب کچھ بتایا بلکہ ایک ہندو کو یہ مار کر کسی گڑھے میں ڈال آیا تھا، میں نے سب داستان سُن لی، اس کے بعد ہم دونوں جامع مسجد پہنچے، کرفیو میں دو گھنٹے کی چھوٹ ہوتی تھی، چھ بجے سے آٹھ بجے تک، اب تو گیارہ بجنے والے تھے، میں نے کہا اب یہ مناسب نہیں کہ حوض قاضی جایا جائے بلکہ میں نے جو مکان ٹمیا محل پر کرایہ پر لیا ہوا تھا، اس میں قیام کرتے ہیں، کل دوسرے دن جب کرفیو کھلے گا تو ہم چچا صاحب کے پاس جائیں گے، یہاں

جامع مسجد پر بازار بھی لگا رہتا تھا، چنانچہ وہاں پر کھانا وغیرہ لے کر کھایا اور اس مکان میں رات کو قیام کیا، ادھر چچا صاحب اور چچی صاحبہ ہم دونوں پر فاتحہ پڑھ چکے تھے، کہ وہ تو مر مرا گئے ہوں گے، نہ جانے کہاں ان کی لاشیں پڑی ہونگیں۔

چچی صاحبہ تو بار بار رو رہی تھیں اور چچا صاحب سے جھگڑ رہی تھیں کہ تم اگر ظہیر کو روک لیتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

جب دوسرے دن ہم جامع مسجد پر ناشتہ وغیرہ کر کے حوض قاضی پہنچے تو وہ حیران ہو گئے اور فرطِ محبت سے لپٹ گئے ان کو سارا ماجرا سنایا، انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا، اور چچی صاحبہ کی جان میں جان آئی اب یہاں نمک کے پھاٹک میں رات کو نوجوان پہرہ دیتے تھے، اس حالت میں کہ تاش کھیلتے تھے، یا شطرنج کھیلا جاتا تھا، مجھے بہت ناگوار گزرتا تھا میں نے شبیر چچا سے عرض کیا کہ میں محلّہ کی مسجد میں جمعہ کے بعد بیان کروں گا، آپ اعلان کر دینا، جمعہ کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا، لوگ ٹھہر گئے، میں نے خطبۂ مسنونہ کے بعد آیت تلاوت کی اور بیان شروع کر دیا، لوگوں سے کہا کہ ایک تو ہم پر مصیبت آئی ہوئی ہے، دوسرے آپ لوگ بجائے خدا کی طرف رجوع کرنے کی رات بھر تاش کھیلتے ہو، شرم آنی چاہیے۔

اللہ کو یاد کرو، اس کا ذکر کرو، اور میں آپ کو ایک دعا بتاتا ہوں، صبح شام ہر ایک سات مرتبہ پڑھ لیا کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ

اگر کسی کو کوئی ہندوؤں سے گزند پہنچ جائے تو میری گردن پکڑ لینا۔

میری جوانی کا زمانہ تھا، میں نے بڑے جوش جذبے سے بیان کیا، لوگوں پر اس کا بڑا اثر ہوا، اور تاش وغیرہ کھیلنا بند ہو گیا، یہ بھی کہ اس کے بعد کوئی واقعہ ایسا پیش نہیں آیا، نہ ہی دوبارہ حملہ ہوا۔

میں نے اپنے چچا صاحب سے عرض کیا کہ ہمیں یہاں رہنے میں بڑی تکلیف ہے، کھانے پینے کی اشیاء نہیں ملتیں، اس لیے اگر آپ میرے مکان میں مٹیا محل چلیں تو زیادہ بہتر ہوگا، یہ مکان سڑک پر رسالہ جمالستان کے دفتر کے بالکل سامنے تھا، چنانچہ یہ تجویز مان لی گئی، وہاں جانے کی تیاریاں

شروع ہوئیں، کچھ اناج وغیرہ تھا، اس کو بھون کر اس کے ستّو بنا لیے گئے، گھر میں چکی تھی، اس میں پیس کر یہ کام کیا، کچھ اور اشیاء بنائی گئیں، پھر جو سامان چچا صاحب کا تھا، اس میں ضروری اشیاء لی گئیں، کپڑے بستر وغیرہ لیے، غرض سب کچھ لے کر ہم جامع مسجد پہنچ گئے، ظہیر احمد خان کا سب سامان ہوسٹل میں ختم ہو گیا، میں ایک دن ہمت کر کے نئی دہلی ٹیگور روڈ پر گیا تو ان کا مکان خالی پڑا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ وہ لوگ پاکستانی سفارت خانے چلے گئے، جہاں سے ان کو پاکستان روانہ کر دیا، میرا سارا سامان ہندوؤں نے لوٹ لیا تھا، الغرض ہم دونوں بھائیوں کے پاس سوائے جسم کے کپڑوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا، ہاں میری سائیکل ضرور میرے ساتھ تھی، اسی حالت میں جب میں ''جنگ'' اخبار کے دفتر گیا، اپنی تنخواہ وصول کرنے تو انہوں نے مجھ سے کہا ''راجہ''

یہ ہمارا آپس کا محاورہ تھا ایک دوسرے کو راجہ کہتے تھے، نقد رقم تو ہے نہیں بینک وغیرہ بھی بند ہیں، البتہ تنخواہ کا حساب کر کے نیوز پیپر آپ لے لیں، میں نے کہا ٹھیک ہے، مجھے اخباری کاغذ دیدیں، انہوں نے چالیس روپے فی رم کے حساب سے مجھے چھ رم دیے جو میں نے جامع مسجد پر الجمعیۃ اخبار کو پینتالس روپے فی رم کے حساب سے فروخت کر کے پیسے وصول کیے، اس حالت میں رقم ہاتھ آ جانا بہت بڑی نعمت تھی، ابھی ہم جامع مسجد پر رہ رہے تھے، یاں ہر طرف سے لوگ ہجرت کر کے آ رہے تھے، جو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اپنا ڈیرہ لگا لیتے تھے، لیکن وہاں سے دوسرے دن غائب ہو جاتے تھے، میں نے کبھی غور نہیں کیا، لیکن ایک دن شبیر چچا بہت دیر سے گھر آئے اور انہوں نے فرمایا کہ پرانے قلعے میں مہاجر کیمپ بن چکا ہے وہاں لوگ جا رہے ہیں، ان کو راشن وغیرہ بھی مل رہا ہے، اور انگریز یا امریکن فوجی حفاظت پر مامور ہیں، ہمیں وہاں چلنا چاہیے، میں نے کہا یہاں ہم سہولت سے رہ رہے ہیں وہاں ابھی جانا ٹھیک نہیں لیکن انہوں نے اصرار کیا، ہمارے دادا محمد نبی خان بھی ساتھ تھے کسی اور کا سامان تو تھا نہیں سوائے شبیر چچا کے، ان کا بہت سامان تھا، ایک گھوڑا گاڑی کرایہ پر انہوں نے لے کر سارا سامان صندوق وغیرہ اس پر لاد لیے، وہ خود ایک تانگے میں سوار ہو کر چچی صاحبہ اور بلال کو لے کر پرانا قلعہ چلے اور ہمیں یہ کہا کہ تم یہ سامان لے کر آ جاؤ، اس سامان کے اوپر ہم تینوں میں میرا بھائی اور میری دادی اماں کے بھائی محمد نبی صاحب

سوار ہو کر چل پڑے، ایک سامان بہت زیادہ تھا، دوسرے گھوڑا بالکل مریل تھا، چل کر ہی نہیں دے رہا تھا، جب ہم جامع مسجد سے گذر کر دریا گنج کی سڑک پر پہنچے تو دیکھا کہ سڑک کے ہر طرف ہندو کھڑے ہوئے ہیں، ہم اپنے دادا کو ماموں جی کہتے تھے، کیونکہ ہماری چچا والد صاحب سب کے وہ ماموں تھے، ہم بھی ماموں جی کہتے تھے، ان کا بولنے کا انداز یہ تھا کہ وہ ہر ایک کا پورا نام لیتے تھے، انہوں نے کہا بھئی ظہیر احمد خان یہ ہندو آئیں گے اور ہماری ٹوّا سی جان لے لیں گے، کیوں، کیا خیال ہے؟ اور یہ سامان وغیرہ لوٹ لیں گے، وہ بار بار یہی کچھ کہہ رہے تھے، یہ دونوں اگلے حصے پر بیٹھے تھے اور میں ان کے پیچھے تھا، میں نے کہا ماموں جی اللہ کو یاد کرو، کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں گے، وہ فرمانے لگے ہاں ٹھیک ہے، مگر جو حالت سامنے ہے اور یہ کم بخت مریل گھوڑا جو چل کر نہیں دے رہا، یہ شبیر احمد خان احمق نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ گھوڑے میں جان بھی ہے یا نہیں، بس ہمیں مروانے کو اس پر بٹھا دیا، اب کیا ہوسکتا ہے؟ یہ ہماری ٹوّا سی جان مفت میں چلی جائے گی، اب بیچارا ظہیر کیا کہتا، سوائے اس کے کہ ہاں ماموں جی جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، ٹھیک ہے، میں ان کو تسلی دیتا رہا، پھر ایک جگہ جہاں کچھ سکھ اور ہندو کھڑے تھے انہوں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو، میں نے جواب میں کہا: پاکستان جا رہے ہیں۔

انہوں نے کہا وہاں تک پہنچ جاؤ گے؟ میں نے جواب میں کہا، ہاں ہم وہاں ضرور پہنچ جائیں گے۔

انہوں نے کہا پاکستان والوں کو ہمارا سلام کہنا، میں نے کہا: ضرور۔

غرض یہ وقت گذر گیا اور ہم دہلی گیٹ سے باہر نکل گئے اور صحیح سلامت پرانے قلعہ پہنچ گئے، وہاں شبیر چچا صاحب قلعے کے دروازے پر انتظار میں تھے، پہنچ گئے، ماموں جی نے ان کو بہت کچھ سنائی اب وہاں پر ایک جگہ منتخب کر کر کے عارضی شیٹوں کا گھر بنانا تھا، اس زمانے میں بارشیں مسلسل ہو رہی تھیں، یہ بھی ایک قسم کا عذاب تھا، کسی ٹھیکدار کی چادر کی شیٹیں لاکھوں کی تعداد میں پڑی ہوئی تھیں، جن کو کھڑا کر کے ان ہی شیٹوں کی چھت بنائی جا رہی تھیں، بہر حال ہم نے مل کر وہ شیلٹر تیار کر لیا۔

یہاں کیمپ کی حالت بہت خراب تھی، پاخانے پیشاب کی کوئی جگہ نہیں، قلعے کے آخری حصے میں جانا

پڑتا تھا، پھر کچھ بچے ،معذور لوگ وہ اپنی جگہ پر ہی رفعِ حاجت کررہے تھے، گندگی ہر طرف تھی، یہاں پر ایک بڑا کپ چاول کا راشن کے طور پر ملتا تھا،لکڑیاں ،جنگل سے لاؤ اور کھانا وغیرہ بناؤ، پانی کی یہ حالت تھی کہ ایک نلکا تھا،جس پر پورے قلعے کی لائن لگتی تھی، ہرایک کی بالٹی یا کوئی اور برتن لائن میں لگتا تھا، تین چار گھنٹے بعد نمبر آتا تھا،اس وقت تک کھڑے رہنا پڑتا تھا۔

ہرطرف گندگی کی وجہ سے بیماریاں پھیل گئی تھیں، ہیضہ، دست ، قے بدہضمی ، بخاری عام بیماریاں تھیں،اموات بھی روزانہ ہورہی تھیں،کوئی میڈیکل ایڈ وغیرہ بالکل نہیں تھی، دیکھتے دیکھتے قلعہ کے پچھلے حصہ میں ایک قبرستان بن گیا تھا،

ان دنوں میں ظہیر میاں کا پھر تقاضہ ہوا، میں دریا گنج جاؤں گا،ایک ڈاکٹر ہے وہ میری مدد کرے گا، میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے،تم یہ بھی کرکے دیکھ لو، حالانکہ حاصل کچھ نہیں ہوگا،سوائے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کے، چلوتم اکیلے نہیں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا، میں اس کو ساتھ لے کر اس ہندوڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا، وہ ڈاکٹر ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا کہ تم یہاں کیسے آ گئے؟ تمہارا سامان وغیرہ سب لُٹ گیا،اب وہاں کیا باقی ہے؟ پھراس نے کہا اب تم یہاں سے واپس کیسے جاؤ گے، میں نے اس کو جواب دیا ڈاکٹر جو آنا جانتے ہیں وہ واپس جانا بھی جانتے ہیں، ء،تم اس کی فکر مت کرو،اور میں نے ظہیر سے کہا دیکھ لیا تم انے اپنے ڈاکٹر کو! اچھا اب چلو یہاں سے۔

بہرحال وہاں سے ہم واپس ہوئے ،اور جیسے تیسے جامع مسجد پہنچ گئے، پھر وہاں سے قلعہ پہنچ گئے۔

میں نے یہ سوچا قلعے میں بیماریاں پھیل رہی ہیں،ان کے لئے دوائیں لے آؤں اور یہاں کے لوگوں کا علاج وغیرہ کروں، چنانچہ میں دوائیں خرید کرلے آیا اوراپنی جھونپڑی کے سامنے ہی دوائیاں لے کر بیٹھ گیا، اچانک شبیر چچا آئے اورانہوں نے کہا کہ لیاقت نہرو معاہدے کے تحت اسپیشل ٹرین چلنا شروع ہوگئی ہیں،اس کے لئے ٹکٹ کیمپ کمانڈر جاری کررہے ہیں،اب یہاں رہ کر کیا کرنا ہے؟ میں نے کہا میں کیمپ کمانڈر سے معلوم کرلوں پھر فیصلہ کریں گے، چنانچہ میں کیمپ کمانڈر کے پاس گیا اوراس سے معلوم کیا اس نے کہا یہ بالکل صحیح ہے، باقاعدہ حفاظتی انتظام

کیا گیا ہے ایک انگریز اور گورکھا بٹالین کے آدمی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے ہیں، ایک کانوائے بائی روڈ ساتھ چلتی ہے، ہوائی جہاز سے بھی نگرانی ہوتی ہے، جو اب تک اسپیشل ٹرین گئی ہیں وہ خیریت سے پہنچ گئیں ہیں، جب مجھے اطمینان ہوگیا تو ٹکٹ لے لئے گئے اور واپس آ کر میں نے کہا آپ سب لوگ چلے جائیں میں بعد میں آؤں گا، چونکہ گھر والوں کی بھی کوئی خبر نہیں ہے کہ اس میں کوئی بچا ہے یا نہیں، یہ تو اطلاع مل گئی تھی وہ لوگ شہید ہوگئے ہیں لیکن تفصیل معلوم نہیں تھی، بہر حال وہ لوگ جانے کے لئے تیار ہوگئے، وہاں گاڑی کا بندوبست ہوا، سامان وغیرہ لاد لیا گیا، جب سب جانے لگے تو اچانک مجھے خیال ہوا کہ میں اکیلا رہ جاؤں گا نہ جانے ان کے ساتھ کیا معاملات پیش آئیں گے اور میرے ساتھ کیا؟ اب یہ دوائیں اور عرقیات جو خرید کرلایا تھا بس یہ نقصان جو کچھ ہوا ہوگیا، میں نے کہا میں بھی ساتھ چل رہا ہوں، سب خوش ہوگئے اور میں ساتھ چل پڑا، ہم نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے، یہاں جو کچھ منظر سامنے آیا وہ بہت عجیب تھا، ریلوے لائن کے دونوں طرف لوگ پڑے ہوئے تھے، پلیٹ فارم لوگوں سے بھرا ہوا تھا، کیسے ٹکٹ اور کیسا قانون، جیسے ٹرین آئی سب کے سب نے ہلا بول دیا، سوار ہونا شروع ہوگئے، ہمارے چچا صاحب ایک ڈبے میں سوار ہوئے، ان کو لوگوں نے دھکیل کر کسی سیٹ پر گرا دیا، ان کی شکل ہی نظر نہیں آئی، ہم آواز لگاتے رہے، آخر مجبور ہوکر میں ایک ڈبے میں زبردستی سوار ہوا اور جو لوگ دروازے پر تھے ان کو طاقت سے باہر دھکیل دیا، نہ جانے کون سی طاقت میرے اندر آ گئی، لوگوں نے پوچھا آپ کیا چاہتے ہیں، میں نے کہا، ہمارا سامان اوپر آئے گا، ایک عدد ہمارا ایک عدد تمہارا باری باری ایسا ہوگا، میں نے ظہیر سے کہا مجھے سامان پکڑاؤ، چچا صاحب کے بھاری بھاری بکس تھے، بڑی مشکل سے ظہیر نے مجھے پکڑایا، بکس کا کنڈا میں نے اوپر کھینچا، لیکن اس کے بعد آدھا گھنٹہ تک وہ بکس میں اٹھائے رہا، نہ اس کو اندر کرسکتا تھا نہ اس کو چھوڑ سکتا تھا، آدھے گھنٹے بعد اس کو کھینچ کر اندر کرسکا، پھر اس کے بعد سمجھوتہ ہوگیا، اور باری باری سامان سب اوپر آ گیا، اب ظہیر، ماموں جی، چچی صاحبہ، بلال میاں سب اوپر آ گئے، لیکن بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، بڑی مشکل سے سامان ٹھیک کرکے اس پر بیٹھ گئے، پھر میں نے اتر کر چچا صاحب کو آواز دی وہ دروازے پر آئے

Contact us: idaraghufran@yahoo.com Ph: +92515507530

اور معذرت سے کہا مجھے لوگوں نے دھکیل کر ڈال دیا تھا، میں نے کہا اب تم چچی صاحبہ اور بلال کو اپنے پاس لے لو اور ماموں جی کو بھی، چونکہ ہمارے پاس جگہ بالکل نہیں ہے، انہوں نے لوگوں سے معلوم کر کے ان کو اپنے پاس لے لیا، ان کے پاس کافی جگہ تھی، پھر میں اور ظہیر ہم سامان پر بیٹھ گئے، لیکن بہت مشکل سے، ہمارے ساتھ جتنے بھی سوار تھے وہ سب میواتی تھے اور وہ اپنی میواتی میں بات چیت کر رہے تھے، ایک بڑے میاں اوپر کی برتھ پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس پانی سے بھری ہوئی مشک تھی، ایک کٹورہ تھا، اس کو بھر کر وہ اپنے آدمیوں کو پانی پلا رہے تھے، پیاس ہمیں بھی بہت لگی ہوئی تھی، ظہیر نے کہا پیاس بہت لگ رہی ہے، میں نے کہا میواتی سے پانی لے کر دیتا ہوں، اس نے کہا میں مر جاؤں گا لیکن یہ پانی نہیں پیوں گا، اس کے گندے ہاتھ ہیں، اس سے ناک بھی صاف کر رہا ہے اور پانی بھی پلا رہا ہے، اب مسئلہ یہ تھا کہ پانی کیسے حاصل کیا جائے، خیال آیا میری عرق گاؤزبان عرق بادیان کی بوتلیں سامان میں ہیں لیکن وہ سامان میں دبی ہوئی تھیں، بڑی مشکل سے لوگوں کو کھڑا کر کے نیچے سے وہ نکالی گئی، اس عرق کے دو دو گھونٹ لے کر ہم پیاس بجھاتے رہے، اسپشل ٹرین کی یہ حالت تھی کہ اس کی تمام کھڑکیوں پر لوہے کے جنگلے لگے ہوئے تھے، صرف دروازے سے باہر جا سکتے تھے، پھر باتھ روم میں اوپر تک سامان بھرا ہوا تھا، رفع حاجت کی کوئی جگہ نہیں تھی، میرے ساتھ ایک میواتن بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنے بچے کو پاخانہ کروایا اور اپنے ڈوپٹے سے صاف کر کے ڈوپٹہ کمر کے پیچھے ڈال لیا اور میری کمر کا سہارا لے بیٹھ گئی، تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کوئی گیلی چیز کمر سے لگی ہوئی ہے، ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ پاخانہ تھا جو بچے نے کیا تھا، اب آپ اندازہ لگائیے میری کیا حالت ہوئی ہوگی، بہت پریشان تھا، اتفاق سے ٹرین ایک جگہ رکی میں نے دروازے سے چھلانگ لگائی اور جو پانی تالاب کی طرح تھا اس میں قمیص اتار کر جسم دھویا اور قمیص دھوئی، پھر وہ گیلی قمیص پہن کر اوپر آیا اور اس میواتن سے درخواست کی کہ مہربانی کر کے میری کمر کا سہارا نہ لو، ایک میواتی سے پوچھا بھئی تمہارے خاندان کے کوئی آدمی مرے نہیں تم پر حملہ ہوا ہوگا؟ جواب میں اس نے میواتی زبان میں کہا ”آدمین عورتان کی کیا پوچھو ہو؟ ہم تو کھیتن کے کھیتن چھوڑ کر چلے آئے ہیں“ ان کو آدمیوں کا غم نہیں تھا بلکہ اپنے کھیتوں کا غم

تھا۔

بہر حال ٹرین چلی اور پانی پت کے اسٹیشن پر جا کر کھڑی ہوگئی، ہم لوگ کسی جگہ سے سر نکال کر نہیں دیکھ سکتے تھے، اس پوری ٹرین کی شکل یہ تھی کہ ایک انگریز جو غالباً کیپٹن تھا وہ کمان کر رہا تھا بہت لمبی ٹرین تھی، پانچ چھ ڈبوں کے بعد ایک مال گاڑی کا کھلا ڈبہ تھا اس پر ایک ٹینک رکھا ہوا تھا، ان سب پر نیپالی گورکھے متعین تھے، باقی آرمی کس کس جگہ تھی معلوم نہیں، اور وہ کپٹن ہر طرف دوڑ رہا تھا اور اس نے میگا فون سے اعلان کرایا تھا کہ کوئی شخص باہر نہ نکلے نہ جسم کا کوئی حصہ باہر نکالے، پھر کچھ لوگ باہر نکل پڑے تھے، معلوم ہوا کہ سامنے بلوائی ہندو اور سکھ کھڑے ہیں اور ٹرین پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، وہ کپٹن ان سے بات کرنے گیا اور ان کو اس نے منتشر ہونے کو کہا، لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوئے، مجبوراً اس انگریز کیپٹن نے اپنی مشین گن جو اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی اس سے فائر کھول دیا نتیجے میں دو تین آدمی مرے باقی بھاگ گئے۔

فائر کی آواز کے بعد کچھ دیر ٹرین اسی جگہ رہی پھر اچانک واپس الٹی چلنے لگی، جب کافی دیر چلتی رہی تو ہم سمجھے یہ واپس دلّی جا رہی ہے، لیکن وہ ایک اسٹیشن جس کا نام گھروندا تھا رک گئی اس کے بعد اعلان ہوا، سامان وغیرہ ڈبوں میں چھوڑ دو، سوائے کھانے پینے کی اشیاء کے، اور نیچے اتر کر سامنے عیدگاہ ہے وہاں کیمپ لگا لو، سب لوگ نیچے اتر گئے اور میدان میں پھیل گئے، گاؤں کے مسلمانوں نے بہت لوگوں کی خدمت کی، لیکن افسوس جیسے ہی وہ کھانا لے کر آتے تھے لوگ ایک دم حملہ کر کے ان سے وہ سب کچھ چھین لیتے تھے، پھر ہمیں وہ قیمتاً فروخت کرتے تھے، آپ اندازہ لگائیں موت زندگی کی کشمکش میں چل رہے ہیں اور حالت اخلاق کی یہ ہے، حالانکہ وہ سگریٹ مشروب سب کچھ لائے مگر سب کا یہی حشر ہوا، اسی دوران کیپٹن راؤنڈ لگاتا ہوا ہمارے پاس سے گذرا، ظہیر میاں فوج میں نوکری کر چکے تھے مجھے کہنے لگے بھائی صاحب یہ انگریز سکینڈ رائل لانسرز کا کیپٹن ہے میں نے اس کے بیج دیکھ لئے ہیں، میں نے کہا تم صحیح کہہ رہے ہو، کہنے لگا بالکل صحیح، میں اس کے پاس گیا اور میں نے انگریزی میں اس سے معلوم کیا کہ آپ کا تعلق سکینڈ رائل لانسرز سے ہے؟ اس نے کہا ہاں میرا تعلق اسی سے ہے، میں نے پھر کہا آپ رسالدار رفیق احمد خان کو جانتے ہیں وہ میرے چچا

ہوتے ہیں، اس نے کہا بالکل جانتا ہوں، تم کہاں ہو؟ میں نے وہ جگہ بتائی، اس کے بعد غالباً ایک یا دو گھنٹے بعد وہ آیا اور مجھے کہا کہ آپ اپنے ڈبے میں چلے جائیں، روانگی کا اعلان ہونے والا ہے، اس کے بعد فوجی بگل بجا، تو ظہیر احمد خان نے کہا یہ جانے کی تیاری کا اعلان ہے، بہرحال ہم رات کے اندھیرے میں بڑی مشکل سے اپنے ڈبے تک پہنچے اور اس میں سوار ہوئے، وہ کیپٹن بھی ہمارا ڈبہ دیکھنے آیا تھا اور بعد میں وہ ہمارے لئے کچھ بسکٹ اور پانی وغیرہ لے آیا اور خیریت معلوم کی، اس کے بعد ہم امرتسر پہنچے یہاں بھی حالت خراب تھی، جوں توں یہاں سے روانہ ہوکر پانچویں دن پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے، اللہ کا شکر ادا کیا، دل کھول کر مشروبات اور کھانے کی اشیاء خرید کر استعمال کیں، پھر وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہوئے، راستے میں ہمیں بہت اصرار کیا کہ آپ یہاں اتر جائیں آپ کو یہاں آباد کیا جائے گا، ہر قسم کی سہولت یہاں موجود ہے مگر ہم نے قبول نہیں کیا، ہماری پھوپھی صاحبہ کراچی میں پہنچ چکی تھیں اور ہمارے لئے وہی ہماری منزل تھی، میرے چھوٹے بھائی زبیر احمد خان بھی وہاں پر موجود تھے اور وہ ٹیلیفون کے محکمے میں ملازم ہو چکے تھے۔

یہاں پھوپھی صاحبہ کے ہاں رسالدار صغیر احمد خان بھی پہنچ گئے تھے، اس وقت وہ اور میجر نصیر احمد خان بھی آ چکے تھے تیسرے شبیر احمد خان بھی پہنچ گئے، اس طرح ہم تین بھائی میں اور ظہیر احمد خان اور زبیر احمد خان ایک جگہ ہو گئے تھے، پھر کچھ دنوں بعد میری بہن بھی کھوکھرا پار کے راستے جے پور سے ہمارے عزیزوں کے یہاں پہنچ گئیں۔

یہ ہے وہ داستان جو میری اور دیگر اعزہ کی پاکستان آمد کی ہے، جب پاکستان بنا تو دونوں بھائی جوان تھے ایک بھائی جواب معذور ہیں زبیر احمد خان ان کو تو پہلے میں نے بھیج دیا تھا کہ تم ملازمت پاکستان جا کر کرو، انہوں نے کہا میں نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ سے تو اجازت لی نہیں ہے میں تو ویسے ہی آپ کے پاس ملنے آیا تھا، بہرحال وہ یہاں آ گئے، ان کو میں نے یہ کہہ کر کہ والد صاحب سے میں اجازت لے لوں گا تم ابھی پھوپھی صاحبہ کے ساتھ پاکستان چلے جاؤ، ان سے بڑے ظہیر احمد خان جو انگلینڈ میں ہیں، یہ دہلی میں میرے پاس تھے، میں جس وقت پاکستان

آیا ہوں تو یہ میرے ساتھ تھے اور اس پورے بحران میں بھی میرے ساتھ رہے، بہن کا یہ ہوا کہ مہندر گڑھ پر حملہ ہوا اور وہاں سے مسلمانوں کو نکالا گیا تو اس وقت والد صاحب کو آواز دے کر سب سے پہلے ان کو گولی ماری تھی، وہ سب سے پہلے شہید ہوئے، وہ اصل میں وہاں کی مسلم لیگ کے صدر تھے، اور تمام مسلمانوں کو وہاں جمع کرنا اور ان کی تنظیم وغیرہ بنانا، ان سب کاموں میں وہ سب سے زیادہ ہی فعال تھے، اور رات کو جیسے ہی ان کو آواز دے کر باہر نکالا اسی وقت گولی ماردی وہ باہر گر گئے، پھر تو اس حملہ میں عورتیں مرد سب مارے گئے، یہ بہن چھوٹی سی تھی اس وقت، یہ لاشوں میں دب کر وہیں پڑی رہی، جب سکھ لوٹ مار کر کے چلے گئے، دن میں جب کوئی وہاں سے گذرا تو اس نے اس کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ شاید یہ زندہ ہے، اس کے ایک کلہاڑی لگی ہوئی تھی، بہر حال وہ اٹھا کر لے گئے، اور اس نے کھوکھرا پار کے راستہ سے حیدر آباد پہنچایا، میں تو اسے لینے کے لئے جالندھر کے راستہ لاہور چلا گیا تھا، لیکن وہیں مجھے اطلاع ملی کہ وہ یہاں پہنچ گئی ہے، اس طریقہ سے ایک بہن اور ہم تین بھائی پاکستان آئے، میری اور مجھ سے جو چھوٹے ہیں ہم دونوں کی شادی وہیں ہندوستان میں ہوگئی تھی، ان کی شادی میرے منشی چچا صاحب شہید کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو مہندر گڑھ حملے کے وقت وہیں پر شہید ہوگئی، میری بیوی شہید نہیں ہوئی بلکہ اس واقعہ سے قبل ہی اس کا انتقال ہوگیا تھا، اور تیسرے بھائی کی شادی وہاں نہیں ہوئی، بلکہ پاکستان آنے کے بعد کرنل ممتاز علی خان صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی۔

پاکستان ہجرت کے بعد

ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور پہنچا، لاہور سے کراچی گیا، وہاں کچھ عرصہ سکونت رہی، پھر وہاں سے سرگودھا، سرگودھا سے لاہور، لاہور سے بنوں، بنوں سے پشاور اور پشاور سے حیدر آباد مختلف زمانوں میں نقل مکانی ہوتی رہی، اب حیدر آباد اور کراچی میں ہی طویل عرصہ سے مقیم ہوں، راولپنڈی میں بھی میرے اعزہ اور ارادت مندوں کا حلقہ ہے، اس لئے راولپنڈی بھی وقتاً فوقتاً آنا ہوتا رہتا ہے۔

یہاں میں یہ بات بتا تا چلوں کہ فراغت کے بعد ابتدائی زمانہ میں یہ تاثر میرے اوپر چھا گیا کہ نعوذ باللہ ہمارے فارغ التحصیل طلبہ معاشرے میں کسی کام کے نہیں ہیں، کہیں نوکری ان کو نہیں ملتی، کوئی یہ کام نہیں کر سکتے، اور یہ بہت ِگرا ہوا طبقہ ہے جنہوں نے مفت کی روٹی کھا کر تعلیم حاصل کی ہے، اور یہ چند پیسوں میں اپنا دین بیچ دیں گے جہاں ان کو موقع ملے گا یہ تاثر میرے ذہن پر تھا۔

یہ تاثر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مجھے مولوی یا حافظ کہلانا ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مجھے گالی دے رہا ہے، اس کا دماغ پر ایک عجیب اثر تھا، اور اس اثر کے تحت میں نے ایک زمانے میں داڑھی بھی کٹا ڈالی تھی، لیکن یہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے یا ابا جی رحمہ اللہ کی دعائیں سمجھ لیجئے یا حضرت کے سلسلہ کی برکت سمجھ لیجئے کہ میں اس حالت میں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکا، اور میری بہت جلدی طبیعت بحال ہو کر یہ چیزیں دماغ سے نکل گئیں، ورنہ شیطان اپنی جگہ پورا کام کر چکا تھا، ابا جی رحمہ اللہ نے تو یہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں نے جو راستہ تمہارے لئے تجویز کیا ہے اس راستہ کو تم چھوڑ نہیں سکتے، تمہیں اسی راستہ پر چلنا ہوگا جو میں نے تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے، ہاں دو چار دن کا کھیل ہے جب تک تم کھیلنا چاہو کھیل لو۔

میرے ساتھ دو باتیں بزرگوں کی طرف سے ہیں پہلی بات تو یہ کہ ایک بات تو ذہن نے کبھی قبول نہیں کی کہ میں نے اپنے آپ کو مخرّبِ اخلاق صحبتوں میں یا غلط آدمیوں میں شامل کر لیا ہو یا اپنے اخلاق پر کسی قسم کا اثر قبول کیا ہو، یہ کبھی نہیں ہوا، بری عادت اختیار کرنا یا اس کو سوچنا یہ کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا، الحمد للہ، ہاں یہ ضرور ہوا کہ کچھ عرصہ میں نے فیشن اختیار کیا، کپڑے انگریزی قسم کے پہنے، لیکن نہ بری صحبتیں نہ برے اعمال، ان کی طرف رغبت کبھی نہیں ہوئی، اور ابتدائی زمانہ میں نمازیں ضرور قضا ہو جاتی تھیں لیکن طبیعت نے یہ کبھی قبول نہیں کیا کہ نماز چھوڑ دی جائے یا اس کی کوئی حقیقت نہیں، یہ کبھی نہیں ہوا۔

البتہ یہ ضرور ہوا کہ کافی عرصہ تک تلاوت میں نہیں کر سکا، اور چونکہ وہ میرا شروع کا یاد کیا ہوا تھا، میں سب بھول بھال گیا۔

جس وقت میں پاکستان بننے کے بعد بنوں پہنچا تو بنوں میں مجھے بہت عزت بھی ملی۔

منشی فاضل کا امتحان تو میں پارٹیشن سے پہلے دھلی میں ہی دے چکا تھا، یہاں بنوں میں انگش آنرز (خالص انگریزی) میں میٹرک پاس کیا اور بعد میں ایف اے بھی کیا، اور طب کے شعبے سے تو دھلی میں قیام کے زمانے میں ہی مجھے کچھ مناسبت ہوگئی تھی، اس کے بعد بنوں میں قیام کے زمانے میں ہومیو پیتھک کا کورس کیا اور اس میں امتحان دے کر سند بھی حاصل کی جس کے بعد اس شعبے سے وابستگی رہی، اور اسی وجہ سے میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

لیکن بنوں میں قیام کے دوران میں بہت زیادہ پریشان بھی ہوا، میں ایک روز ایسے ہی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا، جیسے آدمی دوسرے سے آواز سے بات کرتا ہے، بالکل اسی طرح بات یہ کررہا تھا کہ واہ! اباجی رحمہ اللہ آپ نے مجھ سے تو یہ فرمایا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد تمہارے حالات بہت اچھے ہوجائیں گے اور تم بہت بڑے آدمی بنوگے، بڑے امیر کبیر ہوگے اور دنیا میں تمہارا نام ہوگا، میں نے کہا آپ مجھے یہ امارت دینا چاہ رہے ہیں، آج کل تو میں اتنی پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہوں۔ اپنے طور پر یہ میں بات کررہا تھا۔

کہ اچانک مجھے یہ محسوس ہوا جیسے اباجی رحمہ اللہ سامنے آگئے، اور انہوں نے وہی الفاظ زور دے کر فرمائے کہ جس راستے پر ہم نے تمہیں ڈالا ہے اسی راستہ پر تمہیں آنا پڑے گا، ورنہ تمہاری یہ پریشانیاں جانہیں سکتیں، یہ میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں، اسی وقت میں نے کہا میں آگیا، اس کے بعد میں سیدھا غسل خانہ گیا ہوں، غسل کرکے میں نے دو رکعت نماز پڑھی، توبہ کی کہ آج سے میں تمام جتنی بھی فضول باتیں ہیں اور غیر شرعی کام ہیں سب چھوڑتا ہوں۔

اس کے بعد میں نے اپنے طور پر پرائیویٹ تعلیم حاصل کی، ان میں سے میں منشی فاضل کا امتحان تو ہندوستان میں ہی پاس کرچکا تھا، اور میٹرک میں نے بنوں میں آکر کرلیا تھا، پھر مجھے یہ خیال آیا کہ میٹرک کے لئے میں نے اتنی بھاگ دوڑ کرلی ہے اس میں کامیاب ہوگیا میں حفظِ قرآن کے لئے کچھ نہیں کرسکتا، یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔

میں اس زمانے میں وہاں بنوں میں لیڈر تھا، تمام مہاجروں کا صدر تھا، تقریباً رات بارہ بجے تک تو ویسے ہی ہماری عدالت لگی رہتی تھی، یہ کام وہ کام اُن سے ملاقات، اِن سے ملاقات، اس

افسر کے پاس جانا ہے، اُس افسر سے یہ بات کرنی ہے، آج یہ جلسہ ہے، یہ پروگرام ہے، بارہ بجے کے بعد جب میں گھر آتا تو میں نے اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ جب تک پاؤ سپارہ یاد نہیں کروں گا، اس وقت تک میں سوؤں گا نہیں، چاہے دو بج جائیں، یا تین یا چار بج جائیں، بس یوں کر کے میں نے قرآن مجید اس سال یاد کیا، اور اسی سال میں نے سنایا، ہندوستان کے دو تین محرابوں کے بعد یہ پہلی محراب میں نے بنوں میں سنائی، اور اپنے گھر ہی میں بندوبست کیا، وہاں پر اپنے دوستوں کو بلا کر ان میں ایک دو حافظ بھی تھے سنایا، اس کے بعد دوسرے سال پھر مسجد میں، پہلے سال یہ تامل تھا کہ شاید میری داڑھی چھوٹی ہے کوئی اعتراض نہ کرے، اس کے بعد یہ تامل ختم ہوگیا، بحمد اللہ اس کے بعد سے تراویح میں سنا ہی رہا ہوں۔

ہاں یہ ضرور تھا کہ بغیر دیکھے میں منزل نہیں پڑھ سکتا تھا، جب جی چاہا اور جتنا جی چاہا پڑھ لیا، اس کی مداومت اور عادت مجھے نہیں تھی، بلکہ یہ تھا کہ میں دیکھ کر تلاوت کرتا تھا، اگرچہ یاد سے سنا رہا ہوں لیکن دیکھ کر پڑھتا تھا، لیکن بعد میں اچانک یہ خیال آیا کہ یہ چیز ہونی چاہئے، چنانچہ اس کو یاد سے پڑھنا شروع کیا، اور اس وجہ سے نہیں پڑھتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلط پڑھ جاؤں، میں نے کہا غلطی ہوگی تو بعد میں درست ہو جائے گی، پڑھنا تو چاہئے، پھر وہ پڑھنا شروع کیا۔

اس کے بعد اب میرا معمول یہ ہے کہ میں صرف قرآن مجید رمضان میں کھول کر دیکھتا ہوں، باقی تو بغیر دیکھے ہی پڑھتا ہوں، اب یہ آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب میں کراچی سے حیدرآباد کے لئے چلتا ہوں اور حیدرآباد سے کراچی کے لئے تو تقریباً پندرہ سپارے کا میرا معمول ہے، ساڑھے سات پارے آتے ہوئے اور ساڑھے سات جاتے ہوئے، پندرہ سپاروں کا تو یہ معمول صرف ایک دن کا ہے اور باقی کے لئے اب میرا معمول یہ ہے کہ عشاء کے بعد کھانے سے فراغت کے بعد ٹہلتا ہوں، اور اس ٹہلنے میں ڈیڑھ دو سپارے پورے کر لیتا ہوں، باقی دن میں اسطرح ہر ہفتہ میں ایک قرآن مجید ختم ہو جاتا ہے، پہلے یہ بات نہیں تھی۔

اب اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہیں کہ یہ سب کچھ میرے ابا جی رحمہ اللہ کی دعاؤں کا صدقہ ہے وہ یہ فرماتے تھے کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں میں نے تمہارے لئے دعا نہیں کی ہو میں نے ہر رات

تمہارے لئے دعا کی میں نے خانہ کعبہ میں جا کر تمہارے لئے دعا کی، میں نے کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کی، منیٰ میں کی مزدلفہ میں کی، عرفات میں کی، حضورﷺ کے روضہ مبارک پر کی، کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں میں نے تمہارے لئے دعا نہ کی ہو، اور اُس وقت مجھ سے میرے ابا جی رحمہ اللہ نے بڑے جذبہ میں یہ فرمایا تھا کہ دوست محمد کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی، یہ سب ہی قبول دعائیں ہیں، تم یہ راستہ نہیں چھوڑ سکتے جو میں نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے، ایک مرتبہ تو اپنی حیات میں یہ فرمایا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت فرمایا جب وہ میرے خیال کے سامنے آئے، وہ دن اور آج کا دن ہے الحمدللہ اسی پر ہوں، لیکن اس حالت سے بھی بہت سے تجربے ہو گئے۔

میرے دادا کے بھائی شیر احمد خان اور اُن کی اولاد

میرے ابا جی رحمہ اللہ کے بڑے بھائی شیر احمد خاں تھے، جو ہمارے گھر کے برابر میں رہتے تھے، بہت دیندار تھے، یہ میرے ابا جی رحمہ اللہ کے بڑے بھائی تھے، تھے وہ کچھ اہلِ حدیث، لیکن ان کی طبیعت میں بڑا اعتدال تھا، آج کل کی طرح کے اہلِ حدیث نہیں تھے، ان کی وجہ سے ہمارے گھر میں شرک وبدعت کی باتیں شروع سے نہیں تھیں، اورانہوں نے ہماری رعایت رکھتے ہوئے بہشتی زیور اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی دیگر کتابیں ہمارے گھر میں پہنچا دیں، اور بچیوں کو پڑھانا شروع کر دیا، چنانچہ بہشتی زیور میری والدہ نے اور میری خالاؤں، میری چچیوں نے شادی ہونے کے بعد ان ہی سے پڑھا، اور کلامِ مجید بھی انہوں نے ہی پڑھایا، ہم سب ان کو بڑے ابا کہتے تھے، ان کا اسمِ گرامی شیر احمد خاں تھا۔

ان کے تین صاحبزادے بڑے شریف احمد خان جو جوانی میں انتقال کر گئے، ان کی اولاد میں ایک صاحبزادی جن کا نام مریم تھا، باقی کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسرے نمبر پر فضل احمد خان جن کو ہم سپڑو چچا کہتے تھے، ان کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی اور ان کی بیوی تقسیم کے وقت شہید ہو گئیں، پاکستان آ کر انہوں نے دوسری شادی کی، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے جن کا نام مزمل خان ہے حیات ہیں، اور صاحبِ اولاد ہیں، ایک صاحبزادی ہیں وہ بھی حیات ہیں، تیسرے نمبر پر

عبدالحیٔ خان تھے، ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، دہلی میں بچپن میں میرے اورظہیر احمد خان کے ساتھ رہتے تھے، جوانی میں وفات ہوئی، ان کی صرف ایک بچی تھی، جس کا اب کچھ معلوم نہیں۔

میرے اہل وعیال

میرے گھر میں اس وقت دوسری بیوی ہیں، اُن سے پہلی بیوی سے ایک لڑکا دولڑکیاں ہوئیں لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی وفات پا گئی تھیں اور لڑکا جس کا نام تبشیر احمد تھا، وہ چار پانچ مہینے کی عمر میں فوت ہوگیا تھا۔

میری دوسری یعنی موجودہ بیوی سے کوئی نسبی اولاد نہیں، میرا ایک متبنیٰ ہے، جس کا نام ناصر محمود ہے۔

ناصر میرا نسبی بیٹا نہیں بلکہ میرا متبنیٰ ہے، جو بنوں ہسپتال میں ایک قبائلی عورت کے آپریشن سے پیدا ہوا تھا اور وہ عورت اس کی ولادت کے دوران فوت ہوگئی تھی، اور ڈاکٹر جسے میری اولاد نہ ہونے کا علم تھا، اس نے وہ بچہ میرے حوالے کردیا، اُس وقت یہ بالکل بے ہوش تھا، بعد میں ہوش آیا اور اس کی پرورش میرے یہاں ہوئی اور اب ماشاء اللہ OGDC میں افسر ہے اور آج کل حیدرآباد میں میرے ساتھ رہتا ہے، اُس کے اولاد بھی ہے؛ بڑا بیٹا محمد نصیر خان، اور اس سے چھوٹا عزیر احمد خان اور اس سے چھوٹا عمیر احمد خان اور دو بچیاں ہیں۔

میرے بہن بھائیوں کی تفصیل

میرے دو بھائی جوان تھے وہ ہندوستان میں فسادات کے زمانے میں شہید ہوئے، مشیر احمد خان، اور عزیر احمد خان، ایک آٹھویں میں پڑھتا تھا اور دوسرا دسویں میں، یہ دونوں والد صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ شہید ہوگئے تھے، ایک بہن لاشوں میں دب کر بچ گئی تھی بعد میں یہاں پاکستان آ گئی تھی، یہ ایک ہی بہن تھی، اور یہ اوپر سے سلسلہ چلا آ رہا ہے، والد صاحب کے بھائیوں میں ایک بہن، اس کے بعد کوئی نہیں پیدا ہوئی سب لڑکے ہوئے، پھر میرے بھائیوں میں تمام اولاد ہوئی، ان میں بھی ایک لڑکی ہوئی وہ بھی بڑی دعاؤں کے بعد تب ہوئی، وہ پاکستان زخمی حالت میں

آئی اس کے سر پر برچھی لگی ہوئی تھی وہ اب بھی الحمدللہ حیات ہیں ان کا نام فُضیلہ ہے، ان کی تو میرے پھوپھی زاد بھائی منصور احمد خان سے نسبت ہے، اور میں نے ہی یہاں پاکستان آ کر اس کی شادی کی ہے وہ یہاں آ کر ہی جوان ہوئیں، منصور احمد خان ان کے شوہر ہیں، جن کا اب انتقال ہو چکا ہے۔

ایک میرے حقیقی بھائی ظہیر احمد خان ہیں اب سے تقریباً بارہ سال سے انگلینڈ (لندن) میں ہیں، وہ شروع میں پہلے دو تین مرتبہ ایران گئے، اس کے بعد وہ انگلینڈ چلے گئے، وہیں کی ان کو قومیت ملی ہوئی ہے، ان کا ایک لڑکا بھی ہے وہ بھی وہیں ہے، اس کا نام طارق مسعود ہے، اس کی وہاں شادی بھی ہوگئی ہے، اب دو تین بچے بھی ہیں، وہ یہیں سے گیا تھا۔

میرے دوسرے بھائی زبیر احمد خان جو یہاں سرگودھا میں ہیں ان کو میں نے یہاں حیدر آباد بلا کر ملازم کرا دیا تھا ٹھٹہ شوگر مل میں، اور ان کا مجھ سے بہت تقاضا تھا کہ مجھے موٹر سائیکل دلوا دو، انہوں نے موٹر سائیکل لے لی، کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنی موٹر سائیکل پر یہاں حیدر آباد آ رہے تھے، راستہ میں ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور نہ جانے وہ کب تک ٹکرّ کے بعد سڑک پر پڑے رہے، یہاں ہسپتال میں لا کر پتہ نہیں کس نے ڈالا اور کب ڈالا، پھر انہوں نے کاغذات وغیرہ کو دیکھ کر مجھے اطلاع دی، اور اتفاق سے میں یہاں موجود نہیں تھا کراچی گیا ہوا تھا، میرا بیٹا ناصر (متبنیٰ) اور اس کی امی یہ ہسپتال گئے اور جا کر تلاش کیا تو پتہ چلا ان کے بہت زیادہ چوٹیں آئی ہوئی ہیں، آنکھیں بھی ان کی بالکل زخمی ہو چکی تھیں، منہ سارا زخمی تھا ناک زخمی تھی، سر پر بھی بہت زیادہ چوٹیں تھیں، چنانچہ وہ اٹھائیس دن بے ہوش رہے، اٹھائیس دن کے بعد انہوں نے کچھ آنکھ کھولی، اور جب انہیں ہوش آیا تو یہ کیفیت تھی کہ ان کی یادداشت غائب تھی، نہ اپنا نام جانتے تھے نہ کسی کو پہچانتے تھے، غرض یہاں سے لے کر ان کو کراچی کے ہسپتال میں داخل کر دیا تھا، اور ڈاکٹر بھٹی صاحب کا علاج رہا، ڈاکٹر بھٹی صاحب نے یہ کہا کہ ان کی یادداشت تو چلی گئی، لیکن ان کا ہاتھ بالکل ٹھیک نہیں ہوگا، یہ ہاتھ بے کار رہے گا، اور ان کی جو موجودہ یادداشت ہوگی وہ اتنی کمزور ہوگی کہ تھوڑی سی بات کہہ کر بھول جائیں گے، اسی کے مطابق ہوا، ان کا ہاتھ تو ویسے ہی ہے ابھی تک بے کار

ہے، پیر سے وہ تھوڑا بہت چل لیتے ہیں، پرانی یاداشت ساری آ گئی، نئی یاداشت بہت جلدی بھول جاتے ہیں، اس وقت معذور کی شکل میں ہیں، ان پر پر بہت ترس بھی آتا ہے، ان کے بڑے لڑکے آفاق احمد خان ہیں شادی شدہ ماشاء اللہ ان کے اولاد بھی ہے، دوسرے نمبر پر سہیل احمد خان ہیں یہ بھی شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں، تیسرے نمبر پر عمران احمد خان عرف پپل ہیں، یہ بھی صاحبِ اولاد ہیں، ان کی اہلیہ اور ان کے بچے ہیں، زبیر احمد خان کے تین لڑکے ہیں اور تینوں جوان ہیں، لڑکی بھی جوان ہے، پہلے ان کے یہاں دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایک ساتھ ہوئے تھے، وہ تو جوان ہو گئے، لڑکی کی شادی بھی ہو گئی، اور الحمد للہ بچے بھی ہو گئے، لڑکوں میں درمیانے والے کی شادی ہوئی ہے، ان کی صاحبزادی عادلہ جن کی شادی عبدالخالق صاحب جواب ریٹائرڈ کرنل اور سیمنٹ فیکٹری کے جنرل منیجر ہیں سے ہوئی۔

میرے ان دو بھائیوں کے علاوہ ایک بہن ہے جو اسلام آباد میں ہے، جس کا پہلے تذکرہ آ چکا ہے، میرے خاندان کے لوگ منتشر ہیں، زیادہ تر اسلام آباد میں ہیں، اکثریت ملازمت کے سلسلہ میں وہیں قیام پذیر ہے، میری بہن پھوپھی زاد بھائی سے بیاہی ہے وہ بھی وہیں ہے، غرض اس طرح پورا خاندان وہیں ہے، حیدر آباد میں بھی بہت رشتہ دار ہیں، اسی طرح کراچی میں بھی بہت ہیں۔

حضرت جلال آبادی سے تعلق وخلافت

مجھ پر زمانۂ طالبِ علمی سے ہی آخر تک حضرت کی توجہ، حضرت کی محبت، حضرت کی شفقت بہت زیادہ رہی۔

حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کے واقعات بندے نے ''تذکرۂ مسیح الامت'' نامی کتاب میں درج کرادیے ہیں۔

بنوں جیسی جگہ وہاں جب میں رہتا تھا، حضرت وہاں بھی تشریف لاتے تھے، اور اس وقت میرے ذہن میں یہ ہوتا تھا کہ حضرت سے یہاں کوئی نہ ملے، کسی سے آمد کا تذکرہ نہ کرو، بس زیادہ سے

زیادہ وقت میری اور حضرت کی گفتگو میں گذرے، اس لئے میں کسی کو بتاتا بھی نہیں تھا، بس حضرت کو گھر میں خود لئے ہوئے بیٹھا رہتا، اور حضرت کو میں نے یہ بات بتادی تھی، حضرت فرماتے ٹھیک ہے، مجھے اس میں بہت سکون مل رہا ہے بڑی عافیت ہے، یہی ٹھیک ہے، حضرت بھی اسی انداز سے رہتے تھے، میں بھی اسی انداز سے رہتا تھا، بس کچھ قریبی لوگ حاضر ہوجاتے تھے۔

اور جب میں بنوں چھاؤنی میں چلا گیا تو حضرت وہاں بھی تشریف لانے لگ گئے تھے، اور یہ گویا حضرت کا ایک انداز تھا، تعلق تھا، کہ حضرت نے اس کو بہت اہمیت کے ساتھ لوگوں سے بھی اس کا اظہار کیا، مجھ سے بھی اس کا اظہار کیا، اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت کو مجھ سے خصوصی تعلق ہے، اور جہاں تک سوال ہے حضرت کی طرف سے خلافت کا، تو مجھے تو کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ حضرت سے کوئی خلافت لینی ہے یا حضرت مجھے خلافت دیں گے۔

ایک سلسلہ کے بزرگ ہیں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم مجھ سے بیعت ہوجاؤ تو میں تمہیں اپنا گدی نشین، جانشین بنادوں گا، اور اپنی ساری خلافت تمہیں دے دوں گا، ان کو میں نے جواب دیا کہ جس جگہ میرا تعلق ہے میں جن سے بیعت ہوں، وہ اپنے مکان کے سامنے جہاں کتا بیٹھتا ہے اگر وہاں بیٹھنے کی بھی مجھے جگہ دیئے رکھیں تو وہ تمہاری جانشینی اور خلافت سے ہزار درجے افضل سمجھتا ہوں، اور یہ میں نے سارا قصہ حضرت کو لکھا، اس پر حضرت نے لکھا، الحمدللہ عظمتِ طریق اس سے ظاہر ہوتی ہے، بہر حال ہم نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ خلافت کے ہم بھی کبھی اہل ہونگے، یا ہمیں بھی یہ چیز کبھی ملے گی، یا ہمیں اس کی تمنا ہے، یہ بزرگوں کی اپنی شفقت اور کرم نوازی ہے۔

مجھے حضرت جلال آبادی رحمہ اللہ کی طرف سے خلافت فراغتِ تعلیم کے بہت بعد میں ملی ہے۔

۶۵ء کے بعد غالباً ۶۶ء میں۔

دراصل میں دورۂ حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ دیوبند میں رہا، یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی وفات کے ایک سال بعد میں دہلی آ گیا تھا، وہاں میں نے ملازمت وغیرہ کی اور وہیں دہلی میں پاکستان بننے تک مقیم رہا ہوں، میں اس دوران کاٹھیاوار کے علاقہ میں

بھی گیا ہوں اور گجرات کے علاقہ میں بھی۔

اور حضرت مولانا مسیح اللہ صاحب رحمہ اللہ سے خط وکتابت اس پورے عرصہ میں بہت مختصر رہی، کبھی سال میں ایک خط لکھ دیا، کبھی دو سال میں لکھ دیا اور کبھی کبھی یوں بھی لکھ دیا کرتا تھا کہ:

''مجھے یہ محسوس کبھی نہیں ہوا کہ آپ میرے دماغ سے غیر حاضر ہوئے ہوں، یا آپ سے میں متعلق نہ رہا ہوں، یا آپ کو یاد نہ کرتا رہا ہوں''

اس کے جواب میں حضرت نے یہ لکھا:

''علیٰ ہٰذا القیاس احقر کا بھی یہی حال ہے''

مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا لیکن اس کے بعد جب میں پاکستان آ گیا، پاکستان میں دو تین سال تو میں نے ایسے ہی گذارے، اس کے بعد میں بنوں چلا گیا اور بنوں جا کر میں نے مستقل سکونت اختیار کر لی، وہاں حضرت کا خط آیا (بنوں سے حضرت سے خط وکتابت شروع کر دی تھی) جس میں حضرت نے تحریر فرمایا کہ فلاں تاریخ کو میں پاکستان آ رہا ہوں، میں اس عبارت سے یہ اخذ نہ کر سکا کہ حضرت پاسپورٹ کے ذریعہ سے پاکستان آ رہے ہیں، بلکہ میں یہ سمجھا کہ حضرت ہجرت کر کے آ رہے ہیں، اور دماغ میں اس کا بڑا اثر ہوا کہ کس حالت میں آ رہے ہوں گے، کیا حضرت کے پاس ہوگا کیا نہیں، اور جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد میں قیام ہوگا، اور آئندہ پروگرام کی آپ کو اطلاع دی جائے گی، میں بہت پریشان ہوا، میں نے بہت سارے بستر باندھے اور بہت ساری چیزیں لیں، یہ لے وہ لے یہ چاہئے وہ چاہئے سب باندھ کر میں لاہور پہنچ گیا اور ایک جگہ سامان رکھ کر سیدھا نیلا گنبد گیا، شاید سامان تو میں نے اسٹیشن پر جمع کرا دیا تھا، وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ حضرت پاسپورٹ پر تشریف لائے ہیں، میں نے ملاقات ہونے پر حضرت سے عرض کیا تو حضرت نے فرمایا یہ ہو نہیں سکتا کہ میں نے یہ نہ لکھا ہو کہ میں پاسپورٹ سے آ رہا ہوں، میں نے کہا یہ کارڈ آپ کا موجود ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات نہیں لکھی کہ میں پاسپورٹ سے آ رہا ہوں، فرمایا کہ اتفاق ہو گیا ہوگا، بہر حال اس وقت سے حضرت کا بنوں آنا جانا بہت ہوا، اس کے بعد جب بھی حضرت پاکستان تشریف لاتے بنوں میرے پاس ضرور تشریف لاتے۔

پھر میں بنوں سے منتقل ہوکر پشاور چلا گیا تو دومرتبہ حضرت میرے پاس پشاور بھی تشریف لائے،۶۵ء کی جنگ کے بعد میں پشاور گیا ہوں اس کے تقریباً تین سال تک ہندوستان والوں کو پاکستان آنے کی اجازت نہیں تھی،اس دوران ہمارے حضرت اور قاری طیب صاحب اور ہمارے دیگر اکابرین پاکستان نہیں آئے ، یہ اچھا خاصہ طویل عرصہ ہے جو مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ تین سال کا ہے یا پانچ سال کا ہے،اس کے بعد حضرت تشریف لائے اور لاہور میں ماڈل ٹاؤن مولانا وکیل احمد صاحب کی کوٹھی پر حضرت کا قیام ہوا،اور میں پشاور سے ملاقات کے لئے گیا،اور جو قاعدہ ہے اس کے مطابق میں نے ذاتی حالات لکھ کر حضرت والا کو دے دیے،اوراس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ صبح میں واپس چلا جاؤنگا،اور پھر گھر سے مریضوں کو ایک دو ہفتہ کی دوا دے کر اوران مریضوں کی طرف سے مطمئن ہوکر دوبارہ آؤں گا،اس وقت میں بالکل نہیں ٹھہر سکتا، فوری طور پر جانا چاہتا ہوں یہ میں نے رات کو لکھ کر حضرت کو دے دیا۔

تقریباً صبح دس بجے کا وقت تھا تو حضرت اندر سے تشریف لائے اوراس طریقہ سے ہاتھ بڑھا کر فرمایا کہ لیجیے خط،ایک تو یہ اچنبھا ہوا کہ اس انداز سے کبھی خط دیا نہیں، میں نے دل میں خیال کیا کہ کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے کوئی رنگ حضرت پر غالب ہوگیا ہوگا،جب میں نے اس خط کو کھول کر پڑھا تو مجھے پسینہ آ گیا اس میں بندہ کو اجازتِ بیعت کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اسی وجہ سے احقر نے آپ کو اجازت کا خط بھیج دیا تھا، میں نے حضرت کو بتایا کہ وہ خط مجھے ملا ہی نہیں،حضرت نے فرمایا کافی دن ہوئے جب بھیجا تھا،اس پر مجھے یہ سوال کرنا پڑا کہ حضرت چونکہ مجھے وہ خط نہیں ملا اس لئے یہ تحریر اس کے لئے ناکافی ہے،اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں جب کراچی سے واپس آؤنگا تو باضابطہ تحریر میں اس وقت لکھ دونگا،اس وقت تک کے لئے یہی تحریر کافی ہے۔

اب میرے جانے کا وقت شروع ہوگیا اس دوران لوگوں کو بھی پتہ چل گیا خلافت کا،انہوں نے کہا ارے بھئی مٹھائی کھلاؤ، ایک چشتی صاحب تھے ،اور دوسرے لوگ بھی تھے، میں نے کہا مٹھائی کھلاؤنگا ذرا صبر کرو، میں نے حضرت کو اطلاع کرائی کہ میں ملنا چاہتا ہوں،ایک دفعہ اطلاع پر جواب نہیں ملا، جب دوسری دفعہ اطلاع ہوئی میں دروازہ پر ہی کھڑا ہوا تھا، مجھے جانے کی کچھ جلدی

تھی، اطلاع دینے والے سے حضرت نے فرمایا کہ وہ کیوں ملنا چاہتے ہیں کیا بات ہے، اجی مجھے تو نہیں معلوم، میں نے وہیں سے آواز دی کہ حضرت میں کچھ باتیں آپ سے کرنا چاہ رہا ہوں لیکن اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کرونگا کہ آپ نے مجھے کیوں اجازت دی، وہ باتیں اس سے علیحدہ ہیں، فرمایا اچھا پھر ٹھیک ہے آجاؤ، میں اندر چلا گیا، چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے میں بھی بیٹھ گیا، حضرت نے فرمایا جی فرمایئے، میں نے کہا یہ تو میں بڑے حضرت سے بھی سن چکا ہوں اور آپ سے بھی سن چکا ہوں کہ جب شیخ اجازت دے تو اس وقت یہ کہنا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں یا مجھے نہ دی جائے، یہ غلط بات ہے، کفرانِ نعمت ہے، اور اس کا ایک یہ بھی مفہوم ہے کہ شیخ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مرید میں اہلیت ہے یا نہیں اسے اس وقت اجازت دینی چاہئے یا نہیں، اس وجہ سے یہ بھی ایک قسم کا تنقیصی جملہ ہے، اور شیخ پر حملہ ہے کہ شیخ میں اس بات کی اہلیت نہیں، میں یہ سب باتیں جانتا ہوں باقی میں آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری آپ نے میرے کندھوں پر ڈال دی، اس سے عہدہ برآ کیسے ہونگا، میں تو کچھ بھی نہیں۔

حضرت نے فرمایا اس کے دو جواب ہیں، جہاں تک تمہارا یہ کہنا کہ ہم کچھ نہیں ہیں اس کا تو جواب یہ ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ ہیں، انہیں تو ہم اجازت دیتے نہیں، اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں اجازت انہیں کو ہی ملا کرتی ہے، یہ تو اس کا جواب ہے، باقی یہ کہ تم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ کیسے ہو گے؟

اس کے لئے میں تمہیں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں یہ اچھا ہوا کہ تم نے پوچھ لیا، جب تک تم یہ ذہن میں رکھو گے کہ مجھے کسی چیز سے عہدہ برآ ہونا ہے تو تم کبھی کامیاب نہیں ہو گے، اور جب تم یہ سمجھو گے کہ کس کا ہاتھ میرے سر پر ہے اور کن لوگوں کا سایہ میرے سر پر ہے ان پر نظر ہو گی تو تم ہر چیز سے عہدہ برآ ہوتے رہو گے، اپنے پر جب بھی نظر کرو گے فیل ہو جاؤ گے، اور جب تک ان بڑوں پر نظر رکھو گے ان شاء اللہ تمہیں کہیں رکاوٹ نہیں ہو گی، یہ سن کر میں نے عرض کیا کہ بس حضرت اب اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہئے اور میں حضرت سے رخصت ہو کر پشاور روانگی کے لیے کمرے سے باہر آ گیا۔

اوروں کے بارے میں تو مجھے نہیں معلوم کہ اجازت ملنے سے ان پر کیا اثر ہوا اور کیا کیفیات ہوئیں، لیکن مجھ پر جو اثر ہوا وہ یہ کہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ کوئی دس پانچ گھوڑوں کی طاقت میرے اندر کسی نے ڈال دی، اور اس کا ایک ایسا نشہ ہے جو میری آنکھوں میں ہے، جب میں حضرت کے یہاں سے رخصت ہونے لگا تو لوگوں نے یہ کہا کہ آپ یہاں سے جا ہی نہیں سکتے آپ کو یہاں سے رکشہ نہیں ملے گا، اور کہاں آپ کو گاڑی مل سکتی ہے، میں نے کہا بالکل غلط، میں سڑک پر جاؤنگا مجھے وہاں رکشہ کھڑا ہوا ملنا چاہئے، اور جب میں اسٹیشن جاؤنگا تو گاڑی بھی مجھے مل جائے گی، آپ میرا سامان صرف سڑک تک پہنچادیں، چشتی صاحب اور دوسرے دیگر حضرات، کسی نے کچھ پکڑا، کسی نے کچھ پکڑا، اور لے کر سڑک تک آئے وہاں دیکھا تو رکشہ کھڑا ہوا ہے، میں اس میں بیٹھ گیا، اس رکشہ والے کو راستہ میں ایک پولیس والے نے روک لیا، وہ رک گیا پولیس والا نزدیک آیا، مجھے اس وقت تک یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ کیا معاملہ ہو رہا ہے، میں نے اس سے کہا کیا بات ہے؟ رکشہ والے نے کہا اجی صاحب پولیس والے نے روکا ہے، میں نے اس سے بہت سختی سے کہا، پیچھے ہٹ جاؤ، نالائق، اور میں نے رکشہ والے سے کہا کہ چلو، وہ سپاہی بالکل ایسے پیچھے ہو گیا جیسے کوئی افسر کے حکم پر پیچھے ہوتا ہے، اور رکشہ والا مجھ سے کہنے لگا کہ آپ کونسی گاڑی پر جائیں گے، میں نے کہا فلاں گاڑی سے، رکشہ والے نے کہا جس وقت میں اسٹیشن سے ماڈل ٹاؤن کے لئے چلا تو وہ گاڑی اس وقت سگنل پر ہی کھڑی ہوئی تھی، میں نے ماڈل ٹاؤن پہنچ کر سواری اتاری اور اس کے بعد میں انتظار میں کھڑا رہا اب میں آپ کو لے کر اسٹیشن جا رہا ہوں تو اب وہ گاڑی آپ کو کہاں ملے گی میں نے کہا بیٹے وہ ابھی سگنل پر ہی کھڑی ہوئی ہے، اس نے کہا کیسے؟ میں نے کہا میں جو کہہ رہا ہوں، چنانچہ جب اسٹیشن پر پہنچے اور قلی سے دریافت کیا، اس نے کہا گاڑی ابھی سگنل پر کھڑی ہوئی ہے، وہاں سے ابھی تک آئی ہی نہیں، سبحان اللہ، وہ کچھ ایسی طاقت تھی، اور ایسا کچھ سرور تھا، اور ایسی کیفیت تھی جسے میں بیان نہیں کرسکتا، وہ نشہ کئی سال تک رہا، اور اس میں میں نے اپنے مختلف واقعات، اور مختلف حالات حضرت کو لکھے کہ یہ ہوا، یوں ہوا، وہ ہوا، ایسے ہوا، اور اس پر ہم ہر چیز پر بڑے خوش ہوتے تھے کہ ہم نے اتنی بڑی کرامت دکھائی، یا ہم سے اتنی بڑی کرامت سرزد

ہوگئی، حضرت اس پر پتہ نہیں کیا لکھیں گے، ایک مرتبہ تو تقریباً بیس صفحات کا خط تھا، اور اس میں اسی قسم کے واقعات کا ذکر تھا، جب جواب آیا تو سارے صفحات میں پلٹتا چلا گیا، کہیں کوئی جواب لکھا ہوا نہیں ملا، بالکل اخیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ مقاماتِ عروجیہ سے ان باتوں کا تعلق ہے، بس یہ ایک جملہ اخیر میں لکھا ہوا تھا، ساری باتوں کا یہ ایک جملہ جواب تھا۔

جب یہ طاقت محسوس ہونی بند ہوئی اور یہ محسوس ہوا کہ جیسے غبارے میں سے ہوا نکل گئی ہو، پھر میں نے حضرت کو خط لکھا، اس سے پہلے کے خطوط میں یہ جواب آتا تھا، یہ مقاماتِ عروجیہ ہیں، لیکن اس کے بعد یہ جواب آیا کہ الحمدللہ نزول شروع ہوا، اس سے پہلے نہ کوئی الحمدللہ، نہ ماشاء اللہ، لیکن یہاں اس خط کے جواب میں آیا الحمدللہ نزول شروع ہوا۔

حضرت فقیرُ الامت رحمہ اللہ سے تعلق کی داستان وواقعات

جیسا کہ پہلے گزرا کہ ایک زمانے میں میں بنوں میں مقیم تھا؛ اس کے بعد احقر بنوں سے منتقل ہوکر پشاور آ گیا، اور یہاں صدر میں گورا بازار بڑا مشہور بازار تھا، اس میں شبلی اسٹریٹ میں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر اس میں رہائش پذیر ہوگیا، اسی مکان کی بیٹھک میں احقر نے اپنا ہومیو پیتھک کا کلینک بنالیا، کچھ دنوں بعد میرے کلینک میں ارباب محمد فرید صاحب آ کر بیٹھنے لگے، گفتگو میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ سے ہے، معلوم ہوا کہ مولانا موصوف مدینہ منورہ میں رہتے ہیں اور وہاں سے دو یا تین ماہ کے لئے تشریف لاتے ہیں اور قصہ خوانی بازار سے متصل ایک گلی میں قیام فرماتے ہیں پھر اسی دوران اپنے وطن میں جو آزاد قبائل میں ہے وہاں بھی جاتے ہیں، احقر نے ارباب فرید صاحب سے عرض کیا کہ حضرت جب تشریف لائیں تو احقر کو اطلاع کر دیجئے، احقر ان سے ملاقات کا متمنی ہے، چنانچہ انہوں نے اطلاع کی لیکن ملاقات نہ ہوسکی، معلوم ہوا کہ آپ اپنے وطن آزاد علاقے میں چلے گئے ہیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں سے واپس آ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، بہرحال بات ایک سال بعد تشریف لانے پر گئی، جب آپ دوبارہ تشریف لائے تو میں بغیر کسی توقف کے ملاقات کے لئے پہنچ گیا، دوپہر کا وقت تھا، میں

نے اطلاع کی ،حضرت مولانا رحمہ اللہ نے اندر بلالیا، اور علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوگئی، دورانِ گفتگو احقر نے اپنے ابا جی رحمہ اللہ کے بارے میں بتایا کہ ان کی خواہش پر احقر نے کلام مجید حفظ کیا اور عربی فارسی وغیرہ پڑھی ،درسِ نظامی بھی پڑھا، میرے ابا جی رحمہ اللہ اس طرح کے سرکاری آدمی تھے،اس پر مولانا رحمہ اللہ کسی استغراق میں چلے گئے،اس کے بعد اچانک سر اٹھا کر فرمایا تمہارے ابا جی وہ بہت بڑے مرتبے کے بزرگ تھے، بہت بڑے بزرگ تھے،ان کے صدقے میں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا قربِ خاص عطا فرمائے، بہت دیر تک اسی طرح ابا جی رحمہ اللہ کے وسیلے اور واسطے سے دعا مانگتے رہے اور احقر سے فرمایا حافظ صاحب آپ میرے پاس آتے رہیں، مجھے آپ سے ایک تعلق پیدا ہوگیا ہے،حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ مجھے عمر بھر حافظ صاحب ہی کہتے رہے،اور یہ بھی فرمایا حافظ صاحب ہم تمہارا عاشق ہے،اس طریقہ سے ملاقاتیں جاری رہی۔

اسی دوران حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ کے لیے خانقاہ کے قیام کا مسئلہ شروع ہوا دو جگہ زیرِ غور تھیں،ایک جگہ لنڈی ارباب جو پشاور کے صدر سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع تھی،اور یہ جگہ ارباب محمد فرید صاحب کی تھی،ان کی کافی اراضی تھی ان کی ذاتی رہائش سے متصل تھی لیکن مولانا فقیر محمد صاحب نے فرمایا کہ آپ کو اس کی قیمت لینی پڑے گی، دوسری جگہ پشاور یونیورسٹی سے متصل تھی، دونوں جگہ دیکھنے کے بعد ارباب صاحب کی جگہ پسند کی گئی اور اس کی حدود متعین ہوگئیں،اور احقر کو حکم دیا گیا کہ یہاں اصلاحی مجلس شروع کردی جائے،احقر نے حسبِ ارشاد ایک امرود کے درخت کے نیچے کام شروع کردیا، ہر جمعہ کو فجر کے بعد تقریباً آٹھ بجے لوگ جمع ہوجاتے تھے اور احقر وہاں پہنچ کر کچھ تزکیۂ نفس،تربیت اور ذکر وغیرہ سے متعلق بیان کرتا تھا اور اس کے بعد ذکر کرلیتا تھا،اور دوسرے لوگ بھی ذکر میں مشغول ہوجاتے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ شرکاء کو یہ کہا جاتا اور بتلایا جاتا تھا کہ یہ ذکر تعلیم کے لئے ہے تاکہ آپ حضرات کو معلوم ہوجائے کہ ذکر کیسے کیا جاتا ہے اور کیسے کرنا چاہئے۔

اور اس اجتماع کا اصل اور بنیادی مقصد وعظ وتذکیر ہوا کرتا تھا،اور اس مجلس کو مستقل مجلسِ ذکر کا

عنوان بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ [۱]

بعد میں ختمِ خواجگان ہوتی تھی اور دعا ہوتی تھی، اگر کسی کو کسی معاملے میں دعا کرانی ہوتی تھی تو وہ اپنا نام اور مقصد لکھ کر ایک پرچہ دے دیتا تھا، اور ان کے مقصد کے لئے دعا کر دی جاتی تھی، احقر یہ کام پانچ چھ سال کرتا رہا، یہاں تک خانقاہ ایک دو سال میں تیار ہوگئی اور بعد میں اس سے متصل مسجد تعمیر ہوئی جس میں چھوٹے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم اور نماز پنجوقتہ و جمعہ کی نماز شروع ہوگئی۔

احقر جس جگہ بیان کرتا تھا اور یہ اصلاحی مجلس ہوتی تھی، اس کے بارے میں ایک مرتبہ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ نے یہ فرمایا کہ آج رات حضور ﷺ نے تمہارے اس جگہ کے عمل کو پسند فرمایا، مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ اپنے قیام کے دوران باقاعدہ مجلس میں شریک ہوتے تھے اور احقر کے برابر جلوہ افروز ہوتے تھے، دورانِ مجلس برابر روتے رہتے تھے یہ گریہ ہر وقت جاری رہتا تھا، درمیان میں دو چار جملے خود بھی فرما دیتے تھے، اور حضرت نے خانقاہ بننے کے بعد اپنے قیام کا وقفہ بڑھا دیا تھا، تین ماہ یہاں تک کہ چار ماہ بھی ہو جاتے تھے۔

جب مسجد تعمیر ہو چکی تو ایک دن حضرت مولانا رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حافظ صاحب اب یہ اصلاحی مجلس مسجد میں شروع کر دی جائے، احقر نے عرض کیا کہ حضور ﷺ نے تو اس جگہ کے عمل کو پسند فرمایا تھا، اب مسجد میں کیا حضور ﷺ کی طرف سے حکم ملا ہے؟ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ نے بڑے عجیب انداز سے فرمایا، حافظ صاحب یہ بات تو میرے ذہن سے نکل گئی تھی اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا، اب ان شاء اللہ یہ عمل ہمیشہ اسی جگہ ہوگا، اس کے بعد مستقل مجلس اسی جگہ ہوتی رہی، اب بھی کچھ سال ہوئے بندہ وہاں خانقاہ پر گیا تھا تو حاجی ارباب محمد فرید صاحب اسی جگہ مجلس کرتے ہیں، حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ چونکہ تکوینی بزرگ تھے اس لئے ان کے بہت واقعات ہیں، بندہ ان میں سے چند واقعات کا ذکر کرے گا۔

جب خانقاہ کے قیام کا ارادہ فرمایا تو بندہ سے حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حافظ صاحب یہ خانقاہ آپ کے سپرد ہے، اس میں مجلس وغیرہ کرنا، بیان کرنا، ختمِ خواجگان کرنا وغیرہ یہ سب آپ

---

[۱] اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خاص ذکر کے لئے لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا یا ذکر کے لئے لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ یہ فقہائے کرام کی بیان کردہ ''تداعی'' میں داخل ہو۔

کی ذمہ داری ہے(یقیناً یہ حضرت کی طرف سے اجازت کا بہت اعلیٰ درجہ تھا)چنانچہ جیسا کہ گذر چکا ایک امرود کے درخت کے نیچے یہ کام شروع کیا گیا، حالانکہ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کے وہاں پر خلفاء موجود تھے، اس کے باوجود یہ کام احقر کے سپرد ہوا، جو تقریباً چار پانچ سال چلتا رہا، پھر احقر کا ارادہ پشاور سے سکونت تبدیل کرنے کا ہوا، اور اس کی اجازت حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ سے احقر نے حاصل بھی کر لی، چنانچہ احقر وہاں سے سکونت چھوڑ کر حیدر آباد آ گیا، اس سلسلے میں حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ سے اجازت تو درکنار تذکرہ بھی نہیں ہوا۔

بندہ عارضی طور پر کراچی میں کرایہ کے مکان میں مقیم تھا، اچانک احقر کے بیٹے ناصر محمود (متبنیٰ) کو خون کی قے شروع ہوگئی، اور بے اندازہ خون جاری ہو گیا، فوری طور پر ایک کار میں ڈال کر بقائی ہسپتال لے جایا گیا، جنہوں نے فوری طور پر ایکسرے وغیرہ لیا، اور ڈرپ (DRRIP) وغیرہ لگائی، پھر انجکشن شروع کیے، کچھ دِنوں میں افاقہ ہوا تو میں اس کو حیدر آباد اپنے چھوٹے چچا شبیر احمد خان مرحوم کے گھر لے آیا۔

ابھی اس واقعے کو دو چار دن ہوئے تھے کہ ایک دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، چچا صاحب دروازہ پر گئے تو ایک اجنبی شخص تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت صاحب مکہ معظّمہ سے آئے ہوئے ہیں، کراچی میں مقیم ہیں، انہوں نے حافظ صاحب (یعنی مجھے) کو بلایا ہے، احقر نے جب چچا صاحب سے معلوم کیا کہ کون تھا؟

تو انہوں نے فرمایا کہ ایسے ایسے ایک صاحب تھے، انہوں نے یہ کہا ہے، میں دوڑ کر دروازے پر گیا، دائیں بائیں دیکھا تو وہاں کوئی آدمی نہیں تھا، میں نے کہا، مدینہ منورہ سے تو مولانا فقیر محمد صاحب آتے ہیں یہ مکہ معظّمہ سے کون بزرگ آئے ہیں، یہ کہتا ہوا میں ایک چارپائی پر تھوڑی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اچانک غنودگی طاری ہوئی، اور حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ سامنے آئے اور بڑے غصے سے فرمایا تم کس مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ کے جھگڑے میں پڑ گئے ہو؟ ہم نے تم کو بلایا ہے، فوراً آؤ؛ جیسے ہی ہوش آیا میں فوراً اُٹھا اور چچا صاحب اور گھر والوں سے کہا کہ مولانا فقیر محمد صاحب تشریف لائے ہیں، میں ان سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں، انہوں نے مجھے بلایا ہے، چنانچہ

فوری طور پر بندہ کراچی روانہ ہوگیا، اس وقت تک حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کا کراچی میں جناب نواب قیصر صاحب کے یہاں قیام شروع نہیں ہوا تھا، بلکہ گاندھی گارڈن میں حاجی عبدالسمیع صاحب تھے، ان کے یہاں قیام تھا، احقر کراچی تو آ گیا، لیکن یہ معلوم نہیں کہ حضرت کس جگہ قیام پذیر ہیں، کراچی پہنچ کر احقر اپنی پھوپھی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا کے گھر بغیر سوچے سمجھے پہنچ گیا، پھوپھی صاحبہ نے فرمایا کہ تنویر کوئی صاحب آئے تھے، اور ایک پرچہ دے کر گئے ہیں، کہ جب تنویر صاحب آئیں تو ان کو یہ پرچہ دیدینا۔

تم دیکھو کہ کیا ہے؟

میں نے وہ پرچہ ہاتھ میں لے کر دیکھا تو اس میں فقیر الامت رحمہ اللہ کا سارا پروگرام تھا، کہ تم اس وقت آؤ تو میں فلاں جگہ ہوں گا، اس وقت آؤ تو فلاں جگہ ہوں گا، چنانچہ اس وقت حضرت گاندھی گارڈن میں مقیم تھے، احقر اس پتہ پر اسی وقت وہاں پہنچ گیا، اور حضرت کو اطلاع دی، حضرت نے اندر بلالیا، جیسے ہی احقر نے اندر پہنچ کر سلام کیا، حضرت نے سلام کے جواب کے فوراً بعد بڑے غصے سے فرمایا کہ:

> ہم نے تم کو کسی پہاڑ پر نہیں بٹھایا تھا، کسی جنگل میں نہیں بٹھایا تھا، ہم نے تم کو اپنی خانقاہ پر بٹھایا تھا، تم بغیر ہماری اجازت وہاں سے کیسے آ گیا؟ بزرگوں نے تو لوگوں کو پہاڑ پر بھی بٹھایا ہے!

اب میں بڑی کشش وپنج میں کہ کیا جواب دوں؟

میں نے عرض کیا کہ میرا لڑکا بہت بیمار ہے، اس کو خون کی قیئیں آئی تھیں، اس وقت بھی زیرِ علاج ہے، فرمایا کہ تم اس کی بات چھوڑو، وہ بالکل ٹھیک ہے، تم یہ بتاؤ کہ پشاور جا رہے ہو یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ بالکل میں جانے کے لیے تیار ہوں، بچہ ٹھیک ہوجائے۔

حضرت نے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنی شروع کی اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ جاؤ وہ بالکل ٹھیک ہے، بہرحال احقر نے اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر گھر والوں کو حیدرآباد ہی چھوڑا اور تنہا پشاور روانہ ہوگیا، اور اس حالت میں دو سال گذارے، وہ بچہ بحمداللہ تعالیٰ اب تک ٹھیک ہے۔

اس کے بعد جب احقر 79ء میں حج کے لیے گیا، اس سے واپسی پر حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

حافظ صاحب آپ نے ہمارے لیے بہت تکلیف اُٹھایا، اب ہم تم کو خوشی سے اجازت دیتا ہے کہ تم حیدرآباد چلے جاؤ، ابھی حیدرآباد والوں کو آپ کی ضرورت ہے۔

میں نے عرض کیا حضرت سوچ لیں کبھی بعد میں پھر آپ یہ حکم واپس لے لیں، فرمایا نہیں، ایسا بات نہیں۔

بلکہ جب اس کے بعد حضرت رحمہ اللہ کراچی تشریف لائے تو احقر حضرت کو اپنے گھر لے آیا، ایک دن کے لیے، شام کو کافی مجمع تھا، مجلس کے بعد فرمایا کہ:

حیدرآباد والو! ہم نے اپنا حافظ صاحب تم دیا ہے، تم اس کا قدر کرو، اگر تم لوگوں نے اس کا قدر نہیں کیا تو ہم اس کو پشاور واپس لے جائے گا۔

ضمناً یہ بھی عرض کردوں کہ احقر نے حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کو یہ سب واقعہ لکھا اور یہ بھی کہ احقر نے آپ سے اجازت لے لی تھی، اس پر حضرت والا رحمہ اللہ نے یہ تحریر فرمایا کہ بغیر مولانا فقیر محمد صاحب کی اجازت کے تمھیں وہاں سے منتقل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟

یہ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کی عین شفقت اور محبت تھی کہ بظاہر تو حضرت نے اجازت نہیں دی، لیکن خانقاہ پر بٹھانا اور پھر اس انداز سے کہ ہم نے پہاڑ پر تو نہیں بٹھایا، تم کو اپنی خانقاہ پر بٹھایا تھا۔ یہ سب باتیں حضرت کی اجازت سے بھی اہم ہیں۔

میری اہلیہ کے گلے میں کینسر ہوگیا، ڈاکٹر نے کہا، فوراً بائی اوپسی کراؤ اور علاج شروع کرو، میں چونکہ خود بھی ہومیوڈاکٹر ہوں، مجھے معلوم تھا کہ بائی اوپسی کے بعد کیا ہوتا ہے؟

میں نے اہلیہ سے کہا کہ موت زندگی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن یہ علاج غلط ہے، ہوسکا تو میں ہومیو پیتھک ادویہ سے علاج کروں گا، اسی دوران یہ معلوم ہوا کہ مولانا فقیر محمد صاحب تشریف لے آئے ہیں، میں نے اہلیہ سے کہا، چلو مولانا سے دعا کراتے ہیں، چونکہ اہلیہ کی آواز بھی بند تھی، اور کھانا پینا بھی؛ بس دودھ وغیرہ پی سکتی تھیں، ہم خانقاہ پہنچے اور احقر نے اپنی اہلیہ کو حضرت فقیر

الامت رحمہ اللہ کے سامنے بٹھا دیا، اور میں نے عرض کیا کہ یہ مر رہی ہے، اس کے گلے میں کینسر ہوگیا ہے، اور آواز وغیرہ بھی بند ہے؛ حضرت نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر حسبِ معمول روتے ہوئے دعا شروع کی، دعا کے الفاظ بڑے عجیب تھے:

اللہ میاں ہمارا حافظ صاحب تو تباہ ہوجائے گا، یہ خوار ہوجائے گا، ان کا کون خدمت کرے گا، تم اس کو ٹھیک کرو، تم اس کو ٹھیک کرو۔

بس کافی دیر تک یہی الفاظ دوہراتے رہے، پھر یہ فرمایا، میری اہلیہ کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اچھا بس اب تم ٹھیک ہو، اب جاؤ۔

اس وقت سے آج پچیس سال ہوگئے؛ الحمدللہ آج تک ٹھیک ہیں۔

بندہ جب 79ء میں حج کو جانے لگا تو حضرت سے عرض کیا کہ بندہ حج کو جائے گا امسال ان شاء اللہ، آپ مجھے کوئی اپنا پتہ بتادیں تاکہ ملاقات میں آسانی ہو، حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ہمارا کوئی پتہ نہیں جب تم وہاں جائے گا تو ہم خود تم سے ملے گا تم فکرمت کرو، چنانچہ جب مکہ معظّمہ پہنچ گیا اور مسفلّہ کے مقام پر ایک مکان میں ساتھیوں کے ساتھ قیام ہوگیا تو وہاں سے ظہر کی نماز کے لئے حرم شریف جارہا تھا، راستہ میں خیال آیا کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ ہم خود ملے گا ابھی تک تو حضرت سے ملاقات نہیں ہوئی، اس وقت بارش بھی ہورہی تھی میں نے سامنے نظر اٹھائی دیکھا کہ حضرت احرام باندھے ہوئے ہجوم کو چیرتے ہوئے میری طرف آرہے ہیں، قریب آکر سلام کے بعد بغل گیر ہوئے اور فرمایا کہ تم کو بولا تھا کہ ہم خود ملے گا اس لئے ہم تم سے مل گیا، اور تمہارا پیر صاحب (حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ) بھی آ گیا ہے اور افریقی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے تم ان سے مل لینا اتنا کہنے کے بعد وہ ہجوم میں غائب ہوگئے، نماز کے بعد احقر نے معلوم کیا کہ کون سا ہوٹل ہے جہاں حضرت قیام پذیر ہیں، میں نمازِ عصر کے بعد اس ہوٹل میں پہنچا، حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ ایک کمرے میں مجلس فرمارہے تھے، لوگ بیٹھے ہوئے تھے، کمرا بھرا ہوا تھا، اس کمرے سے پہلے ایک استقبالیہ کمرا تھا جو چھوٹا تھا اس میں بھی آدمی بیٹھے ہوئے تھے، داہنی جانب حضرت مولانا ابرار الحق صاحب اور مولانا فقیر الامت رحمہما اللہ بیٹھے ہوئے تھے، بندہ وہیں قریب جاکر بیٹھ گیا،

حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے دیکھ لیا تھا، لیکن دورانِ مجلس کوئی سلام کلام نہیں ہوا، تھوڑی دیر بعد بندہ نے دیکھا کہ ایک بزرگ سر پر عمامہ باندھے ہاتھ میں لمبا عصا لئے آئے اور استقبالیہ سے کچھ آگے آ کر بیٹھ گئے، بندہ ان سے واقف تھا، لیکن ان سے ملاقات وغیرہ نہیں تھی، وہ بزرگ حافظ غلام حبیب صاحب رحمہ اللہ چکوالی تھے (بعد میں تو ان سے صرف ملاقات ہی نہیں بلکہ بے حد بے تکلفی ہوگئی تھی وہ جب کبھی حیدرآباد جناب حاجی صبغۃ اللہ صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے اس حقیر کو ہی بلاتے تھے) مجلس جاری تھی، درمیان میں حضرت نے توقف فرما کر غالباً تھوڑا پانی پیا، اسی دوران حضرت شاہ ابرارالحق صاحب رحمہ اللہ نے حضرت کے کان میں کچھ کہا، حضرت نے بہ آواز بلند فرمایا میں چونکہ ان سے واقف نہیں تھا، اب آپ کے فرمانے کے بعد میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ آپ وہاں سے اٹھ کر میرے برابر آ کر تشریف رکھئے، حضرت کے اس فرمانے پر جناب حافظ غلام حبیب صاحب چکوالی رحمہ اللہ جواب میں عرض کیا حضرت آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میری گزارش ہے کہ جو فیض مجھے سامنے سے حاصل ہو رہا ہے وہ وہاں بیٹھنے سے حاصل نہیں ہوگا، اس لئے بندہ جب بھی حاضر ہوگا سامنے ہی بیٹھے گا، حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے فرمایا بہت اچھا! اور مجلس شروع ہوگئی، مغرب سے قبل مجلس ختم ہوئی تب بندہ نے حضرت سے ملاقات کی، حضرت نے اعلان کرایا کہ حضرات نمازِ مغرب حرم شریف میں ادا کریں علاوہ چند ساتھیوں کے وہ اسی جگہ نماز پڑھیں گے، بعد میں حضرت فقیر الامت سے بھی ملاقات ہوتی رہی اور حافظ غلام حبیب چکوالی رحمہ اللہ سے بھی۔

بندہ 65ء کی جنگ کے دوران پشاور منتقل ہو گیا تھا، اور وہاں سکونت اختیار کر لی تھی اور صدر روڈ پر ایک دوکان جو اچھی خاصی وسیع تھی اور اس کے سامنے اچھا خاصا پکا صحن بنا ہوا تھا اس کے آخر میں شہتوت کا درخت تھا پھر اس کے بعد سڑک شروع ہوتی تھی، اس زمانے میں جنگ بندی ہو چکی تھی لیکن فوجیں محاذ پر موجود تھی، ایک مجذوب صاحب باقاعدہ خاکی وردی میں وہاں چکر لگاتے رہتے تھے اور کچھ دیر کے لئے میری دوکان کے سامنے بیٹھ جاتے تھے، ایک مرتبہ میں نے ان کو کچھ پھل بھجوائے، جو میرا لڑکا ناصر محمود (متبنیٰ) جو اس وقت پانچ سال کا تھا وہ لے کر گیا۔

مگر انہوں نے لینے سے انکار کیا میں نے اپنی جگہ سے آواز سے کہا کہ لے لو، انہوں نے لے لیا لیکن بعد میں اسی جگہ پر چھوڑ کر چلے گئے، دوسری مرتبہ میں نے خود ایک رقم دی انہوں نے اس سے انکار کرتے ہوئے کہا میں کچھ نہیں لیتا بس صرف چائے پیتا ہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے تم ان پیسوں کی چائے پی لو، میری دوکان کے برابر چائے کی دوکان تھی، دوکان کا مالک نذر محمد تھا میں نے نذر محمد سے کہا کہ اس کو چائے پلا دو، جواب میں نذر محمد نے کہا کہ صاحب یہ صرف چائے پیتا ہے اور میں دن میں نہیں رات کو بھی دوکان کھولے بیٹھا رہتا ہوں جب بھی یہ میری طرف آتا ہے میں فوراً اس کو چائے پیش کرتا ہوں، میں نے کہا ٹھیک ہے اب یہ چائے میری طرف سے پلا دو، بات ختم ہوگئی یہاں تک کہ یہ اعلان ہوگیا کہ صدر ایوب صاحب اور شاستری صاحب تاشقند میں ملاقات کے لئے جا رہے ہیں، اچانک ان مجذوب صاحب کا تبادلہ ہوگیا اور ایک دوسرے مجذوب جو ایک لمبا سا کوٹ پہنے ہوئے کچھ کاغذات لپیٹ کر جیب میں رکھے رہتے تھے، ان کی جگہ وہ گھومتے رہتے تھے، اور ہمیشہ کچھ کاغذات جیب میں رکھتے رہتے تھے، جس سے میں نے یہ سمجھا کہ اب جنگ تو ختم ہوگئی، کچھ معاہدے جو کاغذ پر تحریر ہوں گے، وہ ہو جائیں گے۔

یہاں تک کہ تاشقند کا معاہدہ ہوگیا اس کے دوسال بعد کہ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کی خانقاہ بھی بن گئی تھی حضرت تشریف لائے ہوئے تھے میں حضرت سے ملاقات کے لئے خانقاہ گیا ہوا تھا، اچانک حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ نے اس چائے والے نذر محمد کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے ان کی آج کل پشاور میں ڈیوٹی لگی ہوئی ہے، میں نے دیکھا کہ تو نذر محمد کی اس وقت داڑھی بھی نہیں تھی میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا میں نے تعجب سے پوچھا یہ نذر محمد کون سی ڈیوٹی دے رہا ہے؟ حضرت نے فرمایا یہ یہاں کا صاحبِ خدمت ہے، تھوڑی دیر میں سوچ میں پڑ گیا، پھر میں نے حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ ہاں مجھے یاد آ گیا یہ اس مجذوب کی خدمت کرتا تھا اور رات کو بھی اس کی چائے کے لئے بیٹھا رہتا تھا وہ جاتے ہوئے اس کو دے گیا، حضرت مسکرانے لگے اور فرمایا ہاں، پھر میں نے دیکھا کہ تو وہ خانقاہ میں مستقل آتا تھا، پھر بعد میں اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی اور خانقاہ کے مہمانوں کی خدمت کرتا رہتا تھا اور بعد میں اکثر خانقاہ

میں ہی رہتا تھا، حضرت کے انتقال کے بعد بھی وہ اسی جگہ کام کرتا رہا، اب تو اس بے چارے کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔

حضرت فقیرالامت رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ صاحبِ حضوری کس وقت ہوتے ہیں، بلکہ حضرت قبلہ نواب قیصر صاحب مدظلہٗ نے وضاحت سے معلوم کیا فرمانے لگے تقریباً رات دو بجے، اور نواب صاحب مدظلہٗ نے مجھے فرمایا کہ جب بھی میں نے دو بجے حضرت کو دیکھا تو ذکر کی حالت میں ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فقیرالامت رحمہ اللہ نے مجھے فرمایا کہ منیٰ میں جب آگ لگی تو میں ان خیموں کے بالمقابل ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا، سامنے سڑک کی دوسری طرف ایرانی لوگوں کے خیمے تھے اور ایرانی لوگ اپنے خیموں میں گانوں کی ریکارڈنگ لگائے ہوئے تھے، اچانک ان کے خیموں میں آگ لگ گئی، آگ نے ہوا کے رخ کے مطابق دوسرے لوگوں کے خیموں کو بھی لپیٹ میں لینا شروع کردیا اور لوگوں میں بدحواسی اور بھگدڑ مچ گئی، اسی حالت میں لوگوں نے بتایا کہ حضرت خیموں میں آگ لگ گئی ہے آپ دعا فرمائیں، میں نے ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کردی، میں دعا میں مصروف تھا میری نظر سامنے پڑی تو ایک مجذوب کھڑا ہوا تھا اور میری طرف ان دونوں ہاتھوں کی مٹھّیاں بند کرکے عجیب حرکتیں کررہا تھا، میں نے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے دعا جاری رکھی، اس نے مجبور ہوکر بڑی زوردار آواز میں کہا مولانا فقیر محمد آپ دعا بند کردیں مجھے منیٰ کو جلانے کا حکم ملا ہے مجھے اپنا کام کرنے دیجئے، میں نے پھر بھی اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دعا جاری رکھی، اسی دوران حضرت فقیرُ الامت رحمہ اللہ کو کشف ہوا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فقیر محمد کی دعا کو قبول فرمایا، لہٰذا ہوا کا رخ بدل دو اور آگ بجھادو، چنانچہ ہوا کا رخ پہاڑی کی طرف ہوگیا اور خیمے آگ سے بچ گئے، پھر آگ بجھادی گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعا ایسی مؤثر چیز ہے، کہ جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض تکوینی اور تقدیری اُمور بھی تبدیل کردیے جاتے ہیں، گو وہ غیر مبرم، یعنی معلق تقدیر ہی سے متعلق ہوتے ہوں؛ رہا مبرم تقدیر کا معاملہ تو وہ تو اٹل ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اندرا گاندھی اس وقت وزیر اعظم ہندوستان کی تھی، اور ہندوستان پاکستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور ساری تیاری ہو چکی تھی، میرے پاس ایک ابدال آیا اور اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کر رہا تھا، مجھے حضرت کے وہ الفاظ بالکل یاد ہیں جب حضرت نے یہ فرمایا کہ ہم نے ابدال سے کہا کہ اندرا گاندھی کو مار دو تا کہ یہ سب کچھ قصہ ختم ہو جائے، چنانچہ دوسرے دن اندرا گاندھی کو مار دیا گیا اور سارا قصہ ختم ہو گیا، اب اس سے حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کا مقام تصور فرمائیے کہ جن کے پاس ابدالِ وقت مشورے کے لئے آئے۔

ان سب واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کا تشریع کے ساتھ ساتھ بعض تکوینی اُمور سے بھی تعلق تھا۔

اس موقعہ پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ صاحبِ تکوین کو تمام غیب کی باتوں کا علم نہیں ہوتا، بلکہ جتنا اور جس وقت بطور کشف اللہ تعالیٰ جو علم عطا فرماتے ہیں، بس اتنا علم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات انہیں چھوٹی راز داری کی باتیں بھی معلوم نہیں ہوتیں، جیسا کہ حضرت فقیرُ الامت رحمہ اللہ کے واقعات میں گزرا؛ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اور جس بات سے آگاہی کی اللہ تعالیٰ صاحبِ تکوین کے لیے ضرورت سمجھتے ہیں، اتنی آگاہی عطا فرما دی جاتی ہے، اور بس۔

اس تقریر سے کئی شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کی وفات سے ایک ہفتہ قبل احقر ملاقات کے لیے کراچی سے پشاور حاضر ہوا تو گھر والوں نے کہا کہ کسی کو ملاقات کی دو ماہ سے اجازت نہیں ہے، لیکن تمہارا معاملہ دوسرا ہے، اس لیے ہم وہ کمرہ بتا دیتے ہیں جہاں حضرت آرام کر رہے ہیں، تم چلے جاؤ، تم جانو وہ جانیں۔

احقر کمرے میں داخل ہوا تو حضرت ایک چارپائی پر آرام فرما تھے، ہاتھ میں ایک تسبیح تھی، احقر نے سلام کیا، حضرت نے مجھے یاد نہیں سلام کا جواب دیا یا نہیں، یہ پوچھا ''سوک ئی'' یعنی کون ہو؛ میں نے عرض کیا، تنویر احمد؛ ''سوک تنویر احمد'' یعنی کون تنویر احمد؛ میں نے عرض کیا ''نہ پے جانم حافظ تنویر احمد'' یعنی کیا آپ نہیں پہچانتے حافظ تنویر احمد۔

اس پر حضرت نے ہوش میں آ کر جواب دیا؛''خاہ حافظ صاحب دے''یعنی اچھا حافظ صاحب ہیں؛اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی،پھر جب مسجد نماز کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں فرمایا:

دیکھو حافظ صاحب یہ خانقاہ ہمارا نہیں،تمہارا ہے،تم نے اس کو آباد کیا،ابھی تم حیدر آباد ہو،لیکن جب کبھی بھی یہ محسوس کرو تو بے تکلف یہاں چلے آنا۔

نماز کے بعد خادم رخصت ہو کر واپس آ گیا۔

ایک ہفتہ بعد حضرت فقیر الامت رحمہ اللہ کی روانگیٔ آخرت کی اطلاع ملی،احقر بذریعہ ہوائی جہاز پشاور پہنچا،نمازِ جنازہ ادا ہو چکی تھی،البتہ تدفین باقی تھی،جس میں احقر شریک ہوا۔

مولانا عبد الحمید صاحب رحمہ اللہ سے ملاقات اور ان کے مختصر حالات

مولانا موصوف''میر علی''سے قریب میں ایک دیہات تھا،اس کے رہنے والے تھے،زمانۂ طالبِ علمی میں جبکہ موصوف دار العلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم تھے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے تعلق پیدا ہوا، بیعت کے بعد اصلاحی تعلق اور ملاقات جاری رہی اور فراغت سے قبل ہی حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اجازتِ بیعت اور خلافت سے نوازا۔

مولانا موصوف عجیب قسم کے زاہد اور تارکُ الدنیا بزرگ تھے،شادی شدہ تھے،صاحبِ اولاد بھی تھے،ان کا ایک لڑکا ماشاءاللہ جوان شادی شدہ تھا،بیوی بچوں کے حقوق کیسے ادا کرتے تھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں،صائم الدہر تھے،اور پہاڑوں کے غاروں میں زندگی گذارتے تھے جب کبھی لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں غار میں مقیم ہیں تو وہ اس غار کو چھوڑ کر دوسرے غار میں چلے جاتے تھے،۔

احقر نے جب بنوں میں رہائش اختیار کی تو 1951ء میں احقر کو ایک فرنیچر مارٹ الاٹ ہوا،جس میں بہت فرنیچر تھا اور اس سے چھاؤنی کے جتنے فوجی آفیسر تھے وہ کرایہ پر فرنیچر لیتے تھے،یہ فرنیچر مارٹ ایک بنگلے میں جو چھاؤنی میں سی ایم ایچ کے برابر میں تھا اس میں واقع تھا،جس کی کافی اَراضی اور سرونٹ کواٹرز وغیرہ تھے،یہ سب کچھ مجھے الاٹ ہوا تھا اور وہاں احقر نے کاروبار کے

ساتھ رہائش بھی اختیار کر لی تھی کافی نوکر چاکر تھے، بڑا کاروبار تھا، اس کے برابر میں ٹیلی فون ایکسچینج تھی اور اس کی چھوٹی سی مسجد تھی جس کی امامت احقر نے اپنے ذمہ لے لی اور وہاں درسِ قرآن اور رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتا تھا۔

اسی ٹیلیفون ایکسچینج میں ایک ای ایس ٹی صاحب تھے جو مولانا موصوف کے بھتیجے تھے، میں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلفاء کی فہرست دیکھی تو اس میں حضرت مولانا عبدالحمید صاحب رحمہ اللہ کا نام اور پتہ درج تھا، جس کا تذکرہ ٹیلی فون ایکسچینج کی مسجد میں دورانِ درس احقر نے کیا، اس پر وہاں پر موجود حضرت کے جو بھتیجے تھے انہوں نے کہا کہ وہ میرے چچا ہیں اور آجکل وہ گاؤں آگئے ہیں اور انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ

''مولانا اشرف علی صاحب کا امانت ہمارے پاس ہے جو لینا چاہتا ہے وہ ہم سے بیعت ہو جائے، یہ ہمارا آخری وقت ہے''

چنانچہ کافی لوگ ان سے بیعت ہوئے اور ان میں ایک صاحب مولوی تقویم الحق جو کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، وہ بھی بیعت ہوئے، قصہ مختصر احقر ان کے بھتیجے کے ہمراہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، مسجد میں تشریف فرما تھے، گاؤ تکیے کے سہارے پیر سامنے پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے، اور سامنے گود میں بیانُ القرآن کھلی ہوئی رکھی تھی، احقر نے سلام کیا جواب دے کر پھر استغراق میں چلے گئے، روزے کی حالت میں تھے، میں نے عرض کیا میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کے سلسلے سے ہوں میرا نام تنویر احمد ہے بنوں سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں، وہ سن کر ہوش میں آئے، اچھا تو تم مولوی اشرف سے تعلق رکھتے ہو؟ پھر مجھ سے گفتگو شروع ہوگئی، یہ بھی فرمایا کہ ہم نے مولوی اشرف علی کو خط میں لکھا کہ ہم تمہاری بزرگی کی وجہ سے تم سے بیعت نہیں ہوا بلکہ ہم تمہارے علم کی وجہ سے تم سے بیعت ہوا ہے، حضرت نے ہمارا یہ خط تربیت السالک میں شائع کر دیا، پھر احقر نے بطورِ ہدیہ شہد پیش کیا جو انہوں نے قبول فرمالیا، اس زمانے میں احقر نے اپنے بنگلے میں شہد کی مکھیاں پال رکھی تھیں اور اس کے کافی بکس میری زیرِ نگرانی تھے، دوسرا ہدیہ انڈوں کا حلوہ تھا، فرمایا کہ میں اس کا کیا کروں گا، میں نے عرض کیا کہ آپ کافی کمزور ہوگئے ہو

اور روزے بھی رکھ رہے ہو تو افطاری کے وقت آپ اس میں سے تھوڑا سا کھا لیا کریں، فرمایا کہ پھر یہ گھر والوں کو دے کر ان کو بتا دو کہ مجھے افطاری کے وقت دے دیا کریں ان کی دو ایک کرامتوں کا مختصر سا تذکرہ کر رہا ہوں۔

ان کے صاحبزادے کی شادی ہو رہی تھی، عورتوں نے ڈھول بجانا شروع کر دیا، سب ان کو بابا کہتے تھے، جب ان کو معلوم ہوا تو مسجد سے بالکل متصل الگ گھر تھا وہاں گئے اور ان کو ڈھول بجانے سے منع کیا، لیکن کچھ عورتوں نے کہا بابا اس میں کیا حرج ہے شادی کا موقع ہے ہم تو بجائیں گے۔

مولانا نے فرمایا اچھا ٹھیک ہے تم ڈھول بجاؤ، یہ کہہ کر باہر آ گئے۔

تھوڑی دیر میں اس کمرے کی چھت ٹوٹ کر گر پڑی، اور سب عورتیں اس چھت کے نیچے دب گئیں، لوگوں نے جلدی جلدی ملبہ ہٹایا، عورتوں کو نکالا، ساری عورتیں صحیح سلامت تھیں کسی کو ایسی چوٹ نہیں آئی تھی جو نظر آئے، اس کے بعد حضرت تشریف لائے اور فرمایا اب ڈھول بجاؤ گی؟ سب نے کہا نہیں بابا اب ہم نہیں بجائیں گے۔

ایک مرتبہ آپ اپنے کمرے کی چھت ڈالنے کے لئے ایک شہتیر خرید کر لائے، جب چھت ڈالنے لگے تو معلوم ہوا کہ شہتیر چھوٹا ہے، کئی زاویوں سے کوشش کی گئی مگر بے سود، بابا صاحب کو اطلاع کی گئی کہ بابا یہ شہتیر تو بہت چھوٹا ہے آپ دوسرا منگائیں، اس پر انہوں نے فرمایا میں تو پیمائش کر کے لایا ہوں چھوٹا کیسے ہو گیا، چلو مجھے دکھاؤ، اب جا کر جب شہتیر رکھا گیا تو دو فٹ بڑا تھا، جس کو کاٹنا پڑا۔

ایسے ان کے بہت سے واقعے ہیں احقر نے اس وجہ سے ان کا ذکرِ خیر قلمبند کیا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلفاء میں اتنے بڑے بزرگ تھے، لیکن میری معلومات کے مطابق ان کے بارے میں کسی نے کچھ لکھا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ میری چند سطور قبول فرمائیں۔ آمین۔

مولانا خیر محمد جالندھری صاحب رحمہ اللہ سے ملاقات

یہ تو معلوم تھا کہ مولانا موصوف حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء سے ہیں، اور ملتان میں

دارالعلوم میں رہائش پذیر ہیں، شیخُ الحدیث ہیں، لیکن ان سے ملاقات نہیں تھی، ایک مرتبہ کسی کام کے سلسلے میں ملتان جانا ہوا، خیال آیا کہ حضرت سے ملاقات کی جائے، چنانچہ چند احباب کے ساتھ احقر درِ دولت پر حاضر ہوا، معلوم ہوا کہ حضرت سخت علیل ہیں، اور کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں ہے، حضرت کے صاحبزادے باہر تشریف لائے، اور کہنے لگے کہ حضرت سے کسی کو ملاقات کی اجازت نہیں ہے، اور ڈاکٹروں نے بھی منع کیا ہوا ہے، میں نے کہا، ٹھیک ہے، آپ صرف ہمارا سلام پہنچادیں اور دعا کے لیے عرض کر دیں؛ اسی دوران کچھ نحیف سی آواز آئی اور صاحبزادے فوراً اندر چلے گئے اور باہر آئے اور کہنے لگے کہ آپ اندر آ جائیے؛ حضرت آپ کو بلا رہے ہیں، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کوئی واقفیت بھی نہیں، تعارف بھی نہیں، خیر میں اندر احباب کے ساتھ چلا گیا، حضرت لیٹے ہوئے تھے، لیٹے لیٹے مصافحہ کیا، خیریت معلوم کی، احقر نے مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کرایا، فرمانے لگے۔

جی ہاں! میں نے صاحبزادے سے کہا تھا کہ اندر بلالاؤ، مجھے تھانہ بھون کی خوشبو آ رہی ہے، ان کا تعلق تھانہ بھون سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت کی کچھ دنوں بعد وفات ہوگئی اور یہ صرف مختصر سی ملاقات ان سے زندگی بھر میں ہو سکی؛ بڑی عظیم شخصیت تھی۔

مولانا ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ سے ملاقات

دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالبِ علمی میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ میرے اساتذہ میں سے ہیں، نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن دارالعلوم میں دیتے تھے، کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر پر اعتراض ہوتا تھا، اُسے وضاحت سے بیان فرماتے تھے، اس دوران کچھ طلباء حضرت کو پرچے لکھ کر دیتے تھے، جس میں قتل کی دھمکی بھی ہوتی تھی، ہمیشہ یہ فرماتے تھے، ٹھیک ہے: طالبِ علم ہماری اولاد ہوتے ہیں، کوئی اولاد باپ کو قتل نہیں کرتی، کوئی باپ اولاد کو غلط راستہ نہیں دکھاتا، بلکہ غلط راستوں سے روکتا ہے، میرے نزدیک جو بات حق ہوگی وہ آپ لوگوں کو بتاؤں گا؛ مجھے قتل

وغیرہ کی پرواہ نہیں۔

پھر اس کے بعد پاکستان بن گیا، احقر کچھ عرصہ بہاولپور ایک کرایہ کا مکان لے کر رہا تھا، اس سے متصل دوسرا مکان تھا، بیچ کی دیوار دونوں مکانوں کی ایک تھی، کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ برابر میں مولانا ادریس صاحب رحمہ اللہ مقیم ہیں، وہاں مختصر سی ملاقات ہوئی، بعد میں حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کی معیت میں جامعہ اشرفیہ میں عصر کی نماز ادا کی، حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: تنویر احمد خان دیکھو! کسی کونے میں کوئی چادر سر پر ڈالے بیٹھے ہوں گے، وہ مولانا ادریس صاحب ہوں گے، مجھے بتاؤ، مجھے ان سے ملنا ہے۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حضرت سے عرض کیا کہ ایک کونے میں ایک صاحب اس حصے میں بیٹھے ہوئے ہیں، آپ حکم دیں تو میں دیکھ آؤں؟

حضرت مسیح الامت نے فرمایا ضرورت نہیں، وہ مولانا ادریس صاحب ہی ہیں؛ جا کر حضرت نے سلام کیا، انہوں نے چہرہ کھول کر جواب دیا، حضرت بیٹھ گئے اور ان سے گفتگو شروع ہوگئی، مولانا ادریس صاحب رحمہ اللہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرنے لگے، حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے فرمایا؛ آج کل بہت خراب ہیں، یوپی میں فساد بھی ہو رہے ہیں، پھر حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ نے فرمایا، آپ وہاں کے مسلمانوں کے لیے اور میرے لیے بھی دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے، مولانا نے فرمایا آپ پاکستان آ جائیے؟

حضرت نے جواباً فرمایا یہ تو میرے لیے کچھ مشکل نہیں لیکن ہزاروں آدمی جو اس سہارے پر وہاں مقیم ہیں کہ میں وہاں موجود ہوں، اگر میں وہاں سے ہجرت کر کے چلا آیا تو ان کا کیا حال ہوگا؟ اور جو وہاں سے پاکستان آئیں گے وہ یہاں کیسے آباد ہوں گے؟ اس لیے میں وہاں سے نہیں آ سکتا۔

بس آپ دعا فرمائیں، جواب میں مولانا ادریس صاحب رحمہ اللہ فرمایا آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن آپ مستجاب الدعوات ہیں، آپ ہمارے لیے اور ان کے لیے دعا فرمائیں، اور میری دلیل یہ ہے کہ آپ دارالحرب میں رہتے ہیں، دوسرے آپ سفر میں ہیں دونوں باتیں قبولیتِ دعا کے لیے کافی ہیں، بس یہ آخری ملاقات تھی، اس کے بعد ایک مرتبہ کسی کام کے سلسلے میں ضیاء الحق مرحوم

سے ملنا تھا، تو میں ایک سفارشی خط لینے کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، بڑے خوش ہوئے، خط بھی مرحمت فرمایا اور اپنی تفسیر معارف القرآن کی سات جلدیں بھی بطور ہدیہ اس احقر کو عنایت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمہ اللہ کے درجات بلند فرمائے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک فضل

یہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل اور بزرگوں کی دعاؤں کا صدقہ ہے کہ بندہ کا اس پیرانہ سالی کی عمر میں سفر وحضر جاری رہتا ہے، ہندوستان کے علاوہ یورپ وغیرہ ممالک میں بھی اسفار رہتے ہیں، اور بحمداللہ تعالیٰ کسی خادم یا چھڑی وغیرہ کے سہارے کے بغیر چلنا پھرنا ہوتا ہے، اور الحمدللہ نماز بھی کھڑے ہوکر اور کامل رکوع وسجود کے ساتھ ادا ہوتی ہے، دیکھنے میں چشمہ کی ضرورت پیش نہیں آتی، قوتِ سماعت اور قوتِ گویائی بھی الحمدللہ تعالیٰ سلامت ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ باقی زندگی بھی وہ اپنے فضل وکرم سے محتاجی کے بغیر گزروادیں۔

میری اصلاح وتنبیہ کا انداز

جہاں تک ڈانٹ ڈپٹ کا تعلق ہے یہ میں نہیں کرتا لیکن جہاں تک تنبیہ کرنے کا تعلق ہے وہ میں ضرور کرتا ہوں، اس لئے کہ اگر وہ نہ کی جائے تو خیانت ہے، یعنی یہ نہ بتانا کہ فلاں بات غلط ہے، یہ تو میں ضرور کہہ دیتا ہوں کہ یہ بات ایسے نہیں یوں ہے، لیکن ڈانٹ ڈپٹ کا میرے اندر کوئی انداز نہیں ہاں جب کوئی بہت ہی زیادہ اپنے معاملات بگاڑ لیتا اور بہت زیادہ بے پرواہ ہو جاتا ہے، اس وقت تکلیف ہوتی ہے کہ اگر یہ تعلق رکھتا، حالات کی اطلاع دیتا رہتا، تو یہ پریشانی اس کو نہ ہوتی، تو اس وقت اس کو کسی موقع پر ڈانٹ دیتا ہوں، اصل میں تو یہ بھی تنبیہ ہی ہوتی ہے جو ڈانٹ کے انداز میں آجاتی ہے، کہ آخر تم کیا کرتے رہے اور کیا کررہے ہو۔

یہاں تک کہ خلافِ شرع امور میں جو دیکھتا ہوں ان میں سے بہت سے امور ایسے ہیں جن کے بارے میں میں فی الفور تنبیہ نہیں کرتا، مثلاً ایک مرید ہے اس نے داڑھی نہیں رکھی ہوئی، وہ مجھ سے

بیعت ہو گیا، تو میں ایک خاص وقت تک جب تک دل پر یہ وارد نہ ہو کہ اب یہ بات کہنی چاہئے اس وقت تک میں اسے یہ نہیں کہوں گا کہ تم داڑھی رکھ لو، یا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ میرے کہنے سے پہلے ہی رکھ لیتا ہے، یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ میں نے کہا تو اس نے رکھ لی، میں ان معاملات میں بہت وسیع النظر ہوں۔

اور وہ باتیں جو اخلاق سے متعلق ہیں اور جن کا مرید کو علم نہیں ہوتا یہ قابلِ اطلاع چیز ہے، اس کا بتانا تو بہت ضروری ہے، مگر جو عام معروف چیزیں ہیں، مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا ہے اب اسے کیا بتائیں، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ نماز پڑھنی چاہئے، ان امور میں میں صراحتاً ایک خاص وقت تک نہیں بولتا، اشارۃً، کنایۃً اس کے اوپر ڈال کر تو بات کہہ دیتا ہوں، کیونکہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ ایسا ہی رہا ہے، اور اسی میں زیادہ فائدہ محسوس ہوتا ہے۔

بہرحال یہ ساری باتیں زبانی کلامی طریقہ سے پوری طرح سمجھ بھی آنا مشکل ہیں، ان کے لیے مزاج کا درست ہونا اور تربیت کا ہونا ضروری ہے، جس کو ذوق کہنا چاہیے؛ جب ذوق بن جاتا ہے، تو کھٹا، میٹھا، کڑوا ذائقہ بھی محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک خان صاحب آیا کرتے تھے، تو وہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے رکھتے تھے، ایک زمانہ تک آتے رہے، ان سے کچھ کہا نہیں، ایک زمانہ گذرنے کے بعد ایک دن علیحدہ ان کو لے گئے، اور ان سے یہ کہنے لگے کہ خان صاحب میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ کبھی کبھی میرا پاجامہ ٹخنے سے نیچے چلا جاتا ہے، تو مجھے کچھ وہم ہوتا ہے اب جب جھک کر دیکھتا ہوں تو ٹخنے سے نیچے ہوتا ہی ہے، جب سیدھا کھڑا ہو جاتا ہوں تو نظر نہیں آتا، تو میں سیدھا کھڑا ہو رہا ہوں آپ میرا پاجامہ دیکھ لیجئے کہ وہ ٹخنے سے نیچے تو نہیں، اس نے کہا اجی آپ کا پاجامہ نیچے کہاں ہوتا ہے وہ تو اس نابکار کا ہی ہوتا ہے، ان شاء اللہ آج کے بعد یہ نہیں ہوگا۔

تو دیکھیے! حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے ایک زمانہ کے بعد خان صاحب کو یہ بات کہی، ظاہر ہے کے خان صاحب میں جب اس کی صلاحیت پیدا ہوگئی کہ وہ اس بات کو سمجھ کر اس پر عمل کریں، جب ہی

تو ان سے کہا، ورنہ یہ کہنا کچھ بیکار سا ہوتا ہے۔
اس لئے میں اصلاح کے معاملہ میں یہ طرز اختیار کرتا ہوں۔

میں کس مرید سے خوش ہوتا ہوں؟

خوش میں اس شخص سے بہت زیادہ ہوتا ہوں جو اپنی الٹی سیدھی باتیں مجھے بتاتا رہے، جیسے بھی ہے ،چاہے وہ اچھی ہوں یا بری ہوں، بس وہ مجھے بتادے، اب اس میں ایسے ایسے بھی واقعات ہیں کہ میں ان کو پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا ہوں، ایک صاحب نے اپنا ایک ایسا واقعہ مجھے لکھا کہ میں اس پریشانی میں مبتلا ہوں، میرا پیسوں کا معاملہ ہے، میرے ذہن میں وہ بات رات بھر کھٹکتی رہی، کہ یااللہ اس کا نہ میرے پاس علاج ہے نہ اس کے پاس علاج ہے، کیا ہوگا؟ کیا کیا جائے؟ صبح تک یہی کیفیت ذہن پر وارد رہی، اب لکھنا یہ تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ کرے، میں نے اس سے کہا کہ تم اللہ کا نام لے کر اس شخص سے معاملہ ختم کر کے اپنا پیسہ واپس لے لو، کہ میں تمہاری یہ شرط نہیں مانتا، پھر جو کچھ ہو، اس کی اطلاع مجھے کرو، بالکل میری اور اس کی توقع کے خلاف یہ بات ہوئی کہ جب اس نے یہ کہہ دیا تو اب یہ خطرہ تھا کہ نہ جانے کیا معاملہ پیش آئے گا اور کیا ہنگامہ ہوگا؟ کچھ بھی نہیں ہوا اور بات ختم ہوگئی، بڑا طبیعت پر اس کا خیال ہوا، بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ہوئی، ورنہ میرے بس کی بات نہیں تھی، یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔

لیکن آج کل کے زمانہ میں بڑی مشکل یہ ہے کہ لوگ اطلاع دیتے نہیں، اور بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے حالات کی اطلاع دیتے ہیں، اطلاع ہونے سے حالات کیسے بھی ہوں اور کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں بس اس سے طبیعت خوش رہتی ہے کہ اس شخص نے اطلاع دیدی۔

میں ایک مثال دے کر بتاتا ہوں کہ ایک میرے متعلق کے خط میرے پاس آتے ہیں جتنی باتیں وہ لکھتا ہے وہ ساری ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک بھی بات کام کی نہیں ہوتی، مثلاً بڑی کوشش کرتا ہوں مگر صبح کی نماز میں آنکھ نہیں کھلتی، ہفتہ میں ایک دو دن اتفاق سے کھل جاتی ہے، اور جب میں نماز پڑھتا ہوں تو نماز میں میرا دل نہیں لگتا، ذکر کرتا ہوں تو دل نہیں لگتا، کبھی کبھی نماز میں بڑا مزہ

آ تا ہے لیکن بہت دنوں کے بعد، ایسی اُوٹ پٹانگ باتیں وہ لکھتا ہے کہ پھر یوں اپنے آپ کو کوستا ہوں اور یوں دعا کرتا ہوں، یوں استغفار کرتا ہوں، اور یوں رات کو محاسبہ کرتا ہوں، اور یوں اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہوں، ساری چیزیں لکھتا رہتا ہے، لیکن ساتھ میں یہ بھی لکھتا ہے کہ ان باتوں میں سے جو آپ نے بتائی ہیں ان پر پوری طرح عمل نہیں کر رہاں ہوں، اور میں بہت بڑا مجرم ہوں، ہر خط میں اسی قسم کی باتیں لکھتا رہتا ہے، میں ان باتوں کے اوپر یہ لکھتا ہوں کہ تم اس زمانے کے سب سے بڑے ولی ہو میری نظر میں۔

کیونکہ ان گناہوں کا اس کو اس شدت سے احساس ہے اتنا مجھے بھی نہیں، میرے نزدیک تو تم مجھ سے بھی افضل ہو، اور ولی ہو، اس احساس کے ساتھ جو تم الٹا سیدھا کام کر رہے ہو بس یہی کرتے رہو، یہ بہت ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اور نہ اس سے زیادہ پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے، یہ میں اسے لکھ دیتا ہوں۔

اس کا اس پر کیا اثر ہوتا ہوگا، یہ تو اللہ بہتر جانے لیکن میں ایسے ہی کرتا ہوں، اگر کوئی ذکر میں کوتاہی کرتا ہے تو کہہ دیتا ہوں کہ چند دفعہ ایک جگہ بیٹھ کر اللہ اللہ کہہ لیا کرو۔

میرا بیعت کرنے میں مزاج

میں بیعت کے معاملہ میں بہت خسیس واقع ہوا ہوں یا یوں سمجھئے کہ سخت واقع ہوا ہوں یا یہ کہ بے نیاز واقع ہوا ہوں، جبکہ مجھے میرے مرشد نے تاکیداً یہ فرمایا کہ شیخ کو اپنا سلسلہ بڑھانے میں حریص ہونا چاہئے، میں نے کہا حضرت حرص تو درکنار خیال بھی نہیں آتا، فرمایا نہیں آتا تو زبردستی پیدا کرو، میں نے کہا یہ میرے بس کی بات نہیں، دوسری بات یہ کہ میں نے جن لوگوں کو بیعت کرنا بھی شروع کیا ہے، ان سب کو بھی میں نے اپنے واسطہ سے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کے دستِ مبارک پر کیا، اپنے ہاتھ پر نہیں کیا، یہ میں نے اپنے شیخ کا ادب رکھا، کہ میں اپنے ہاتھ پر نہیں بلکہ اپنے ذریعہ سے اور اپنے واسطہ سے ان کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں، اور میں نے یہ دیکھا کہ میرے شیخ اب تک اپنے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، یہ ان کی سنت ہے اور میں اپنے شیخ کی زندگی میں

اس سے زیادہ یہ بھی کرتا رہا ہوں کہ میرا مرید اگر میرے شیخ کے قیام کے دوران وہاں آ جاتا ، میری موجودگی میں تو میں حضرت سے بلاواسطہ بھی بیعت کرادیتا، لیکن میں نے حضرت کو یہ کبھی نہیں بتایا کہ میں اس انداز سے بیعت کرتا ہوں، یا ان کو آپ سے بیعت کرادیتا ہوں، یہ الگ بات ہے کہ حضرت کو کسی اور ذریعہ سے معلوم ہو ہی گیا ہوگا، بعد میں ایک مرید سے حضرت نے پوچھا کہ تم پہلے کس سے بیعت ہو تو اس نے میرا نام لیا، پھر پوچھا اچھا مجھ سے کیوں بیعت ہو رہے ہو؟ اس نے کہا مجھے انہوں نے ہی کہا کہ جا کر حضرت سے بیعت ہو جاؤ، اس پر حضرت مسکرائے اور بیعت فرمالیا، مجھ سے بیعت ہونے والوں کی تعداد مجھے معلوم نہیں اس لئے میں نے کبھی گنتی کی نہیں، لیکن ان کی تعداد اچھی خاصی ہے، پاکستان میں پشاور سے کراچی تک کے لوگ مجھ سے بیعت ہیں، اور دوسرے ممالک میں بھی ہیں، افریقہ اور امریکہ وانگلینڈ میں بھی بہت ہیں، میں نے ایک بات کسی وقت اپنے حضرت رحمہ اللہ سے کہی چاہے وہ کسی ناز میں کہی یا انداز میں کہی بہرحال کہہ دی، میں نے کہا کہ حضرت اس وقت جو آپ سے بیعت ہوتے ہیں یا جو آپ کے ہاتھ چومتے ہیں اور جو آپ کے اوپر اپنی جان نچھاور کرتے ہیں اور ہر وقت آپ کے پروانے بنے ہوتے ہیں، یہ بات میں ان کے کمال کی نہیں سمجھتا، کیونکہ اس وقت آپ ہیں ہی ایسے، کہ لوگوں کو آپ کے ساتھ یہی کرنا چاہیئے، لیکن ہم تو آپ کے اُس وقت کے عاشق ہیں جب آپ کو کوئی نہیں جانتا تھا، ہمارے میں اور ان میں بہت فرق ہے، حضرت نے فرمایا تنویر ہم نے تمہیں کبھی مرید تو سمجھا نہیں ، اپنا دوست ہی سمجھتے رہے، کہ آپ ہمارے دوست ہیں یہ دوسری بات ہے کہ تم اپنے آپ کر مرید سمجھتے رہو۔

اور آپ یہ اندازہ لگایئے کہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر میں بیعت ہوا نہیں ہوں، بلکہ یونہی بلا بیعت اصلاح کا سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ مجھے خلافت بھی مل گئی، اس کے بعد جب حضرت تشریف لائے پشاور میں تو میں نے ایسے ہی کہا کہ حضرت اس طریقہ سے ہاتھ میں ہاتھ دیکر تو آپ نے مجھے بیعت کیا نہیں، جس طریقہ سے آپ لوگوں کو کرتے ہیں، فرمایا اب ہو جاؤ، میں نے کہا بہت اچھا ہو جاتا ہوں، اور اس وقت حضرت نے ہاتھ

میں ہاتھ لے کر بیعت فرمایا۔

اس وقت مجھ سے سب سے زیادہ میرے رشتہ دار بیعت ہیں، حالانکہ یہ میرے ذہن میں پہلے بالکل نہیں تھا کہ میرے رشتہ دار مجھ سے بیعت ہوں گے، لیکن یہ معاملہ میرے ساتھ برعکس ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میری پوری زندگی ان کے سامنے ہے، ان کا بیعت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر بات سے محفوظ رکھا ہے، اگر وہ ایسی ویسی کوئی بات دیکھتے تو میرے عقیدت مند کیوں ہوتے؟ حالانکہ میں رشتہ داروں کو بہت کم بیعت کرتا ہوں، جب وہ مجھے بہت تنگ کرتے ہیں، اس وقت کرتا ہوں، ورنہ ٹال دیتا ہوں، میری چچیاں مجھ سے بیعت ہیں، میرے چچازاد بھائی بیعت ہیں، میری چچازاد بہنیں بیعت ہیں، میرے چچا بیعت ہیں۔

عورتوں کے بیعت کے وقت تو ان کے شوہر موجود ہوتے ہیں ویسے ظاہر ہے کہ شوہر کی اجازت ضروری ہے، میرے ساتھ عام طور سے یہی ہوا ہے کہ شوہر موجود ہیں یا شوہر پہلے سے بیعت ہیں تو اس طریقہ سے وہ بیعت ہو جاتی ہیں۔

بڑے چچا کو میں نے بیعت کی اجازت بھی دی ہوئی ہے، وہ پنڈی میں رہتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ گھر والوں نے تمہاری قدر نہیں کی، اس لئے کہ ہمارے خاندان میں یہ تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا کہ راجپوتوں کے خاندان میں اس طریقہ سے ایسا کوئی ولی پیدا ہوگا جو عالم بھی ہوگا، اور اس کے ساتھ ساتھ صاحبِ سلسلہ بھی، اگرچہ بزرگ تو ہمارے خاندان میں بہت ہوئے ہیں لیکن صاحبِ سلسلہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے صرف تمہیں ہی یہ نعمت ایسی دی ہے جو ہمارے خاندان میں پہلے نہیں تھی۔

میرا خلافت دینے میں طرزِ عمل

میں خلافت دینے کے بارے میں بہت کنجوس ہوں، لیکن دی ہے، مگر کم۔

اصل میں خلافت کے دو انداز ہیں، ایک تو یہ کہ جس شخص کو خلافت دی جائے، اس کے متعلق شیخ پر یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ آدمی اس کا اہل ہے اور یہ اہلیت آج سے دس سال بعد پیدا کر لے گا، لیکن تم اسے

خلافت ابھی دیدو، کیونکہ تم دس سال تک تو ہوسکتا ہے کہ زندہ نہ رہ سکو، ایسے بھی واقعات ہوتے ہیں کہ بزرگ ان کو اجازت دے گئے اور ساتھ میں یہ بھی کہہ گئے کہ تم کو اس سے بحث نہیں کہ تم اس کے اہل ہو یا نہیں؟ تم اہل ہو جاؤ گے۔

اور ایک خلافت ایسی ہوتی ہے کہ اس کو اہلیت کی بناء پر اور لوازمات کے پیدا ہونے پر دی جاتی ہے۔

یہ دو انداز ہیں بزرگوں کے، پہلے انداز کی خلافت جس کو دی جاتی ہے وہ اس کے لئے بڑی الجھن کا بعض دفعہ سبب بن جاتی ہے، اس سے یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ناشکری نہ کر بیٹھے، کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جو سلسلہ اور نسبت کے صریح خلاف ہو، اس لیے اس سے طبیعت میں انقباض ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دی جائے یا نہیں؟

میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ درخواست کی ہوئی ہے کہ فوج تو پالنی نہیں، دو چار آدمی کام کے دے دیجئے، اس سے زیادہ مجھے نہیں چاہئے، میرا تو یہ انداز ہے، میں تو یہ کہتا ہوں کہ دو آدمی ہوں مگر اچھے اور کام کے، اور قدرت ان سے کام لے۔

یہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ فوج ہو اور وہ کسی کام کی نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑوں کے طرز کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی، جن کے پیشِ نظر کام تھا، فوج جمع کرنا نہیں تھا، حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ تو بار بار فرمایا کرتے تھے کہ کام کے عام ہونے سے زیادہ اہمیت اس کے تام ہونے کی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بڑوں کی اس سوچ پر پورا اُترنے کی توفیق دیں۔ آمین

سالکین کے لئے رات دن کے معمولات

حضرت والا نے اپنے متوسلین کے لئے رات دن کے معمولات اور وظائف مرتب فرمائے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(نمبر۱)......نمازوں کی قضا اس طرح کہ ہر نماز وقتی کے ساتھ جماعت سے قبل یا بعد جماعت اس وقتی قضا کے صرف فرض ادا کرنا اور عشاء میں وتر بھی اور فرصت اور ہمت کے ساتھ ایک وقت میں یا ایک دن میں کئی کئی وقت یا کئی کئی نمازوں کو ادا کر لینا۔

(نمبر۲)......کسی کا مالی حق اپنے ذمہ ہو اس کو ادا کرنا یا معافی مانگنا۔

(نمبر۳)......شرعی احکام کا اتباع: آنکھ، کان، زبان کی پوری نگرانی کرتے رہنا اور حرام اور مشتبہ مال سے پوری احتیاط رکھنا، وضع قطع، لباس، شکل، صورت سنت کے مطابق رکھنا، شادی، غمی کے موقعہ پر رسومات و بدعات اور خلافِ شرع باتوں مثلاً گانے بجانے ڈھول باجے، گیت، نیوتے اور دکھاوے وغیرہ سے بچنا، ہر معاملہ میں ناجائز اور ناجائز طریقوں سے بچنا اور اس کا پورا خیال رکھنا کہ کسی کو اپنے ہاتھ، زبان یا کسی دوسرے عضو سے کسی بھی قسم کی مالی، قلبی اور جسمانی تکلیف و رنج اور نقصان نہ پہنچے، کسی کی دل شکنی نہ ہو، اختلاط اور بے جا تعلقات سے گریز کرنا، بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت ملنا جلنا اور بغیر ضرورت کے گفتگو اور بات چیت کرنے سے بھی پوری احتیاط کرنا۔

غرض یہ کہ پوری زندگی سنت کے مطابق گذارنے کی کوشش کرتے رہنا۔

(نمبر۴)......حسبِ فرصت تلاوتِ قرآن شریف و مناجاتِ مقبول، ایک تسبیح درود شریف۔ چلتے پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے کلمۂ طیبہ کا ورد رکھنا، اور اس طرح پر کہ لا الہ الا اللہ پڑھتے رہیں، اس کو پانچ مرتبہ کہنے کے بعد یا سانس ٹوٹنے پر محمد رسول اللہ ﷺ ملالیا کریں۔

(نمبر۵)......ہر نماز کے بعد اگر آیۃ الکرسی یاد ہو تو اس کو پڑھ کر تسبیح فاطمہ کی ایک تسبیح پڑھا کریں، یعنی ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ

لیا کریں، یا بشرطِ فرصت ظہر، مغرب اور عشاء میں بعد آیۃ الکرسی تیسرا کلمہ سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کی ایک تسبیح پڑھ لیا کریں۔

(نمبر۶)......بعد عشاء سونے سے پہلے محاسبہ ومراقبۂ موت کرنا:

محاسبہ یہ کہ صبح اٹھنے کے وقت سے رات کو سونے کے وقت تک اپنے اعمال کا جائزہ لینا اور عبادات وطاعات اور نیک اعمال کے سرزد ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مزید توفیق طلب کرنے کی دعا اور کوشش وہمت کرنا، اپنی کوتاہی اور نامناسب باتوں کے سرزد ہونے پر شرمندگی اور اپنے آپ کو ملامت کرنا اور پھر اس پر استغفار کرنا۔

مراقبۂ موت یہ کہ نزع کی حالت اور قبر میں سوال جواب، میدانِ حشر، حساب وکتاب، حق تعالیٰ کے سامنے پیش اور جوابدہ ہونے، پلِ صراط سے گزرنے وغیرہ کو سوچنا اور عہد کرنا کہ آئندہ کسی گناہ کے پاس نہ جاؤں گا۔

اس عمل کے بعد ایک تسبیح استغفار کی پڑھنا۔ استغفار یہ ہے:

''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ لَااِلٰہَ اِلَّاھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ.

(نمبر۷)......اپنے آپ کو سب سے کم تر جاننا، حتّٰی کہ اپنی آنکھوں سے بھی کسی کو کیسا ہی برے سے برا کام کرتے ہوئے دیکھا جاوے تب بھی اس عمل کو برا جانتے ہوئے اُس عامل وفاعل کو حقیر نہ جاننا، اپنے کو اس سے اچھا نہ سمجھنا بلکہ یہ ڈر اور خیال کرنا کہ ممکن ہے کہ یہ شخص پختہ توبہ کر کے نہایت درجہ متقی اور پرہیز گار ہو جائے اور میں خدانہ کرے شیطان اور نفس کے بہکانے اور اغوا کرنے سے پھسل جاؤں اور یہ طاعات وعبادات قائم نہ رہیں، نہ خاتمہ کا علم ہے، نیز ممکن ہے کہ دوسرے کا کوئی ایسا عمل جو میری نظر سے پوشیدہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قابلِ قدر ہو اور میرا کوئی عمل جس کی طرف میری اس وقت توجہ نہیں اس کی وجہ سے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسرے کے مقابلے میں

کمتر وحقیر ہوں ،اس لئے کیا منہ ہے کہ اپنے کوکسی سے اچھا جانا جائے اور دوسرے کو حقیر سمجھا جائے

تنبیہ: یہ ساتواں جز یعنی اپنے کوکم سمجھنا سلوک میں اول قدم ہے، بغیر اس کے راستہ نہیں کھلتا۔

(نمبر۸)......معمولاتِ ذکر: دوازدہ تسبیح یعنی دو تسبیح لا الہ الا اللہ کی اس کو نفی اثبات بھی کہتے ہیں، چار تسبیح الا اللہ کی ، چھ تسبیح اللہ اللہ اور ایک تسبیح اللہ اللہ کی ،اس کے لئے فرصت نہ ہونے پر صرف پانچ منٹ روزانہ کوئی وقت مقرر کر کے ذکرِ اثبات ونفی اس طرح کہ چند بار لا الہ الا اللہ کا ورد کر کے محمد رسول اللہ ﷺ ملاتے رہیں، یا صرف پانچ منٹ ذکر اسمِ ذات اللہ اللہ کر لیا کریں۔

نفل نماز: اشراق، چاشت، اوابین، تہجد۔

نفل روزے: ایامِ بیض یعنی ہر ماہ کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کے تین روزے، عید الفطر کے بعد چھ روزے جنہیں شش عید کے روزے کہا جاتا ہے، ماہِ ذی الحجہ کی ابتدائی تاریخوں کے نو روزے یا صرف نو ذی الحجہ کی تاریخ کا ایک روزہ ، ماہِ محرم کے دو روزے یعنی دسویں، گیارہویں یا نویں، دسویں تاریخ کے، ماہِ شعبان کی ۱۵ تاریخ کا ایک روزہ۔

(نمبر۹)...... اپنے شیخ کی عقیدت اور محبت پوری طرح دل میں رکھنا اور یہ سمجھنا کہ اس وقت موجودہ زمانے کے بزرگوں میں سب سے زیادہ باطنی نفع مجھے اپنے شیخ کے علاوہ کسی اور سے نہیں ملے گا۔

(نمبر۱۰)...... اگر شیخ کی صحبت میسر ہو تو اسے حاصل کرے اور جب بھی ضروریات سے فرصت ملے تو خدمتِ شیخ میں حاضر ہو اور با ادب بیٹھے۔

(نمبر۱۱)...... شیخ کے پاس بیٹھ کر تسبیح یا کوئی وظیفہ وغیرہ نہ پڑھے، بلکہ ہمہ تن ان کی باتوں کو غور سے سنے۔

(نمبر۱۲)...... ایسا کوئی عمل نہ کرے جس سے شیخ کو ایذاء ہو، اگر کبھی خدانخواستہ

ایسا ہو جائے تو فوراً معافی مانگ لے، اور عذر کرنے یا بہانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔

(نمبر۱۳)......نماز پنجوقتہ باجماعت کی عادت ڈالے اور بلا عذر تارکِ جماعت نہ بنے۔

(نمبر۱۴)......کم عمر نابالغ بچوں سے ملنے جلنے اور بے تکلف ہونے سے بچے، خصوصاً تنہائی کی حالت میں بالکل نہ ملے۔

(نمبر۱۵)......تضییعِ اوقات سے بچنے کا بہت زیادہ خیال رکھے، لوگوں میں بیٹھنا، ادھر ادھر کی گپیں مارنا، مذہبی یا سیاسی بحث کرنا، اس قسم کی تمام فضولیات سے بچنے کی پوری طرح نگرانی کرے۔

(نمبر۱۶)......جو کام ملازمت یا تجارت جو کچھ بھی کرتا ہو، دیانت داری سے کرے، وقت کی پابندی اور ذمہ داری کا پورا لحاظ کرے، خصوصاً ملازمت پیشہ حضرات، دفتر کی اشیاء، کاغذ، پنسل، سیاہی یا ٹیلی فون ذاتی کام کے لئے استعمال نہ کریں۔

(نمبر۱۷)......بجلی، گیس، ٹیلی فون وغیرہ کے ناجائز استعمال، ریل گاڑی اور مقامی بسوں میں ٹکٹ نہ لینے، اور کسی قسم کا بھی سرکاری حق دبا لینے سے بچنا بہت ضروری ہے۔

(نمبر۱۸)......اپنے عہدے یا منصب سے کسی بھی قسم کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے، نہ ہی کسی دوسرے کو ناجائز فائدہ پہنچائے۔

(نمبر۱۹)......بے جا غصہ ہرگز نہ کرے خصوصاً کمزوروں اور ماتحتوں پر، اور یہ سوچ لیا کرے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور یہ میری جگہ تو میرا کیا حال ہوتا۔

(نمبر۲۰)......حتی الامکان جائز کام کے لئے اگر کوئی رشوت طلب کرے تو نہ دے، اگر مجبوری ہو تو کسی عالم سے دریافت کر کے عمل کرے۔

(نمبر۲۱)......ماں باپ، عزیز و اقارب اور بزرگوں کی عزت کرے۔

(نمبر۲۲)......اگر فرصت ہو تو بعد نمازِ فجر سورۂ یٰسین، بعد نمازِ ظہر سورۂ فتح، بعد نمازِ عصر سورۂ نباء، بعد نمازِ مغرب سورۂ واقعہ، بعد نماز عشاء سورۂ ملک یا الم سجدہ پڑھ لیا کرے (اس سے بھی زیادہ کی فرصت ہو تو شیخ کے مشورے سے عمل کرے)

شجرۂ نسب حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب مدظلہم

تکوین وتشریع

تشریعی وتکوینی نظام کی تشریح وتفصیل

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات کے ظاہری اور خفیہ یعنی تشریعی وتکوینی نظاموں کا ثبوت وتعارف، اہلِ تشریع وتکوین کی خدمات، ان کی تعداد اور علامات وخصوصیات، مجذوبین کی توضیح، تشریعی وتکوینی نظام کے منکرین کی تردید، تشریعی وتکوینی اولیائے کرام کے سلسلہ میں وارد شدہ احادیث وروایات کی اسنادی حیثیت پر کلام، الہام اور کشف وکرامات کے موضوع پر اہلُ السنۃ والجماعۃ کا معتدل نقطۂ نظر۔

ایک اچھوتے موضوع پر سیر حاصل بحث

از

صاحبِ طریقت وشریعت عارف باللہ

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب دامت برکاتہم

ترتیب

مفتی محمد رضوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تشریع وتکوین کا انسان اور اس کائنات سے تعلق

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسان کے لئے بنایا ہے اور انسان کو اپنی عبادت اور آخرت کے لئے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۃ الذاریت آیت نمبر ۵۶)

اور حدیث شریف میں ارشاد ہے:

اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَخُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ.

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دو قسم کے نظام جاری فرمائے ہیں، ایک تشریعی اور دوسرے تکوینی، پہلا نظام تو واضح ہے شریعت کے سب احکام اس سے تعلق رکھتے ہیں، البتہ دوسرا نظام جو تکوینی ہے، یہ بھی اس عالَم کا حصہ ہے، جس سے عموماً لوگ نہ صرف یہ کہ بے خبر ہیں، بلکہ اس کے منکر بھی ہیں خصوصاً انسان کے ساتھ تکوینی تعلق کے، اور اس طرح کی باتیں سامنے آنے پر نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں، مثلاً یہ بکواس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی تشریعی وتکوینی دونوں نظام اس عالَم کے ساتھ وابستہ فرما دیئے تھے، اگرچہ تکوینی اُمور بغیر کسی کے بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، دوسرے یہ کام فرشتوں اور جانوروں وغیرہ سے بھی لیا جاسکتا ہے بلکہ بعض تکوینی خدمات ان سے بھی لی جاتی ہیں، لیکن دراصل یہ کائنات بنی ہی انسانوں کے لئے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اشرفُ المخلوقات بنایا، اسی جنسِ بشر کو اپنا نائب بنایا، ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً'' (سورہ بقرہ)

اس کو اپنے دستِ مبارک سے تخلیق کے سانچے میں ڈھالا ''خَلَقْتُ بِيَدَيَّ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ''

اوراس کی جبلت میں اپنی بعض صفاتِ عالیہ کا عکس ڈالا، اس کی بناوٹ تمام مخلوقات سے حسین وبہترین بنائی ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ''

اس کو مسجودِ ملائکہ بنایا ''فَسَجَدَالْمَلٰئِکَةُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ''

اپنی امانتِ خاصہ کا اس کو حامل بنایا ''اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ''

اس کو قرآن کا علمِ عظیم بھی اپنی رحمت سے عطا فرمایا ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ''

اس کو حیوانِ ناطق بنایا، بیان کرنے کی، تقریر کرنے کی تمام اقسام کی صلاحیتوں سے نوازا۔ ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ''

اس کو تحریر کرنے اور لکھنے کی صفت بھی عطا کی ''عَلَّمَ بِالْقَلَمِ''

اور وہ باتیں جو یہ نہیں جانتا تھا وہ بھی اس کو بتائیں ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ''

جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر موجود ہے اس کو اس کے لئے مسخر اور تابع بنایا ''وَسَخَّرَلَکُمْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَمَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًامِّنْهُ''

اس کو جسمانی، نفسانی، اور روحانی نعمتوں سے نوازا، اسی کو نبوت ورسالت کے لئے منتخب فرمایا، اسی کو تکلم کیلئے چنا اسی کو وحی عطا کی، اسی کو سدرۃُ المنتہٰی سے عرشِ معلٰی تک پہنچایا، اسی کو عزت وکرامت عطا کی، اور اپنی تمام نعمتوں کا اسی پر اتمام کیا۔

اس لئے اس کائنات کے بہت سے تکوینی کام بھی انسان ہی کے شایانِ شان تھے۔

آغازِ تخلیق میں حضرت آدم علیہ السلام کو تشریعی وتکوینی علم عطا ہوا، موجودات کی امہات وخواص وصفات واصول وکلیاتِ لغات کا متنا ہی اور مجمل علم حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سکھا دیا تھا (کذافی ''البدائع صفحہ ۱۴۰'' بدیعہ نمبر ۳۳) ''وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا''

فرشتوں کے پاس وہ علوم نہیں ہیں، ان کو بقدرِ ضرورت جو کچھ بتایا ہے وہ بس اتنا ہی جانتے ہیں، پھر آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے حضرت حواء علیہا السلام کا پیدا ہونا، جنت میں رہنا، شجرۂ ممنوعہ کا کھانا، جنت سے نکلنا، زمین پر آنا، دونوں کی ملاقات کا ہونا اولاد کا پیدا ہونا، ان کے نکاح اور توالد

وتناسل کا سلسلہ شروع ہونا، ان سب چیزوں میں تکوین اورتشریع دونوں ساتھ ساتھ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جو تکوینی وتشریعی علم آدم علیہ السلام کو دیا، وہ علم بتدریج آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو منتقل ہو رہا ہے، ان تمام معلومات، ایجادات کے لئے ایک وقت اور ایک امت کا تعین ہوا ہے۔

انسان ہی کے لئے یہ کائنات سجائی گئی، اور اس کی تمام تخلیقات کو انسان کے لئے مسخر بنادیا "وَسَخَّرَلَکُمْ مَّافِی السَّمٰوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًامِّنْہُ " یہ تسخیر دو معنیٰ میں ہے، ایک یہ کہ انسان ان کو اپنا تابع بنائے اوران سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے، دوسرے یہ کہ وہ اپنے فوائد ومنافع کے ساتھ انسان کے لئے خدمت گار رہیں، "وَسَخَّرَلَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَیْنِ "سورج کی روشنی اور تمازت سے کیا کچھ فوائد ارادی اور غیر ارادی طور پر حاصل ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح چاند کے فوائد کا معاملہ بھی ہے۔

انسان کی تخلیق کا مقصد صرف پیدا ہوکر بچے پیدا کرنا، مکان بنانا، انواع واقسام کے کھانے کھانا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے، جس کا ایک طریقہ تخلیقات کی صنائع وبدائع کو معلوم کرنا اوران کو ظاہر کرنا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور اس کی صفاتِ عالی کا ادراک ہوسکے، اسی لئے ستارے، سیارے پر پہنچنا اور دریافت ہونا دین اسلام کے خلاف نہیں۔

سورۂ طلاق میں ہے "اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَھُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا " اس سے معلوم ہوا کہ چھ زمینیں اور ہیں جو اسی زمین کی طرح ہیں۔

انسان ان زمینوں کو دریافت کرسکتا ہے، تاکہ "لِتَعْلَمُوْا" تم یہ جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، "لِتَعْلَمُوْا" اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا بندوں کو علم ہوگا، اب یہ کہ وہ کس جگہ واقع ہیں ان کی دریافت آج کل کی سائنسی دنیا میں کوئی تعجب خیز بات نہیں رہی۔

پہلی امتوں کو یہ فہم، عقل وادراک نہیں عطا ہوا، اس امت کو مخصوص کیا اس بات کے لئے کہ عجیب وغریب ایجادات، مصنوعات اس کو عطا ہونگیں، اس لئے کہ جہاں نبوت کا حضور اکرم ﷺ پر اختتام

ہوا وہاں وہ نعمتیں جو انسان سے وابستہ ہیں، وہ بھی ساری اس امت کو عطا ہوئیں۔

ارشاد ہے:

''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا''

ایک تو تکمیلِ دین ہے کہ قیامت تک کے لئے چاہے جیسے حوادث آئیں، چاہے جیسی ایجادات آئیں، یہ دین اپنی پوری تکمیل کے ساتھ جاری رہے گا، اور کسی جگہ کسی مرحلہ پر متغیر نہیں ہوگا، اور دوسرے اپنی نعمت مکمل طور پر اس امت پر تمام کر دی، جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہوا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے دنیا میں مقدر تھا وہ سب کچھ اس امت کو عطا فرما دیا، ہر چیز کی انتہاء عطا کر دی گئی ہے۔

اسی لئے سابقہ امتوں میں کوئی زمانہ اس طرح کی ایجادات کا نہیں آیا یہاں تک کہ دو پہیوں کی سائیکل تک بھی سابقہ امم میں ایجاد نہیں ہوئی، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کے لئے مخصوص فرما دیا تھا، چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ظہور ہو رہا ہے کیسی کیسی ایجادات جو برقیات سے متعلق ہیں، کیسی کیسی مشینیں، سواریاں، ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر، کیسے کیسے ہولناک ہتھیار، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، میزائل ٹیکنالوجی وغیرہ۔

پھر ایٹم کی دریافت کر کے صرف آلات ہی نہیں بلکہ اس سے ایندھن کا بھی کام لیا جا رہا ہے۔

اس دنیا میں پہلے انسان لکڑیوں کوئلوں سے ہی ایندھن کا کام لیتا تھا مگر اب موجودہ زمانے میں وہ سب کچھ خواب ہو گیا، اب انسان بجلی اور گیس سے ایندھن کا کام لے رہا ہے، پٹرولیم کی مصنوعات سے مشینوں کو گاڑیوں کو ریل اور ہوائی جہاز کو چلا رہا ہے، برسوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں طے کر رہا ہے۔

یہی نہیں بلکہ سورج کی روشنی سے استفادہ کر کے گاڑیاں چلا رہا ہے، گوبر سے بجلی پیدا کر رہا ہے؛ پوری دنیا ایک شہر، ایک محلّہ بلکہ ایک گھر کی طرح ہو گئی ہے، کہ سب جگہوں کی خبریں اور معلومات لمحہ بہ لمحہ گھر بیٹھے معلوم ہو رہی ہیں۔ اللہ اکبر

وہ قلم جس کی اللہ تعالیٰ نے انسان کو تعلیم دی ، پہلے ''درخت کی شاخ''نیزے سے شروع ہوا اوردرخت کے پتے اورکھال پر اس سے لکھنا شروع کیا گیا، پھر قلم کی حالت بدلی ،لوہے کی نب آئی ،فونٹین پین آیا، پھر کھال اور پتوں کی بجائے کپڑا اور کاغذ آیا،اور کتابوں کی شکل سامنے آئی ،اس کے بعد پرنٹنگ پریس اور مشین، ٹیپ ریکارڈ ،ٹائپ مشین، سائیکلواسٹائل مشنری ،فیکس مشین ،انٹرنیٹ وغیرہ یہ سب کچھ سامنے آ کر قلم وکتابوں کی شکل میں ترقی کرتے رہے۔

پھر یہ قلم اور کاغذ کمپیوٹر میں تبدیل ہوگیا، پھر ان تحریرات کو برقی آلات کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیلا دیا،ایک جگہ بیٹھ کر ساری دنیا سے بات چیت تحریر کے ذریعہ کرسکتا ہے،انٹرنیٹ سے ساری دنیا کی سیر کرسکتا ہے،ساری دنیا سے آواز کے ذریعہ بھی بات چیت ورابطہ کرسکتا ہے،وہ سیٹلائٹ جو سیاروں پر بھیجے جارہے ہیں ان کے پیغامات زمین پر وصول ہورہے ہیں،اوران پیغامات کی رفتاران کی آمد کا وقفہ بھی معلوم کیا جارہا ہے۔

موجودہ دور جو کمپیوٹر کا دور کہلاتا ہے،اس نے ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

کمپیوٹر کے ذریعہ انٹرنیٹ پر دنیا کی باتیں اورعلوم وفنون محفوظ کئے جارہے ہیں،کوئی سوال جس کا جواب معلوم نہ ہوانٹرنیٹ سے معلوم ہوجاتا ہے،اب آگے چل کر یہ قلم کیا کیا کارنامے انجام دے گا، یہ علم کیا کیا گُل کھلائے گا،آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

یہ بھی اُسی قلم کی ترقی شدہ شکل ہے،جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''عَلَّمَ بِالْقَلَمِ''

قلم کی تعلیم بھی اسی امت پرہورہی ہے۔

کیمروں اوردوربینوں اورسیٹلائٹ وغیرہ کے ذریعے آج انسان دوردراز کی چیزیں دیکھ سکتا ہے، یہ بھی ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ''میں داخل ہے۔

یہاں تک کہ کمپیوٹر آ گیا، ڈسک آ گئی ،ایک چھوٹی سی ڈسک میں ساری دنیا کے انسانوں کے نام تحریر ہوسکتے ہیں ،ایک موبائیل کے میموری کارڈ میں پورا کلامِ مجید اورسی ڈی میں تفسیر، حدیث اورفقہ کی سینکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں آ جاتی ہیں،جس کا حجم 1/2 انچ ہوتا ہے، یہ سب کچھ قلم ہی تو ہے۔

علم کی تکمیل بھی اسی امت پر ہو رہی ہے۔

یہی وہ دور ہے، جس میں انسان کی تقریر اس کے بیان، اس کے الفاظ بغیر تحریر کے ٹیپ ہونے لگے کہ جب چاہیں ان کو سن لیں یا لکھ لیں، یہ بیان کی تکمیل ہے۔

یہ سب کچھ معلومات وتغیرات معمولی نہیں، جب انسان کو یہ قدرت ہے تو اللہ تعالیٰ کی کیا قدرت ہوگی، بہر حال اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی عظمت کا علم، اس کی معرفت لحہ بہ لحہ ظاہر اور حاصل ہو رہی ہے، یہ سب کچھ کہاں تک جائے گا اس کا کسی کو علم نہیں، لیکن ہر شئ کا ارتقاء ایک مقام تک ہوتا ہے، جہاں سے وہ واپس لوٹتی ہے، پھر اس واپسی کا کیا منظر یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے لیکن یہ کائنات کوئی کھلونا نہیں جسے کھیل کر توڑ دیا جائے بلکہ ایک مقصد کے حصول تک یہ سلسلہ جاری رہے گا اللہ تعالیٰ کے صنائع وبدائع تخلیق وتکوین اتنی مختصر نہیں کہ یوں ہی ختم ہو جائے۔

یہ زمانہ علم وایجادات کا ہے، اسے ابھی بہت آگے بڑھنا ہے، پھر یہ واپس لوٹے گا پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمانہ تکوین وتشریع کا مکمل ہو گیا اور قیامت آ گئی۔

پھر پہلی امتوں کے نبیوں کی جو حیثیت تھی اس امت کے اولیائے کرام وعلمائے عظام کو وہ حیثیت دی گئی، جس طرح اس امت کا زمانہ اور عرصہ گزشتہ امتوں سے وسیع ہے، اسی طرح اس امت کی آبادی اور دنیا میں پھیلاؤ کے لحاظ سے کیت ومقدار بھی وسیع ہے۔

اور اسی وجہ سے اس امت کے بے شمار مخصوص افراد کے ساتھ تکوین کا سلسلہ وابستہ کیا گیا ہے۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس امت کے تشریعی اور تکوینی دونوں نظام ہی بہت وسیع حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ قیامت بھی اسی امت پر قائم ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے قیامت سے پہلے اس کائنات کے ''کُنْ'' سے وجود میں آنے والے تکوینی امور کو پوری طرح ظاہر وباہر کرنا ہے۔

اور یہ تکوینی علم اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتے ہیں، اور اگر چہ اللہ تعالیٰ بغیر واسطہ کے بھی اس نظام کو چلانے کی مکمل قدرت رکھتے ہیں، لیکن چونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے اس لئے اس کا سبب ایک نظام کے تحت کر دیا، جو عام انسانوں سے مستور ہے، یہ نظام جاری وساری ہے۔

تکوین وتشریع سے متعلق واقعۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام

تکوینی نظام جس کا اللہ تعالیٰ نے مکمل اظہار حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ میں قرآن مجید میں بیان فرمایا اور گویا کہ یہ واقعۂ تکوین وتشریع دونوں نظاموں کے لئے اصل ماٗخذ اور دلیل وبرہان کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے سب سے پہلے اس واقعہ پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ حضرت موسیٰ وحضرت خضر علیہما السلام کے واقعے کو بخاری ومسلم شریف کی حدیث کے حوالے سے اس طرح نقل فرماتے ہیں:

> رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، تو لوگوں نے آپ سے یہ سوال کیا، کہ تمام انسانوں میں سب سے زیادہ علم والا کون ہے؟ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم میں اپنے سے زیادہ علم والا کوئی تھا نہیں اس لئے) فرمایا کہ ''میں سب سے زیادہ علم والا ہوں'' (اللہ تعالیٰ اپنے مقربِ بارگاہ انبیاء کو خاص تربیت دیتے ہیں اس لئے یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ادب کا مقتضاء یہ تھا کہ اس کو اللہ کے علم کے حوالہ کرتے، یعنی یہ کہہ دیتے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ ساری مخلوق میں اعلم کون ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ ہمارا ایک بندہ مجمعُ البحرین پر ہے، وہ آپ سے زیادہ اَعْلَمُ ہے۔ [1]

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ جن علوم کو ہدایت اور قربِ الٰہی کے حصول میں دخل ہے ان علوم میں کوئی میرے برابر نہیں اور یہ کلام باعتبار معنیٰ اور مقصود کے صحیح تھا، کیونکہ آپ اللہ کے اولوالعزم رسول تھے اور کلیم اللہ تھے، اور صاحبِ توراۃ تھے اور صاحبِ معجزاتِ عظیمہ تھے، اس وقت روئے زمین پر آپ سے بڑھ کسی کو علومِ ہدایت کی معرفت حاصل نہ تھی، مگر لفظ ظاہراً مطلق تھا، مقامِ رسالت کے مناسب یہ تھا کہ علی الاطلاق اپنے کو سب سے بڑا عالم نہ کہتے، سب سے زیادہ علم کی نسبت خداوند ذوالجلال کی طرف مناسب تھی، مقربین کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی بات پر بھی باز پرس ہوجاتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اپنے برگزیدہ بندے کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم دی جائے، موسیٰ علیہ السلام کا جواب اگرچہ باعتبار معنیٰ اور مقصود کے صحیح تھا، لیکن حق تعالیٰ کو یہ الفاظ پسند نہ آئے اس لیے کہ جواب کے ظاہری عموم اور اطلاق سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ روئے زمین پر من کل الوجوہ موسیٰ اعلم الناس ہیں اس لیے بغرضِ تادیب وتنبیہ یہ ارشاد ہوا کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے (یعنی روم اور فارس کے دو سمندر جہاں آپس میں ملتے ہیں) وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ تم سے زیادہ ہے گو ان علوم کو قُربِ الٰہی

﴿بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو﴾

(موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ جب وہ مجھ سے زیادہ اَعْلَمُ ہیں تو مجھے ان سے استفادہ کے لئے سفر کرنا چاہئے) اس لئے عرض کیا یا اللہ! مجھے ان کا پتہ نشان بتلا دیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک مچھلی اپنی زنبیل میں رکھ لو، اور مجمع البحرین کی طرف سفر کرو، جس جگہ پہنچ کر یہ مچھلی گم ہوجائے بس وہی جگہ ہمارے اس بندے کے ملنے کی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے حکم کے مطابق ایک مچھلی زنبیل میں رکھ لی اور چل دیئے ان کے ساتھ ان کے خادم یوشع بن نون بھی تھے، دورانِ سفر پتھر کے پاس پہنچ کر اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے، یہاں اچانک یہ مچھلی حرکت میں آ گئی اور زنبیل سے نکل کر دریا میں چلی گئی، اور (مچھلی کے زندہ ہوکر دریا میں چلے جانے کے ساتھ ایک دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ) جس راستہ سے مچھلی دریا میں گئی، اللہ تعالیٰ نے وہاں پانی کا جریان روک دیا، اور اس جگہ پانی کے اندر ایک سرنگ جیسی ہوگئی، (یوشع بن نون اس عجیب واقعہ کو دیکھ رہے تھے، موسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے) جب بیدار ہوئے تو یوشع بن نون مچھلی کا یہ عجیب معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بتلانا بھول گئے اور اس جگہ سے پھر روانہ ہوگئے، پورے ایک دن ایک رات کا مزید سفر کیا، جب دوسرے روز کی صبح ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سے کہا کہ:

ہمارا ناشتہ لاؤ، کیونکہ سفر سے کافی تکان ہوچکا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ (بمقتضائے الٰہی) موسیٰ علیہ السلام کو اس سے پہلے تکان بھی محسوس نہیں ہوا، یہاں تک کہ جس جگہ پہنچنا تھا، اس سے آگے نکل آئے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ طلب کیا تو

﴿بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ﴾

اور رضائے خداوندی کے حصول میں دخل نہ ہو؛ لہٰذا سائل کے جواب میں اپنے کو مطلقاً اَعْلَمُ النّاس کہنا مناسب نہ تھا بلکہ مناسب یہ تھا کہ جواب کو خدا تعالیٰ کے علمِ محیط پر محوّل کرتے اور کہتے کہ ''اللہ اعلم'' کہ اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، اللہ کے بہت سے مقبول اور مقرب بندے ہیں، سب کی خبر اس کو ہے، اور اسی کو معلوم ہے کہ اس نے اپنے خزانۂ غیب میں سے کس کو کون سا علم عطا کیا ہے؟ فوق کل ذی علم علیم (معارف القرآن کاندھلوی جلد۴ صفحہ ۶۱۹)

یوشع بن نون کو مچھلی کا واقعہ یاد آیا، اور اپنے بھول جانے کا عذر کیا کہ شیطان نے مجھے بھلا دیا تھا کہ اس وقت آپ کو اس واقعہ کی اطلاع نہ کی، اور پھر بتلایا کہ وہ مردہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں ایک عجیب طریقہ سے چلی گئی، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی تو ہمارا مقصد تھا (یعنی منزلِ مقصود وہی تھی جہاں مچھلی زندہ ہو کر گم ہو جائے) چنانچہ اسی وقت واپس روانہ ہو گئے، اور ٹھیک اسی راستہ سے لوٹے جس پر پہلے چلے تھے، تا کہ وہ جگہ مل جائے، اب جو یہاں اس پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس پتھر کے پاس ایک شخص سر سے پاؤں تک چادر تانے ہوئے لیٹا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے (اسی حال میں) سلام کیا، تو خضر علیہ السلام نے کہا کہ اس (غیر آباد) جنگل میں سلام کہاں سے آ گیا؟ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں موسیٰ ہوں، تو حضرت خضر علیہ السلام نے سوال کیا کہ موسیٰ بنی اسرائیل؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں میں موسی بنی اسرائیل ہوں، اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے وہ خاص علم سکھلا دیں جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، اے موسیٰ! میرے پاس ایک علم ہے جو اللہ نے مجھے دیا ہے وہ آپ کے پاس نہیں، اور ایک علم آپ کو دیا ہے جو میں نہیں جانتا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اور میں کسی کام میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ میرے ساتھ چلنے ہی کو تیار ہیں تو کسی معاملہ کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں، جب تک کہ میں خود آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلاؤں۔

یہ کہہ کر دونوں حضرات دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے، اتفاقاً ایک کشتی آئی تو کشتی والوں سے کشتی پر سوار ہونے کی بات چیت کی، ان لوگوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور ان سب لوگوں کو بغیر کسی کرایہ اور اُجرت کے کشتی میں سوار کر لیا، کشتی میں سوار ہوتے ہی خضرت علیہ السلام نے ایک کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک نکال

ڈالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام (سے نہ رہا گیا) کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بغیر کسی معاوضہ کے ہمیں کشتی میں سوار کرلیا، آپ نے اس کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی توڑ ڈالی کہ یہ سب غرق ہوجائیں، یہ تو آپ نے بہت برا کام کیا۔

خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عذر کیا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، اس بھول پر آپ سخت گیری نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خضر علیہ السلام پر بھول سے ہوا تھا، اور دوسرا بطور شرط کے اور تیسرا قصداً (اسی اثناء میں) ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے دریا میں سے ایک چونچ بھر پانی لیا،

خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا کہ میرا علم اور آپ کا علم دونوں مل کر بھی اللہ کے علم کے مقابلہ میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے، جتنی اس چڑیا کی چونچ کے پانی کو اس سمندر کے ساتھ ہے۔

پھر کشتی سے اُتر کر دریا کے ساحل پر چلنے لگے، اچانک خضر علیہ السلام نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ دوسرے لڑکوں میں کھیل رہا ہے، خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اس لڑکے کا سر اس کے بدن سے الگ کردیا، لڑکا مرگیا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ نے ایک معصوم جان کو بغیر کسی جرم کے قتل کردیا، یہ تو آپ نے بڑا ہی گناہ کیا، خضر علیہ السلام نے کہا کہ کیا میں نے پہلے ہی نہیں کہا تھا، کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کرسکیں گے، موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ معاملہ پہلے معاملہ سے زیادہ سخت ہے، اس لیے کہا کہ اگر اس کے بعد میں نے آپ سے کوئی بات پوچھی تو آپ مجھے اپنے ساتھ سے الگ کردیجیے، آپ میری طرف سے عذر کی حد پر پہنچ چکے ہیں۔

اس کے بعد پھر چلنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک گاؤں پر گذر ہوا، انہوں نے گاؤں والوں سے درخواست کی کہ ہمیں اپنے یہاں مہمان رکھ لیجیے، انہوں نے انکار کردیا، اس

بستی میں ان لوگوں نے ایک دیوار کو دیکھا کہ گرا چاہتی ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے اس کو اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا کہ ہم نے ان لوگوں سے مہمانی چاہی تو انہوں نے انکار کر دیا، آپ نے اتنا بڑا کام کر دیا، اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت ان سے لے سکتے تھے، خضر علیہ السلام نے کہا کہ:

"هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِىْ وَبَيْنِكَ"

(یعنی اب شرط پوری ہو چکی، اس لیے ہماری اور آپ کی مفارقت کا وقت آ گیا ہے)

اس کے بعد خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلا کر کہا:

"ذٰلِكَ تَأْوِيْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا"

"یعنی یہ ہے حقیقت اُن واقعات کی جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا"

رسول اللہ ﷺ نے یہ پورا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور کچھ صبر کر لیتے تو ان دونوں کی اور کچھ خبریں معلوم ہو جاتیں (انتہیٰ)

(معارف القرآن عثمانی جلد ۵ صفحہ ۶۰۶ تا ۶۰۹)

حضرت خضر علیہ السلام نے جدا ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تینوں تکوینی واقعات کی تاویل بھی بیان فرما دی، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

بیانِ تاویل واقعۂ اول:......وہ جو کشتی تھی وہ چند محتاجوں کی تھی جو سمندر میں کرایہ پر چلاتے تھے اور اس کے ذریعہ دریا میں محنت ومزدوری کرتے تھے، اور اسی پر ان کی گذران تھی، سو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں تا کہ کوئی غاصب اس کو عیب دار سمجھ کر نہ چھینے اور عیب کو دیکھ کر اس پر دست اندازی نہ کرے، اور ان لوگوں کے آگے ایک ظالم بادشاہ تھا جو ہر صحیح سالم کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا، میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار ہونے کی وجہ سے غصب نہ کر سکے اور یہ مساکین بعد میں تختہ لگا کر اس کشتی کو درست کر لیں گے۔

؎ گر خضر در بحر کشتی را شکست ‌‌ ‌ صد درستی در شکستِ خضر ہست

یہ باعث تھا میرے اس کشتی توڑنے کا جس پر آپ سے صبر نہ ہوسکا۔ [1]

بیانِ تاویلِ واقعۂ دوم:...... اور وہ جو لڑکا تھا جس کو میں نے مار ڈالا تھا سو بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ ایماندار تھے اور اللہ کو ان کے ایمان کی حفاظت مقصود تھی اور یہ لڑکا اگر بڑا ہوتا تو کافر ہوتا اور ماں باپ کو اس سے غیر معمولی محبت تھی، سو ہم کو اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کو سرکشی اور کفر میں گرفتار کردے، یعنی جب بالغ ہو تو والدین کو بھی کفر پر مجبور کرے، اور وہ اس کی خوبصورتی اور محبت کی وجہ سے اس سے جدا ہونا گوارا نہ کریں گے، اور کفر اختیار کر بیٹھیں اور ہلاکتِ دائمی میں گرفتار ہوں، پس اس طرح لڑکے کا مارا جانا ان کے حق میں مصیبت بنا اور باطن میں اللہ کی رحمت بنا، پس ہم نے اراد کیا کہ اس لڑکے کا قصہ تو تمام کردیا جائے اور ان کا پروردگار اس نالائق اور بدبخت بیٹے کے بدلے میں ان کو ایسی اولاد دے خواہ لڑکا ہو یا لڑکی جو ازراہِ پاکیزگی اس لڑکے سے بہتر ہو، یعنی کفر اور شرک اور معصیت اور بداخلاقی اور بداعمالی سے پاک ہو، اور ایمان اور توحید اور اخلاقِ فاضلہ سے آراستہ ہو اور ازراہِ شفقت ومحبت والدین سے زیادہ قریب ہو، اور احسان اور صلہ رحمی کرنے والی ہو، چنانچہ اس لڑکے کے مارے جانے کے بعد ان دونوں نیک بختوں سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اور وہ ایک نبی سے بیاہی گئی اور اس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوئے، جس سے اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو ہدایت دی، اس طرح سے یہ نیک بخت لڑکی اس بدبخت لڑکے کا بدلہ ہوگئی، ہر بچہ ابتداءً اگرچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، مگر بعض مرتبہ خارجی اثرات کی وجہ سے بعض آدمیوں کی شروع سے ہی بنیاد بری پڑ جاتی ہے، مگر اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے

---

[1] صحیحین کی حدیث میں ہے کہ خضر علیہ السلام نے کلہاڑی کے ذریعہ کشتی کا ایک تختہ نکال دیا تھا، جس کی وجہ سے کشتی میں پانی بھر کر غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا، مگر تاریخی روایات میں ہے کہ پانی اس کشتی میں داخل نہیں ہوا، خواہ اس لئے کہ خضر علیہ السلام نے ہی پھر اس کی کچھ مرمت کردی، جیسے بغوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اس تختہ کی جگہ خضر علیہ السلام نے ایک شیشہ لگا دیا تھا، یا بطور معجزہ (یا بطور کرامت) پانی کشتی میں نہ آیا، اتنی بات خود قرآن کریم کے سیاق سے معلوم ہو رہی ہے کہ اس کشتی غرقابی کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، جس سے ان روایات کی تائید ہوتی ہے (معارف القرآن عثمانی، جلد پنجم، صفحہ نمبر ۶۱۷)

کسی کو نہیں ہوتا، اس لڑکے کی بابت اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو آگاہ کر دیا کہ اس بچہ کی افتاد اور بنیاد بری ہے، بڑا ہو کر خود بھی گمراہ ہوگا اور ماں باپ کو بھی گمراہی میں مبتلا کرے گا، اگر یہ زندہ رہا تو اس کے سبب اس کے ماں باپ ہلاک اور تباہ ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ کو اس کے والدین کے ایمان کی حفاظت مقصود تھی، اس لئے ان کی راہ سے اس روڑہ کو نکال دیا گیا اور حضرت خضر علیہ السلام کا اس لڑکے کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی وحی سے تھا۔

تاویل واقعۂ سوم:......اور رہی وہ دیوار جس کو میں نے مفت سیدھا کر دیا وہ اس شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی جن سے اجرت لینا مناسب نہ تھا، اور اس دیوار کے نیچے ان دونوں کے واسطے ایک خزانہ گڑا ہوا تھا، اگر وہ دیوار گر جاتی اور خزانہ ظاہر ہو جاتا تو لوگ اس خزانے کو لوٹ لے جاتے اور ان کو بسبب صِغر سنی اور کمزوری کے کچھ نہ ملتا، اور ان دونوں کا باپ ایک مردِ صالح تھا، خدا تعالیٰ کو اس کی نیکی کے صلہ میں اس کی اولاد کی حفاظت منظور تھی، سو تیرے پروردگار نے یہ چاہا کہ یہ دونوں لڑکے اپنی قوت یعنی عقل اور بلوغ اور جوانی کو پہنچ جائیں اور اس وقت اپنا خزینہ اور دفینہ نکال لیں، از روئے مہربانی پروردگار نے مجھے اس دیوار کی اصلاح کا حکم دیا اور ایک اشارہ میں سیدھی ہوگئی، اس لئے میں نے اللہ کے حکم سے یہ دیوار مفت سیدھی کر دی، اور میں نے کوئی کام اپنی رائے سے نہیں کیا بلکہ اللہ کے حکم سے کیا، اور جو کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا جائے اس پر مزدوری نہیں لینی چاہئے۔

خاتمۂ کلام:......جب خضر علیہ السلام نے تمام واقعات کی تاویلات بیان کر دیں تو اخیر میں یہ کہا لیجئے یہ ہے باطنی حقیقت ان چیزوں کی کہ جن کے ظاہر کو دیکھ کر آپ میں صبر کی طاقت نہ رہی، آپ شریعت کے ظاہری احکام کی وجہ سے مجبور اور معذور تھے، شریعت میں اس قسم کے افعال کے جواز کی گنجائش نہیں ہوتی، اور میں باطنی احکام کی وجہ سے مجبور اور معذور تھا'' وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ''

اور حسبِ وعدہ میں نے آپ کو ان واقعات کی تاویلات سے آگاہ کر دیا، چنانچہ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام ان سے رخصت ہوئے (معارف القرآن کاندھلوی جلد ۵ صفحہ نمبر ۴ تا ۶)

موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ سے ثابت شدہ فوائد وقواعد

(۱)......حضرت خضر علیہ السلام جو تکوینی امور کی مسلم ہستی ہیں، ان کے جن تکوینی اُمور کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے، اس میں انہوں نے تین کام کئے تھے، پہلا وہ کام جس کا بہت مستقبل قریب سے تعلق تھا، یعنی وہ اگر کشتی نہ توڑتے تو وہ آگے جا کر ضبط ہو جاتی، باقی جو دو کام تھے ان کا مستقبل بعید سے تعلق تھا، پہلے بچہ کو مارنا، اس کا ماں باپ سے تو فوری تعلق یہ تھا کہ ان کو اپنے بچے کی موت کا صدمہ پہنچا، پھر اس کا نعم البدل کچھ عرصہ بعد ملنا تھا، دوسرا مسئلہ جو تھا وہ بہت ہی مستقبل بعید سے تھا کہ ان بچوں کو جوان ہونے کے بعد خزانہ تو مل جائے گا لیکن یہ ان کو بھی نہیں معلوم ہوگا کہ یہ دیوار اب تک کیسے قائم رہی اور جب گرنے کے قریب تھی تو اس کو کس نے ٹھیک کیا اور کیسے ٹھیک کیا؟ پہلے دو معاملوں میں اسبابِ ظاہرہ بھی ایسے تھے کہ مافوق الفطرت نہیں تھے یعنی کشتی کو توڑنا تو وہ ایسے طریقے سے نہیں توڑی گئی جو مافوق الفطرت طریقہ ہو، ایسے ہی بچے کو قتل کرنا، یہ بھی بظاہر کوئی مافوق الفطرت طریقے پر نہیں تھا۔

البتہ دیوار کو ہاتھ کے سہارے سے سیدھا کر دینے کا کام مافوق الفطرت تھا کوئی دوسرا جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص قدرت عطا نہ کی گئی ہو وہ اس کام کو نہیں کر سکتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ان اصحابِ تکوین حضرات کو متعلقہ امور سے خبردار رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہدایات بھی ملتی رہتی ہیں، ان باتوں کا تعلق وحی یا الہام سے ہوتا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ تکوینی کام اس انداز کے ہوتے ہیں جن میں کسی غیر معمولی ہمت وقوت کی ضرورت نہیں ہوتی، اور کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن میں غیر معمولی ہمت وقوت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہمت وقوت ان ہی حضرات کے پاس منجانب اللہ عطا کی ہوئی ہوتی ہے۔

(۲)......حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے یا ولی؟ اس بارے میں اہلِ علم حضرات کا اختلاف ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ خضر علیہ السلام نبی ہیں یا ولی ہیں، جمہور علماء کا قول ہے کہ وہ ولی تھے، نبی نہ تھے۔

اور علماء کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ وہ نبی تھے پھر نہ معلوم کہ وہ رسول تھے یا رسول نہ تھے،صرف نبی تھے (معارف القرآن جلد ۵ صفحہ ۷)

اب اگر اُن کا ولی ہونا مانا جائے تو یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ولی کے لیے اپنے کشف والہام کو حجت مانتے ہوئے خلافِ شریعت عمل کرنا جائز ہے، اس کا جواب حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ممکن ہے پہلی شریعت میں کشف والہام حجت ہو، مگر ہماری شریعت میں حجت نہیں؛ اور موسیٰ وخضر علیہما السلام کا واقعہ پہلی شریعت ہی سے متعلق ہے؛ چنانچہ حضرت والا ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

غالبًا پہلے شرائع میں کشف والہام حجت ہوگا اور ہماری شریعت میں وہ حجت نہیں، پھر اگر کسی بزرگ سے کوئی امر قولی یا فعلی جو ظاہراً منکر ہو، صادر ہو؛ اس میں دوسری تاویل کریں گے (الافاضات الیومیہ جلد ۳ صفحہ ۶۲، ملفوظ نمبر ۷۰) [1]

اور اگر ان کو نبی مانا جائے تو پھر یہ اشکال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ نبی کا الہام وحی ہوتا ہے، جس کا درجہ قطعی ہے؛ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

قرآن کریم نے یہ بھی واضح نہیں کیا کہ خضر علیہ السلام کوئی پیغمبر تھے یا اولیاء اللہ میں سے کوئی فرد تھے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک ان کا نبی ہونا خود قرآن کریم میں ذکر کئے ہوئے واقعات سے ثابت ہے، کیونکہ خضر علیہ السلام سے اس سفر میں جتنے واقعات ثابت ہیں، ان میں سے بعض تو قطعی طور پر خلافِ شرع ہیں اور حکمِ شریعت سے کوئی استثناء بجز وحی الٰہی کے ہو ہی نہیں سکتا، جو نبی اور پیغمبر ہی کے ساتھ مخصوص ہے، ولی کو بھی کشف یا الہام سے کچھ چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں، مگر وہ کوئی حجت نہیں ہوتی، ان کی بناء

[1] البتہ اگر کوئی صاحبِ تکوین مغلوب العقل یعنی مجذوب ہو تو وہ مکلّف نہیں۔

ظاہرِ شریعت کے کسی حکم کو بدلا نہیں جاسکتا، اس لئے یہ متعین ہوجاتا ہے کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی اور پیغمبر تھے، ان کو بذریعہ وحیِ الٰہی بعض خاص احکام وہ دیئے گئے تھے جو ظاہرِ شریعت کے خلاف تھے، انہوں نے جو کچھ کیا اس استثنائی حکم کے ماتحت کیا، خود ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی قرآن کے اس جملے میں ہوگیا: ''وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ''(یعنی میں نے جو کچھ کیا اپنی طرف سے نہیں کیا، بلکہ امرِ الٰہی سے کیا ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام بھی ایک نبی اور پیغمبر ہیں، مگر ان کے کچھ تکوینی خدمتیں منجانب اللہ سپرد کی گئی تھیں انہی کا علم دیا گیا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع نہ تھی، اسی لئے اس پر اعتراض کیا، تفسیرِ قرطبی، بحرِ محیط، ابوحیان اور اکثر تفاسیر میں یہ مضمون بعنواناتِ مختلفہ مذکور ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ بہت سے جاہل، غلط کار، تصوف کو بدنام کرنے والے صوفی جو کہنے لگے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور ہے؛ بہت سی چیزیں شریعت میں حرام ہوتی ہیں مگر طریقت میں جائز ہیں اس لیے کسی ولی کو صریح گناہِ کبیرہ میں مبتلا دیکھ کر بھی اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کھلا ہوا زندقہ اور باطل ہے، حضرت خضر علیہ السلام پر کسی دنیا کے ولی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ظاہرِ شریعت کے خلاف اس کے کسی فعل کو جائز کہا جاسکتا ہے (معارف القرآن ج۵ص۶۱۲)

آگے مزید فرماتے ہیں:

یہاں طبعی طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خضر علیہ السلام کی تصریح کے مطابق اُن کو جو علم عطا ہوا تھا اس کی نوعیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم سے مختلف تھی، مگر جب کہ یہ دونوں علم حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئے تھے تو ان دونوں کے احکام میں تضاد واختلاف کیوں ہوا، اس کی تحقیق تفسیرِ مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب اور دل کو لگنے والی ہے ان کی تقریر کا مطلب

جو میں سمجھا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

’’حق تعالیٰ جن حضرات کو اپنی وحی اور نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں وہ عموماً تو وہی حضرات ہوتے ہیں جن کے سپرد اصلاحِ خلق کی خدمت ہوتی ہے، ان پر کتاب اور شریعت نازل کی جاتی ہے، جن میں خلقِ خدا کی ہدایت اور اصول وقواعد ہوتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن کریم میں بتصریحِ نبوت ورسالت آیا ہے وہ سب کے سب ایسے ہی تھے، جن کے سپرد تشریعی اور اصلاحی خدمات تھیں، ان پر جو وحی آتی تھی وہ بھی سب اسی سے متعلق تھی، مگر دوسری طرف کچھ خدمات بھی ہیں جن کے لئے عام طور سے ملائکۃُ اللہ مقرر ہیں، مگر زمرۂ انبیاء میں بھی حق تعالیٰ نے بعض کو اسی قسم کی تکوینی خدمات کے لئے مخصوص کرلیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام اسی زمرہ میں سے ہیں، تکوینی خدمات واقعات جزئیہ سے متعلق ہوتی ہیں، کہ فلاں شخص ڈوبنے والے کو بچالیا جائے یا فلاں کو ہلاک کردیا جائے، فلاں کو ترقی دی جائے، فلاں کو زیر کیا جائے، ان معاملات کا نہ عام لوگوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے نہ ان کے احکام عوام سے متعلق ہوتے ہیں، ایسے واقعاتِ جزئیہ میں بعض وہ صورتیں پیش آتی ہیں کہ ایک شخص کو ہلاک کرنا تشریعی قانون کے خلاف ہے، مگر تکوینی قانون میں اس خاص واقعہ کو عام تشریعی قانون سے مستثنیٰ کرکے اس شخص کے لئے جائز کردیا گیا ہے جس کو اس تکوینی خدمت پر مامور فرمایا گیا ہے، ایسے حالات میں شرعی قوانین کے علماء اس استثنائی حکم سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کو حرام کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور جو شخص تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے وہ اپنی جگہ حق پر ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں یہ تضاد نظر آتا ہے وہ درحقیقت تضاد نہیں ہوتا، بعض واقعاتِ جزئیہ کا عام قانونِ شریعت سے استثناء ہوتا ہے، ابوحیان نے بحرِ محیط میں فرمایا ’’**الجمہور علی ان الخضر نبی و کان علمہ معرفۃ بواطن قد اوحیت الیہ وعلم موسی الاحکام والفتیا بالظاھر**‘‘ (بحر محیط ج۶ ص ۱۴۷)

اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ استثناء بذریعہ وحیِ نبوت ہو، کسی ولی کا کشف والہام ایسا استثناء کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ،اس لئے حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو بظاہر ناحق قتل کرنا ظاہر شریعت میں حرام تھا،لیکن حضرت خضر تکوینی طور پر اس قانون سے مستثنٰی کر کے مامور کئے گئے تھے،ان پر کسی غیر نبی کے کشف والہام کو قیاس کر کے کسی حرام کو حلال سمجھنا جیسے بعض جاہل صوفیوں میں مشہور ہے بالکل بے دینی اور اسلام سے بغاوت ہے(معارف القرآن ج۵ص۶۱۳وص۶۱۴) ؎

مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کوئی ولی اپنے کشف کی بنیاد پر ایسی چیز بیان کرے جو احکامِ شریعت کے خلاف ہو تو اس کی بات معتبر نہ ہوگی۔

(۳)......اب رہا یہ سوال کہ حضرت خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں ،اس سلسلہ میں علماء کی دونوں قسم کی ہی آراء پائی جاتی ہیں،اور دونوں آراء پر دلائل بھی قائم کئے گئے ہیں،حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ دونوں آراء اوران کے دلائل بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

تفسیرِ مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تمام اشکالات

؎ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

حضرت استاد مولانا سید انور شاہ قدس اللہ سرہٗ یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں علمائے شریعت اور اولیائے طریقت کا اختلاف پاؤ تو یہ دیکھو کہ وہ مسئلہ امورِ تشریعیہ یعنی احکامِ شریعت سے متعلق ہے، یا امورِ تکوینیہ یا اسرارِ کونیہ کے باب سے ہے، پس اگر وہ مسئلہ امورِ تشریعیہ یعنی حلال وحرام اور یجوز اور لا یجوز سے متعلق ہو تو اس وقت علمائے شریعت کے قول اور فتویٰ کو ترجیح دینا کیونکہ علمائے شریعت کا گروہ احکام شریعت سے خوب آگاہ ہے اور اگر وہ مسئلہ امورِ تکوینیہ اور اسرارِ کونیہ سے متعلق ہو اور افعالِ مکلفین سے اس کا تعلق نہ ہو تو اس جگہ اولیائے طریقت اور اہلِ معرفت وار بابِ بصیرت کے قول کو ترجیح دینا کیونکہ یہ گروہ اہلِ کشف اور اہلِ الہام کا گروہ ہے، اور بلاشبہ صادقین اور صالحین کا گروہ ہے، یہ گروہ جب اپنا کوئی مشاہدہ اور مکاشفہ بیان کرے تو عقلاً ونقلاً اس کو قبول کرنا ضرور ہے(معارف القرآن جلد۵صفحہ۹)

اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صوفیہ کے جو علوم کشفیہ ہیں، وہ ان احکام کے سامنے جو بذریعہ وحی کے پہنچے ہیں،کوئی حقیقت نہیں رکھتے،ان احکام کو چھوڑ کر کشفیات میں خوض کرنا نہایت مضر ہے(الافاضات الیومیہ جلد۵صفحہ۲۵۳،ملفوظ نمبر۲۵۳)

کا حل اس میں ہے جو حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکاشفے سے فرمایا، وہ یہ کہ میں نے خود حضرت خضر علیہ السلام سے اس معاملہ کو عالمِ کشف میں دریافت کیا، انہوں نے فرمایا کہ میں اور الیاس علیہ السلام ہم دونوں زندہ نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ قدرت بخشی ہے کہ ہم زندہ آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر (اللہ تعالیٰ کے حسبِ حکم، ناقل) لوگوں کی امداد مختلف صورتوں میں کرتے ہیں۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام کی موت وحیات سے ہمارا کوئی اعتقادی یا عملی مسئلہ متعلق نہیں، اسی لئے قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی صراحت ووضاحت نہیں کی گئی، اس لئے اس میں زیادہ بحث وتمحیص کی بھی ضرورت نہیں، نہ کسی ایک جانب کا یقین رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے، لیکن چونکہ مسئلہ عوام میں چلا ہوا ہے، اس لئے مذکورۂ صدر تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں (معارف القرآن عثمانی، جلد پنجم، صفحہ ۶۲۶)

(۴)......حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام کے ضمن میں فرماتے ہیں:

اس قصہ سے بعض کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ علم باطن علم شریعت سے افضل ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ علم باطن کے دو شعبے ہیں (۱) علمِ مرضیاتِ الٰہی جو متعلق بالنفس ہے (۲) اور علم اسرارِ کونیہ۔ سو پہلا تو شریعت کا ایک جزو ہے اور جزو کبھی کل سے افضل نہیں ہو سکتا اور دوسرا چونکہ قربِ الٰہی میں کچھ دخل نہیں رکھتا اس لئے افضلیت کا احتمال ہی نہیں۔

دوسرا دھوکہ یہ ہے کہ خضر علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ جواب یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کو علمِ باطن کا دوسرا شعبہ حاصل ہونا اس قصہ سے ثابت ہے اور ابھی سن لیا کہ وہ علمِ شریعت سے جو کہ موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھا افضل نہیں۔ رہا ان کا ان کے پاس بھیجنا سو بناء اس کی افضلیت نہیں بلکہ تعلیم وتادیب کہ آئندہ تکلم میں احتیاط رکھیں اور مقید کی جگہ مطلق نہ بولا کریں۔

بعض کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ پیر اگر خلافِ شرع کوئی کام کرے اس پر انکار نہ کرے چنانچہ

اس قصہ میں حدیث میں آیا کہ موسیٰ علیہ السلام اگر صبر کرتے تو خوب ہوتا۔ جواب یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کا کمال (یعنی ان کا فرضِ منصبی۔ ناقل) نص سے معلوم تھا اس لئے سکوت جائز تھا، دوسرے کا ان پر قیاس کرنا مع الفارق ہے۔

بعض کو دھوکہ ہوا ہے کہ الہام پر خلافِ شرع عمل جائز ہے۔ جواب یہ ہے کہ یا تو وہ نبی ہوں گے اور یا یہ کہ شریعتِ سابقہ ہوگی مگر اس شرع میں یہ جائز نہیں (بیان القرآن ج ۱ جزو ۶ ص ۱۳۲، البدائع ص ۱۶۴ و ۱۶۵ ابدیعہ نمبر ۴۶)

(۵)......حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب مہاجر مدنی رحمہ اللہ حضرت موسیٰ وحضرت خضر علیہما السلام کے واقعے کو ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

اس سرگزشت میں نہ معلوم کتنے درسِ عبرت ہوں گے، ہم اپنے قصورِ علم اور وقت کی فرصت کے لحاظ سے چند اہم اسباق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ایک یہ کہ واقعات کی سطح اور اندرونی حکمِ ربانی کے درمیان مناسبتوں کا ادراک انسانی عقول کے احاطہ سے باہر ہے، اور اسی لیے ان حکمتوں کے ادراک کے درپے ہوئے بغیر صبر کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرنا چاہیے، مگر یہی صبر عقولِ انسانیہ کے لیے بڑی امتحان گاہ ہے، اسی کی طرف قرآنِ کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

عَسٰىٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. وَعَسٰىٓ اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ.

اور یہ کہ خضر علیہ السلام کو جب واقعات وحکم کے اس غیر مدرک بالعقول ربط کا علم بخشا گیا تھا، تو اسی کے ساتھ ان کو وہ قوت بھی عنایت فرمادی گئی تھی، جس کی وجہ سے ایک گرنے والی دیوار صرف ان کے ایک اشارہ سے سیدھی ہوگئی بلکہ اتنی مستحکم ہوگئی تھی کہ جب تک اس کے نیچے دفینہ کا مالک جوان نہ ہولے وہ دیوار نہ گر سکے۔

اور یہ کہ جب تک مصالحِ ربانیہ کا کسی کو قطعی علم حاصل نہ ہو اور خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ خود قطعی طور پر ان کا مامور بھی نہ ہو، اس وقت تک شریعت میں وہ افعال جرم اور معصیت

ہی کی فہرست میں شمار ہوں گے۔

اور یہ کہ تکوینی امور کا راستہ تشریعی احکام سے الگ ہے اور ان کی تنفیذ کے لیے بھی تشریعی احکام کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ بندے مقرر ہیں، مگر وہ اتنے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ان کا علم ضروری نہیں ہوتا۔

اور یہ کہ ایسے افراد کو قدرت اس لیے عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھتی ہے کہ ان کے اس قسم کے افعال شریعت کی زد میں آ کر اختلالِ نظم کا باعث نہ بنیں۔

اور یہ کہ علمِ تشریعی کا درجہ علمِ تکوینی سے بلند ہے۔

اور یہ کہ افضل کو اگر اس قسم کے جزئیات کا علم نہ ہوا تو اس سے اس کے فضل وکمال میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اور یہ کہ جن کو ان علوم کا حامل نہیں بنایا گیا ان کے لیے ان علوم کے حاملین کی نہ تلاش چاہیے اور نہ ان کی رفاقت اپنے لیے موجبِ کمال۔ اور اگر کہیں حسبُ الاتفاق ملاقات ہو جائے تو ان پر زبانِ طعن کھولنا بھی غلط ہے (ترجمانُ السنۃ جلد سوم صفحہ ۵۱۲ و ۵۱۳)

(۶)...... حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا علم ''علمِ لدنّی'' تھا، جس کو ''علمِ حضوری'' اور ''علمِ وہبی'' بھی کہا جاتا ہے؛ جس میں کسب واختیار اور ظاہری اسباب کو دَخَل نہیں ہوتا۔

چنانچہ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ حضرت خضر علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنی تفسیر معارف القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

''(دوسرا وصف) اللہ تعالیٰ نے اُن (حضرت خضر) کا یہ بیان فرمایا:

''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا''

''اور ان کو ہم نے اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا''

جو نظر وفکر سے حاصل نہیں ہو سکتا، ہم نے اپنے پاس سے ان کو باطنی علم سکھایا، وہ علم ہمارے ساتھ خاص ہے، بغیر ہمارے سکھائے کوئی اس علم کو نہیں جان سکتا، صوفیائے کرام کی اصطلاح میں ایسے ہی علم کو ''علمِ لدنی'' کہتے ہیں، جس میں اسبابِ ظاہری کا

دخل اور واسطہ نہ ہو اور عالَمِ غیب سے براہِ راست علم اس کے قلب میں داخل ہو، ملائکہ پر جو منجانبِ اللہ علوم فائض ہوتے ہیں وہ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱؎

قلب میں عام طور پر جو علم داخل ہوتا ہے وہ حواسِ ظاہری کے دروازوں سے داخل ہوتا ہے ایسے علم کو "علمِ حصولی" اور "علمِ اکتسابی" کہتے ہیں اور جب کسی کے قلب میں کوئی دروازہ عالمِ ملکوت کی طرف کھل جائے اور بلا اِن ظاہری دروازوں کے کوئی علم قلب میں پہنچ جائے تو ایسے علم کو "علمِ لدنی" کہتے ہیں جو علم قلب کے باہر کے دروازے سے داخل اور حاصل ہو وہ "علمِ حصولی" ہے اور جو علم قلب کے اندر کسی باطنی دروازے سے آئے وہ "علمِ لدنی" اور "علمِ وھبی" اور "علمِ حضوری" کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو اسرارِ غیبی اور باطنی حکمتوں اور مصلحتوں کا علم عطا فرمایا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ شریعت کا علم عطا فرمایا تھا ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

چنانچہ جب ملاقات ہوئی تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا

"اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللہِ عَلَّمَنِیْہِ لَا تَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللہِ عَلَّمَکَ اللہُ لَا اَعْلَمُ"

یعنی "مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص علم ملا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص مجھ کو عطا کیا ہے جس کا تعلق اسرارِ کونیہ اور جزئیاتِ غیبیہ سے ہے، یہ علم مجھ کو ایک خاص مقدار میں ملا ہے، تم اس کو نہیں جانتے اور تم کو منجانبِ اللہ ایک خاص علم ملا ہے جس کا تعلق اسرارِ شریعت اور احکامِ ہدایت اور اصلاحِ امت سے ہے یہ علم اللہ نے خاص تم کو سکھایا ہے میں اس علم کو نہیں جانتا" مطلب یہ ہے کہ میرا علم اور تمہارا علم دو مختلف قسمیں ہیں، دونوں یکجا جمع نہیں ہو سکتیں (معارف القرآن ج ۴ ص ۶۲۲)

۱؎ امداد الفتاویٰ میں ہے:
اگر علم بواسطہ بشر حاصل نہ ہو، عام اس سے کہ وحی کے ذریعہ سے ہو یا الہام یا فراست سے، تو اسے علمِ لدنی کہتے ہیں (امداد الفتاویٰ جلد پنجم صفحہ ۱۴۷)

(۷)......علمِ تکوین کو بعض لوگ علمِ طریقت سمجھتے ہیں جو کہ غلط فہمی ہے؛ بیانُ القرآن کے حوالے سے یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ علمِ باطن کے دو شعبے ہیں؛ ایک علمِ مرضیاتِ الٰہی جس کا تعلق نفس سے ہے اور دوسرا علم اسرارِ کونیہ ہے؛ پہلا علم شریعت کا جز ہے اور دوسرا شریعت کا جز نہیں بلکہ مستقل علم ہے جسے علمِ تکوین بھی کہتے ہیں، جو علمِ تشریع کے مقابلے میں آتا ہے اور علمِ تشریع اور اس کے حامل کا درجہ علمِ تکوین اور اس کے حامل سے اعلیٰ واَرفع ہے، اسی کی مزید وضاحت حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے درجِ ذیل فتوے سے بھی ہوتی ہے:

> علمِ خضری تکوین کے متعلق ہے جس کو طریقت وشریعت سے کچھ تعلق نہیں، اور وہ علومِ ولایت سے ادنیٰ درجے کا شعبہ ہے، اور علمِ موسوی تشریع کے متعلق ہے، جس میں طریقت شریعت سب آ گئی، اور اسی میں وہ علوم ہیں جو علومِ ولایت کے اعلیٰ شعبوں میں سے ہیں (امداد الفتاویٰ جلد ۵ صفحہ ۱۴۷)

(۸)......پھر علمِ تشریع میں چونکہ اختیار رہتا ہے، کرنے والے کو کسی جانب پر مجبور نہیں کیا جاتا، اور علمِ تکوین میں عموماً اختیار نہیں ہوتا ''الا ماشاء اللہ'' اسی تقسیم سے احکامِ الٰہیہ کی بھی دو قسمیں بن جاتی ہیں؛ ایک احکامِ تشریعی اور دوسرے احکامِ تکوینی وتقدیری۔

چنانچہ اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

> احکامِ الٰہیہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تشریعی احکام جن میں ایک قانون بتلایا جاتا ہے، اور اس کی خلاف ورزی کی سزا بتلادی جاتی ہے، مگر کرنے والے کو اس کی کسی جانب پر مجبور محض نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو ایک درجہ کا اختیار دیا جاتا ہے، وہ اپنے اختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی، اور ایسے احکام عموماً اُن مخلوقات پر عائد ہوتے ہیں، جو ذوی العقول کہلاتے ہیں، جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مؤمن وکافر اور مطیع ونافرمان کی دو قسمیں پیدا ہوجاتی ہیں۔
>
> دوسری قسم احکام کی تکوینی اور تقدیری احکام ہیں، ان کی تنفیذ جبری ہوتی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ سرِمو ان کے خلاف کرسکے، ان احکام کی تعمیل کل مخلوقات جبراً کرتی ہے،

ان میں انسان اور جن بھی داخل ہیں، تکوینی احکام میں ان کے لیے جو کچھ مقدر کر دیا گیا ہے، مؤمن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاسق، سب کے سب اُسی تقدیری قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں۔

ذرّہ ذرّہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے　　　زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

(معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۲۰۳)

تشریعی وتکوینی اولیائے کرام اوران کی خدمات وتعارف

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنے رسالے میں تحریر فرماتے ہیں:

وفی كفاية المعتقد لليافعی ،نفعنا الله تعالى ببركته ،قال بعض العارفين : الصالحون كثير مخالطون للعوام لصلاح الناس فی دينهم ودنياهم ، والنجباء فی العدد اقل منهم ، والنقباء فی العدد اقل منهم وهم مخالطون للخواص ،والأبدال فی العدد اقل منهم نازلون فی الامصار العظام لا يكون فی المصر منهم الاالواحد بعد الواحد ،فطوبى لاهل بلدة كا ن فيها اثنان منهم،والاوتاد واحد باليمن وواحد بالشام وواحد فی المشرق وواحد فی المغرب ،والله سبحانه يدير القطب فی الآفاق الاربعة من اركان الدنيا كدوران الفلك فی افق السماء ،وقد سترت احوال القطب ،وهو الغوث ،عن العامة والخاصة غيره من الحق عليه غير انه يرى عالما كجاهل ابله كفطن تاركا آخذا قريبا بعيدا سهلا عسرا آمنا حذرا وكشف احوال الاوتاد للخاصة وكشف احوال البدلاء للخاصة والعارفين ،وستر احوال النجباء عن العامة خاصة ،وكشف بعضهم لبعض ،وكشف حال الصالحين للعموم والخصوص ليقضی الله امرا كان مفعولا ،وعدة النجباء ثلاثمائة ،والنقباء اربعون

،والبدلاء قيل ثلاثون ، وقيل اربعة عشر ،وقيل سبعة وهو الصحيح ،والاوتاد ،اربعة فاذا مات القطب جعل مكانه خيار الاربعة ،واذا مات احدالاربعة جعل مكانه خيار السبعة ،واذا مات احد السبعة جعل مكانه خيار الاربعين ،واذا مات احد الاربعين جعل مكانه خيار الثلاثمائة واذامات احد الثلاثمائة جعل مكانه خيار الصالحين ،واذا اراد الله ان يقيم الساعة اماتهم اجمعين ،وبهم يدفع اللّٰہ عن عباده البلاء وينزل قطر السماء انتهى ثم قال : وقال بعض العارفين : والقطب هو الواحد المذكور فى حديث ابن مسعو دانه على قلب اسرافيل ومكانه من الاولياء كالنقطة فى الدائر ة التى هى مركز ها به يقع صلاح العالم قال : وقال بعضهم : لم يذكر رسول الله ﷺ ان احدا على قلبه اذلم يخلق الله فى عالم الخلق والامر اعز والطف واشرف من قلبه ﷺ فقلوب الانبياء ،والملائكة ،والاولياء بالاضافة الى قلبه كاضافة سائر الكواكب الى كمال الشمس انتهىٰ(الحاوی للفتاویٰ ج۲ص۳۰۳وص۳۰۴)

ترجمہ: علامہ یافعی علیہ الرحمہ کی کفایۃ المعتقد میں ہے: صالحین نیکوکار لوگ بہت زیادہ ہیں، جو عامۃ الناس کے ساتھ رَلے مِلے رہتے ہیں تاکہ دینی ودنیاوی امور میں ان کی اصلاح ورہنمائی فرمائیں،اور نجباء تعداد میں ان سے بہت کم ہیں اور نقباء کی تعداد تو ان نجباء سے بھی بہت کم ہے اور وہ خواص سے اختلاط واجتماع رکھتے ہیں اور ابدال کی تعداد ان نقباء سے بھی بہت کم ہے،ان کا نزول بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے،پورے ایک شہر میں ان میں سے ایک کے بعد ایک ہی ہوتا ہے،وہ شہر والے تو بہت ہی مبارک ونیک بخت ہوں گے جن میں ان ابدال میں سے دو موجود ہوں،اور اوتاد جو ہیں ایک ان میں سے یمن میں ہوتا ہے،ایک شام میں ہوتا ہے ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں ہوتا ہے،اور قطب کو اللہ تعالیٰ دنیا کے چار جہات میں گردش کراتے ہیں،جو دنیا

کے ارکان میں سے ہیں، جیسے کہ کُرّوں اور سیاروں کی گردش افقِ عالم پر ہوتی ہے اور قطب کے حالات مخفی ہیں، وہ غوث ہوتا ہے عام اور خاص سب سے، البتہ (اتنا اس کے متعلق واضح ہو) کہ وہ عالم کو جاہل، بے وقوف کو سمجھدار، چھوڑنے والے کو پکڑنے والا، قریب کو بعید، آسان کو مشکل، مامون ومحفوظ کو خطرے میں دیکھتا ہے، اوتاد کے حالات خواص پر منکشف ہوجاتے ہیں اور بدلاء کے احوال خواص اور عارفین پر کھلتے ہیں اور نجباء کے احوال بالخصوص عوام سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور آپس میں ان کو ایک دوسرے کے حالات معلوم ہوتے ہیں اور صالحین کے حالات عام خاص سب پر واضح ہوتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا مقرب فیصلہ پورا ہوجائے، نجباء کی تعداد تین سو، نقباء کی چالیس، بدلاء کی ایک قول کے مطابق تیس، دوسرے قول کے مطابق چودہ، تیسرے قول کے مطابق سات تعداد ہوتی ہے، یہی صحیح ہے، اوتاد چار ہوتے ہیں، جب قطب فوت ہوتا ہے تو ان میں سے سربرآوردہ کا اس کی جگہ انتخاب وتقرر ہوتا ہے اور جب اوتاد میں سے کوئی فوت ہوتا ہے تو سات بدلاء میں سے ممتاز ترین اس کی جگہ مقرر ہوتا ہے اور جب بدلاء میں سے کوئی ایک فوت ہوتا ہے، تو چالیس نقباء میں سے افضل ترین اس کی جگہ پُر کرتا ہے، اور جب نقباء میں سے کوئی ایک فوت ہوتا ہے تو تین سو نجباء میں سے اشرف ترین اس کا مرتبہ پاتا ہے اور جب تین سو نجباء میں سے کوئی ایک دنیا سے گزر جاتا ہے تو صالحین نیکوکاروں میں سے جو زیادہ فوقیت والا ہو وہ اس کی جگہ لیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ قیامِ قیامت کا فیصلہ فرمائیں گے تو ان سب کو دنیا سے اٹھالیں گے، ان (اصحابِ تکوین) کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندوں سے آفات وبلائیں دور فرماتے ہیں اور آسمان سے مینہ برساتے ہیں (انتہیٰ)

آگے لکھا ہے، بعض عارفین نے فرمایا ہے: قطب وہ ایک ہی ہوتا ہے، ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ وہ اسرافیل کے قلب کے موافق ہوتا ہے اور تمام اولیاء میں اس کا مرتبہ دائرہ کے مرکز کی طرح ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے عالم کی صلاح ودرستگی کے

فیصلے ہوتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ نبی علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کے قلب کے موافق بھی ہوتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ خلق اور عالمِ امر میں حضور نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک سے کوئی چیز زیادہ قابلِ قدر، زیادہ لطیف، زیادہ شرف والی پیدا نہیں فرمائی، پس باقی انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کے قلوب کی نسبت آپ کے قلب کے ساتھ ایسے ہے جیسے تمام ستاروں کی نسبت سورج ساتھ ہے (ترجمہ ختم ہوا)

(مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے علامہ شامی رحمہ اللہ کے رسالہ کے ذیل میں آئے گی)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کا تکوین کے سلسلہ میں ایک واقعہ نقل فرمایا ہے جو کہ مع ترجمہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

وفی کفایة المعتقد للیافعی عن بعض اصحاب الشیخ عبد القادر الکیلانی قال :خرج الشیخ عبد القادر من داره لیلة فناولته ابر یقاً فلم یأخذه وقصد باب المدرسة فانفتح له الباب فخرج وخرجت خلفه ثم عاد الباب مغلقاً ومشی الی قرب من باب بغداد فانفتح له فخرج وخرجت معه ثم عاد الباب مغلقا ومشی غیر بعید فاذا نحن فی بلد لاعرفه فدخل فیه مکاناً شبیهاً بالرباط واذا فیه ستة نفر فبادرواالی السلام علیه والتجأت الی ساریة هناک وسمعت من جانب ذالک المکان انیناً فلم نلبث الا یسیرا حتی سکن الانین ودخل رجل وذهب الی الجهة التی سمعت فیها الانین ثم خرج یحمل شخصاً علی عاتقه ودخل آخر مکشوف الرأس طویل الشارب وجلس بین یدی الشیخ فأخذعلیه الشیخ الشهادتین وقص شعر رأسه وشاربه وألبسه طاقیة وسماه محمداً وقال لأولئک النفر : قد امرت ان یکون هذا بدلاً عن المیت ،قالوا:سمعاً وطاعة ،ثم خرج الشیخ وترکهم وخرجت خلفه ومشینا غیر بعید واذا نحن عند باب بغداد فانفتح کاول مرة ثم اتی

المدرسة فانفتح له بابها ودخل داره فلما كان الغد اقسمت عليه ان يبين لى مارايت قال : اماالبلد فنهاوند ،واما الستة فهم الابدال وصاحب الانين سابعهم كان مريضاً فلما حضرت وفاته جئت احضره ،واماالرجل الذى خرج يحمل شخصاً فابوا العباس الخضر عليه السلام ذهب به ليتولى امره ،واما الرجل الذى اخذت عليه الشهادتين فرجل من اهل القسطنطينية كان نصرانياً وامرت ان يكون بدلاً عن المتوفى فاتى فاسلم على يدى وهو الآن منهم (الحاوى للفتاوىٰ ج ۲ ص ۳۰۵)

ترجمہ: اسی کتاب کفایۃ المعتقد للیافعی میں مزید یہ واقعہ بھی ہے جو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے کسی صحبت یافتہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ شیخ ایک رات گھر سے نکلے ،میں نے کوزہ دینا چاہا (اس خیال سے کہ رات کی عبادت کے لئے وضو فرمائیں گے) آپ نے نہیں لیا ،پس آپ مدرسہ کے دروازے کی طرف بڑھے پس دروازہ آپ کے لئے کھولا گیا ،پس آپ نکلے ،میں بھی پیچھے ہولیا ،پھر دروازہ بند ہوگیا اور آپ بغداد کے ایک داخلی دروازے کی طرف چلے ،وہ دروازہ بھی آپ کے لئے کھل گیا ،آپ وہاں سے باہر نکلے ،میں بھی پیچھے پیچھے رہا ،پھر وہ دروازہ بھی دوبارہ بند ہوگیا اور آپ ابھی تھوڑی دیر ہی چلے کہ اچانک ہم ایک غیر معروف شہر میں تھے ،تو آپ اس شہر کے ایک سرائے نما مکان میں داخل ہوئے ،تو ناگہاں وہاں چھ آدمی سامنے تھے ،انہوں نے آپ کو سلام کرنے میں سبقت کی اور میں ایک ستون کی آڑ میں ہوگیا اور میں نے اس مکان کے ایک گوشے سے رونے کراہنے کی آواز سنی ،پس ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ آواز بند ہوگئی اور ایک آدمی وہاں داخل ہوا ،اور اس گوشے کی طرف چلا گیا جہاں سے کراہنے کی آواز آرہی تھی ،پھر اس حال میں نکلا کہ ایک آدمی کو اپنے کاندھے پر لادے ہوئے تھا ،پھر ایک اور آدمی برہنہ سر اور دراز مونچھوں والا وہاں داخل ہوا اور حضرت شیخ کے سامنے بیٹھا ،شیخ نے اس کو شہادتین کہلوائے اور اس کے سر اور مونچھوں

کے بال ترشوائے ،اور اس کو مخصوص پوشاک (گدڑی وغیرہ) پہنائی اور اس کا نام ''محمد'' رکھا اور ان دیگر حضرات سے فرمایا! مجھے حکم ہوا ہے کہ یہ صاحب (نومسلم وارد) مرنے والے کی جگہ پر متمکن ہوں ،انہوں نے جواب دیا کہ بسروچشم (سمعاً وطاعة) پھر شیخ وہاں سے نکلے اور ان کو چھوڑ آئے ،اور میں آپ کے پیچھے ہولیا اور ہم کچھ ہی دور تک چلے کہ ناگہاں ہم بابِ بغداد کے پاس پہنچ گئے ،دروازہ حسبِ سابق کھلا پھر مدرسہ آئے ،مدرسہ کا دروازہ بھی اسی طرح کھلا اور آپ اپنے گھر میں داخل ہوئے ،جب صبح ہوئی تو آپ کو میں نے قسم دی کہ مجھ پر رات کا معاملہ واضح فرمائیں جو میں نے دیکھا ،تو فرمایا کہ وہ شہر ''نہاوند'' تھا اور وہ چھ آدمی ابدال تھے اور وہ کراہنے والے ان کے ساتویں تھے ،جو بیمار تھے جب ان کے انتقال کا وقت ہوا تو میں وہاں پہنچا اور وہ صاحب جو اِن کو کاندھے پر لاد کر نکلے وہ ابوالعباس خواجہ خضر علیہ السلام تھے ،وہ ان کو لے کر چلے تاکہ ان کا معاملہ سنبھالیں اور وہ شخص جس کو میں نے شہادتین کہلوائے وہ قسطنطنیہ کے ایک نصرانی تھے اور مجھے حکم ملا تھا کہ یہ مرحوم کی جگہ پر فائز ہوں ،پس وہ آیا میرے ہاتھ پر اسلام لایا اور اب وہ ان میں شامل ہے (ترجمہ ختم ہوا)

فائدہ: تکوینی نظام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایک خاص خدمت لیتے ہیں ،اس لیے جس میں اس خاص کام کی جس طرح سے اللہ تعالیٰ کو وہ کام لینا مقصود ہوتا ہے ،صلاحیت واستعداد پاتے ہیں ، اس کو ہی متعلقہ انتظامی عہدہ اور خدمت سپرد کی جاتی ہے ،جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں نصرانی کے اسلام قبول کرنے اور تکوینی حضرات میں شامل کرنے کے تذکرہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مذکورہ واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اولیائے کرام صاحبِ تشریع کے ساتھ صاحبِ تکوین بھی ہوتے ہیں ،لیکن ان پر صاحبِ شریعت ہونے کا پہلو غالب اور ظاہر ہوتا ہے ،لہٰذا یہ بات ممکن ہے کہ ایک شخص ہدایت وتشریع اور خدمت وتکوین دونوں سے متعلق ہو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے زمانے میں کچھ ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تکوینی حضرات کا علاقے کے نظم ونسق سے تعلق ہوتا ہے ،اور اللہ تعالیٰ اُس

علاقے کے لوگوں کے اعمال اور ان کے حالات کی شان کے مطابق ان پر تکوینی اور صاحبِ خدمت حضرات کا تقرر فرماتے ہیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ شہر کا انتظام بہت خراب اور سُست تھا، ایک شخص نے شاہ صاحب سے اس کی شکایت کی اور وجہ معلوم کی۔

آپ نے فرمایا کہ بھئی آج کل یہاں کے صاحبِ خدمت سُست ہیں، پوچھا کہ حضرت وہ کون صاحب ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ایک کنجڑا بازار میں خربوزے بیچ رہا ہے، وہ آج کل صاحبِ خدمت ہے، یہ صاحب اُن کے امتحان کے لیے گئے اور امتحان اس طرح کیا کہ پہلے خربوزوں کا بھاؤ معلوم کیا؟ کہا کہ ٹکے کے سیر بھر، پوچھا میٹھے ہیں؟ کہا کہ ہاں میٹھے ہیں، کہنے لگا کہ پہلے چکھ کر دیکھتا ہوں، کہا چکھ لو، اب انہوں نے خربوزے کاٹ کاٹ کر چکھنا شروع کئے اور ٹوکرے میں رکھ دیے اور یہ کہہ کر کھڑے ہوگئے کہ ان میں تو ایک بھی میٹھا نہیں، مگر وہ خربوزے والے صاحب کچھ نہ بولے، ان خربوزوں کا نہ کوئی پیسہ دیا نہ پیسوں کا مطالبہ ہوا، نہ ہی ناگواری کا اظہار، آ کر شاہ صاحب سے عرض کیا حضرت واقعی عجیب آدمی ہے۔

چند روز کے بعد دیکھا کہ شہر کا انتظام درست ہوگیا، ان صاحب نے پھر شاہ صاحب رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ آج کل انتظام درست ہوگیا ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ صاحبِ خدمت بدل گئے، یہ اس کا اثر ہے، انہوں نے پھر اس کو دیکھنے کی خواہش کی کہ وہ کہاں ملے گا اور کون ہے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک سقّہ ہے، فتحپوری مسجد کے پاس مشک کندھے پر رکھے لوگوں کو پانی پلاتا ہے، یہ صاحب گئے اور پوچھا پانی کیسے پلاتے ہو؟ کہنے لگے ایک چھدام (اس دور کا سکہ) کا ایک پیالہ، کہا پلاؤ، کہنے لگا چھدام پہلے دو، انہوں نے چھدام دیا، اسے پیالہ مشک سے بھر کر دیا، اس نے پیالہ دیکھ کر اسے اُلٹ دیا، یہ کہہ کر کہ اس میں تنکا پڑا ہوا ہے، اور دوسرا پیالہ مانگا، انہوں نے جواب دیا چھدام ہے؟ کہا کہ وہ پانی خراب تھا دوسرا پیالہ دو، اس نے ایک تھپڑ رسید کیا کہ جاؤ چلتے بنو؛ کیا مجھے خربوزے والا سمجھا ہے، الگ چھدام دوگے تو پانی ملے گا، یہ اپنا گال سہلاتے ہوئے واپس آ گئے۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ دیکھ لو آج کل یہ صاحبِ خدمت ہے کہ سب کو سیدھا کر رکھا ہے۔

اس واقعے کو بیان کرنے کے بعد حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سمجھ لو کہ ظاہری انتظام باطنی انتظام کے تابع ہے، پھر اس باطن کا ایک باطن ہے کہ وہ حکم حق ہے جس کے صدور میں طاعت ومعصیت کو بھی دخلِ عظیم ہے، یعنی جب خدا کو ناراض کرو گے تو اول محکمہ باطن میں حکم نازل ہوگا پھر اس کے تابع ظاہر میں ہوگا اور مصائب نازل ہوں گی، لہٰذا ان کی اصل تدبیر یہ ہے کہ خدا کو راضی کرلو، پھر کوئی مصیبت نہ آوے گی۔

اس اوپر کی حکایت کو سُن کر کوئی شخص اس غلطی میں مبتلا نہ ہوجائے کہ ایسے فقیروں کو ڈھونڈنے لگے کہ ان کا ڈھونڈنا محض بے کار ہے، اس لیے کہ وہ خدا کے قبضہ میں ہیں، ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے (الرفیق فی سواء الطریق صفحہ۱۳۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اصحابِ تکوین یا اصحابِ خدمت کے انتخاب میں انسانوں کے اچھے وبُرے اعمال کو بھی دَخل ہوتا ہے؛ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اعمال کے مطابق اُن پر تکوینی اُمور کو جاری ونافذ فرماتے اور اعمالِ خیر وشر کے مطابق ہی ان پر صاحبِ انتظام وبدانتظام اصحابِ خدمت مقرر فرماتے ہیں۔

اسی طریقہ سے ایک دفعہ کسی نے شاہ صاحب سے یہ سوال کیا کہ یہ لوگ تکوینی کام کس طور سے انجام دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے کسی کاغذ پر کچھ لکیریں بنا کر دیں کہ جاؤ فلاں جگہ قلعے کے سامنے پریڈ گراؤنڈ کے ساتھ سڑک پر ایک موچی بیٹھا ہوا ہے اس کے پاس جا کر یہ رقعہ دے دو، انہوں نے اس کو جا کر دے دیا، موچی صاحب نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا سامنے فوجی بریگیڈ میدان میں پھیلا ہوا تھا، فوج میں بگل بجا اور چلنے کی تیاری کا حکم ہوگیا، پھر اس نے اپنا تھیلا کندھے پر لادلیا ،سارے فوجی گھوڑے پر سوار ہوئے ، وہ چل پڑا فوجی بھی چل پڑے، اچانک وہ رُک گیا، فوجی بھی رُک گئے، اس نے اپنا تھیلا کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا، سارے فوجی گھوڑوں سے اُتر پڑے پھر اس نے اپنے تھیلے کا سامان کھول کر باہر نکالا، فوجیوں نے بھی گھوڑوں سے زین اُتار کر رکھ

دیں پھر وہ اپنے تھیلے کا سامان پھیلا کر بیٹھ گیا، فوجی بھی سامان رکھ کر بیٹھ گئے، اس نے یہ سارا عمل پھر دہرایا پھر تیسری مرتبہ ایسا ہی کر کے دکھایا، وہ دیکھ کر چلا گیا، فوجی آفیسر بعد میں یہ کہہ رہا تھا کہ پتہ نہیں مجھے کیا دورہ پڑا تھا کہ میں بار بار یہ احکام دے رہا تھا۔

اس واقعے سے بھی اندازہ ہوا کہ ظاہری انتظام باطنی انتظام یعنی تکوین کے تابع ہے، مگر اس باطن یعنی تکوین کا بھی ایک باطن ہے، اور وہ اعمال کا اچھا و بُرا ہونا ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا اور قرآن وسنت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نیک اعمال کی برکت سے اچھے حکمران اور بُرے اعمال کی نحوست سے ظالم اور بُرے حکمران مسلط کیے جاتے ہیں۔

جن بزرگوں کو اللہ تعالیٰ تکوینی نظام کی خدمات ذمہ لگاتے ہیں وہ اولیائے کرام کی دو قسموں میں سے ایک قسم میں شامل ہوتے ہیں۔

ایک قسم کے اولیاء تو اصحابِ تشریع کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے اصحابِ تکوین کہلاتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ نے تکوین کے موضوع پر بہت قیمتی باتیں بیان فرمائی ہیں، اس لیے ان کے چند ارشادات اس سلسلہ میں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)...... اولیاء اللہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کے متعلق خدمت ارشادِ ہدایت واصلاحِ قلوب وتربیتِ نفوس وتعلیمِ طرقِ قرب وقبول عند اللہ ہے اور یہ حضرات اہلِ ارشاد کہلاتے ہیں اور ان میں سے اپنے عصر میں جو اکمل وافضل ہو اور اس کا فیض اتم واعم ہو اس کو قطبُ الارشاد کہتے ہیں، اور یہ نائبِ حقیقی ہوتے ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کے۔ اور ان کا طرز، طرزِ نبوت ہوتا ہے۔

دوسرے وہ جن کے متعلق خدمتِ اصلاحِ معاش وانتظامِ امورِ دنیویہ ودفعِ بلیات ہے کہ اپنی ہمتِ باطنی سے باذنِ الٰہی ان امور کی درستی کرتے ہیں، اور یہ حضرات اہلِ تکوین کہلاتے ہیں، جن کو ہمارے عرف میں اہلِ خدمت کہتے ہیں، اور ان میں سے جو اعلیٰ اور اقویٰ اور دوسروں پر حاکم ہوتا ہے اس کو قطبُ التکوین کہتے ہیں، اور ان کی حالت مثلِ حضراتِ ملائکہ علیہم السلام کے ہوتی ہے، جن کو (قرآن مجید میں) مدبراتِ امر

فرمایا گیا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام اسی شان کے معلوم ہوتے ہیں...... ان (اہلِ تکوین) کے مقام ومنصب کے لئے ایسے تصرفاتِ عجیبہ کا ہونا لازم ہے، بخلاف اہلِ ارشاد کے کہ ان کا خود صاحبِ خوارق ہونا بھی ضروری نہیں، البتہ ان حضرات کی کرامات اور طور کی ہوتی ہیں، کہ ان کا ادراک عوام کو نہیں ہوتا، بلکہ وہ امور ذوقی ووجدانی ہیں کہ اکثر اوقات ان کی خدمت وصحبت سے جو شخص مستفید ہوتا ہے، اس کو معلوم ہوتے ہیں...... باقی یہ (شبہ) کہ جب نفع طریقت اہلِ ارشاد ہی سے ہوتا ہے تو اہلِ تکوین کے کمالات بیان کرنے سے کیا فائدہ، تو اس میں دو فائدے ہیں، ایک علمی دوسرا عملی، علمی تو یہ کہ ایک کام کی بات معلوم ہو جائے، تا کہ علم ناقص نہ رہے، عملی یہ کہ اکثر ایسے لوگ ظاہر صورت سے خستہ حال وشکستہ بال وذلیل وخوار ہوتے ہیں، اگر یہ مسئلہ کسی کو معلوم ہوگا تو مساکین کی تحقیر وتوہین تو نہ کرے گا، خوب سمجھ لو (کلیدِ مثنوی، دفترِ اول صفحہ ۲۹۵، البدائع صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸، بدیعہ نمبر ۳۲)

(۲)...... اکثر اُمور اہلِ باطن ہی کے تصرف سے انجام پاتے ہیں، جیسے خضر علیہ السلام نے دیوار کو ہاتھ سے سیدھا کر دیا (ملفوظات مجالس الحکمۃ صفحہ ۱۰۱، مجلس نمبر ۲۶)

(۳)...... فرمایا کہ ہر امر میں تکوینی مصلحتیں بھی ضروری ہیں لیکن تکوینی مصلحت کی بنیاد پر تشریع کو نہ چھوڑا جائے گا، جو مصلحت ہونے والی ہوگی، آپ ہو رہے گی کیونکہ ہم تشریع کے تو مکلّف ہیں، اس کے چھوڑنے پر مؤاخذہ ہے اور تکوینی مصلحتوں کے ہم مکلّف نہیں کیونکہ ہمارے اختیار میں نہیں (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۲۰، ملفوظ نمبر ۹۶۳)

(۴)...... فرمایا کہ تعلق بالتکوین ایک خاص منصب ہے، جس کو عطا ہوتا ہے اس کا علم ضروری غیر استدلالی دیا جاتا ہے، نہ اس میں تدریج ہے نہ تدبیر وتفکر ہے، صاحبِ تکوین کی شان تو حضرت خضر علیہ السلام یا ملائکہ سی ہوتی ہے کہ وہ بلا تأمل یہ کہہ سکتا ہے "**ومافعلتهٗ عن امری**" (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۵۳، ملفوظ نمبر ۱۰۶۹)

(۵)......فرمایا کہ قطبُ التکوین کو اپنی قطبیت کا علم ضروری ہے، مگر قطبُ الارشاد کو ضروری نہیں، ابدال وغیرہ بھی تکوینیات سے متعلق ہیں، قطبُ الارشاد میں تعدد ضروری نہیں، ہاں قطبُ التکوین متعدد ہوتے ہیں، مگر قطبُ الاقطاب تمام عالَم میں ایک ہوتا ہے؛ اس کا نام غوث ہے؛ اہلِ کشف ان کو پہچانتے ہیں۔

قطبُ التکوین دائماً اور قطبُ الارشاد احیاناً متعدد بھی ہوتے ہیں (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۷۸، ملفوظ نمبر ۱۱۳۹)

(۶)......فرمایا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قطبُ الارشاد کے درجے کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے قطبُ التکوین کا مرتبہ بھی عطا فرمایا تھا، کچھ دنوں کے لیے تکوینی خدمت بھی مولانا کے سپرد ہوئی تھی، اس زمانہ میں کوئی مجذوب بدون حضرت کی اجازت کے وہاں نہیں آ سکتا تھا، جو آتا تھا اجازت لے کر آتا تھا، یہ خاص شان مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کسی میں نہ تھی، اور ہمارے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قطب الارشاد تھے، اس پر اس خادم نے عرض کیا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ تھا؟

فرمایا نہیں۔ ہمارے بزرگوں کی تو یہ رائے تھی کہ اس جماعت میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ سب سے بلند تھا، رہ گیا قطب التکوین ہونا یہ اور اَمر ہے۔ اور مراتبِ کمال میں خاص شان رکھنا اور ہے، جیسا حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ہے۔

حضرت خضر قطب التکوین تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام قطب الارشاد۔ اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام ان سے افضل تھے۔

خضر علیہ السلام کی تو نبوت تک میں اختلاف ہے، اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت قطعی ہے اور نبوت کے ساتھ وہ انبیائے اولوالعزم میں سے ہیں، انبیاء میں ان کا بہت بڑا درجہ

ہے، مگر وہ قطب التکوین نہ تھے، اسی لیے جناب خضر کے معاملات کو نہ سمجھے اور ان کے ہر فعل پر اعتراض کرتے رہے۔

غرض بعض علومِ تکوینیہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو ایسے عطا فرمائے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھے، اور اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام سے ایک خاص بناء پر استفادہ کرنا پڑا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت خضر علیہ السلام کا مرتبہ بلند ہوگیا (ملفوظات مجالس الحکمۃ صفحہ ۳۲۸، ۳۲۹، مجلس نمبر ۷)

(۷)......تکوینی کارخانہ سے سب کو قوت پہنچتی ہے، خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم؛ چنانچہ جب کافر سوجاتا ہے تو اس سوتے ہوئے کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر ہیں جو اس پر پہرہ دیتے ہیں اور اس کو سانپ بچھوؤں سے بچاتے ہیں، پس کافر کو بھی اسی تکوینی کارخانے سے مدد پہنچتی ہے اور مسلمانوں کو بھی؛ لہٰذا کسی کی اس تکوینی کارخانے سے مدد ہونا اس شخص کی مقبولیت کی علامت نہیں (الافاضات الیومیہ جلد۱۰ صفحہ ۲۹۷، ملفوظ نمبر ۲۰۰)

(۸)......ان (تکوینی حضرات) کو ڈھونڈنا بالکل بے کار ہے، اس لیے کہ وہ خدا کے قبضہ میں ہیں، ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہوتا ہے، خواہ ان کی خدمت کرو یا نہ کرو، تو مناسب یہ ہے کہ جو ان کے منہ سے نکلواتا ہے اس کو راضی کرو، لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں (تسہیل المواعظ جلد دوم صفحہ ۴۰۲)

مذکورہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اصحاب ارشاد وہدایت یا اصحابِ تشریع جو عام انبیائے کرام علیہم السلام کے طرز پر ہوتے ہیں، ان میں بھی قطب، غوث وغیرہ، کے درجے وعہدے کے اولیائے کرام ہوتے ہیں اور صوفیائے کرام جن کا تعلق طریقت سے ہوتا ہے وہ بھی اسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اصحابِ خدمت واصحابِ تکوین جو حضرت خضر علیہ السلام کے طرز پر ہوتے ہیں، ان میں بھی ان مذکورہ درجوں وعہدوں کے اولیائے کرام ہوتے ہیں، تکوینی حضرات کو عام اصطلاح میں ''صاحبِ خدمت'' بھی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا عام طور پر جو یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اقطاب، غوث وابدال وغیرہ کو اصحابِ خدمت وتکوین کے ساتھ خاص سمجھا جاتا ہے، یہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔

تقسیم کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اولیائے کرام میں بعض تو وہ ہوتے ہیں جو خالص اصحابِ ارشادِ ہدایت ہوتے ہیں، اوران کا احکامِ شریعت سے ہی تعلق ہوتا ہے۔

اور بعض وہ ہوتے ہیں جو صرف اصحابِ تکوین واہلِ خدمت ہوتے ہیں، اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق دونوں شعبوں یا دونوں نظاموں سے ہوتا ہے، پھر ان میں بھی بعضوں پر تشریع کا غلبہ ہوتا ہے اور بعضوں پر تکوین کا، جیسا قدرت کو منظور ہو۔

اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہوگیا کہ اصحابِ تکوین واصحابِ خدمت کی کرامات اس نوعیت کی ہوتی ہیں، جو عموماً لوگوں کو عجیب وغریب معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ حسی نوع کی ہوتی ہیں، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا لوگوں پر اظہار کر دیا جائے، لیکن اصحابِ تشریع واصحابِ ارشاد و ہدایت کی کرامات اس نوعیت کی نہیں ہوتیں بلکہ حقیقی ومعنوی درجہ کی کرامات ہوتی ہیں جن کا درجہ حسی کرامات سے اعلیٰ وارفع ہے اوراسی لئے اس نوع کے حاملین عنداللہ زیادہ مقرب ومقبول ہیں۔

لہٰذا جو یہ تصور پایا جاتا ہے کہ حسی نوعیت کی کرامت اوراس کے حامل کو زیادہ مقرب ومقبول سمجھا جاتا ہے اوراس کرامت کو زیادہ کمال کی چیز سمجھا جاتا ہے، یہ بھی غلط فہمی ہے،

اور عنداللہ اصحابِ تکوین کے مقابلہ میں اصحابِ تشریع کا درجہ بڑھا ہوا ہے، اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اصحابِ تشریع اوراصحابِ رشدوھدایت مکلفین کے اختیاری افعال سے بحث کرتے اوراسی کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، جس مقصد کے لئے جن وانس کی تخلیق ہوئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورة الذاريت آيت نمبر ۵۶)

اس کے برخلاف اصحابِ تکوین واصحابِ خدمت کا درجہ اس مقصد کے لئے خادمین کا سا ہوتا ہے، وہ اسی مقصود کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، خود ان کا کام مقصود نہیں ہوتا۔

چونکہ اصحابِ تکوین کی خدمات کا زیادہ تر تعلق تکوینی وتقدیری امور سے ہوتا ہے، جن میں اختیار کو اتنا

عمل دخل نہیں ہوتا، اس لئے عام مکلفین کواس سے بے خبر رکھا جاتا ہے، اور اسی لئے اس کی تلاش و جستجو کو بھی پسند نہیں کیا جاتا۔

اس لئے مکلفین کی شان یہ ہونی چاہئے کہ وہ شریعت کے تقاضوں اور اس کے احکام کو پیش نظر رکھ کر اپنی زندگی گزاریں اور جس طرح تقدیر پر ایمان ہوتے ہوئے شریعت کے احکام کی قدر کرتے ہیں اور تقدیر کی وجہ سے شریعت کو نظر انداز نہیں کرتے، اسی طرح تکوین کو بھی تقدیر کی اخوات میں سے سمجھتے ہوئے شرعی احکام کی پیروی کریں۔

بہر حال تکوینی نظام کیونکہ اسرارِ غیبیہ واُمورِ کونیہ سے متعلق ہے، اور اللہ تعالیٰ کا خفیہ محکمہ ہے، جس کے ذریعہ امور طے ہوتے ہیں، جس طرح دنیا کے تقریباً ہر ملک میں سی آئی ڈی کا ایک خفیہ محکمہ ہوتا ہے، اور وہ خفیہ طریقے سے ہی اپنا نظم وعمل جاری رکھتا ہے اور اس کا عامۃُ الناس پر اظہار فائدہ مند نہیں ہوتا، اسی طرح تکوینی نظام سے بھی عام مکلفین کا کوئی فریضہ ووظیفہ وابستہ نہیں، اور بعض جہات سے وہ مافوقُ العقل بھی ہوتا ہے، اس لیے کماحقہٗ اسے عامۃُ الناس سے مصلحت کی خاطر خفیہ وپوشیدہ رکھا جاتا ہے۔

تکوینی حضرات کی مخصوص ڈیوٹیاں ہوتی ہیں، یہ حضرات اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے اپنے کام انجام دیتے ہیں۔

تکوینی حضرات کے مختلف کام، مختلف مقام اور مختلف مدارج ہوتے ہیں، کسی کا حکومت سے تعلق ہوتا ہے، کسی کا نظم ونسق سے، کسی کا حالات وحوادثات سے، کسی کا معاشی معاملات سے، کسی کا مذہبی اُمور سے، وغیرہ وغیرہ۔

ان میں بھی بعض تو باہوش وحواس ہوتے ہیں اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں، کوئی گھاس کھود کے لاتا ہے، کوئی جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتا ہے، کوئی خربوزے بیچتا ہے، کوئی جوتی گانٹھتا ہے، کوئی سبزی بیچتا ہے، کوئی چنے بیچتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن درحقیقت یہ سرکاری آدمی ہوتے ہیں خود کو چھپانے کے لئے ایسا کرتے ہیں ورنہ اصل کام ان کا تکوینی ڈیوٹی دینا ہوتا ہے۔

تکوینی حضرات کو اپنی خدمات انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی قوتِ گویائی عطا فرمائی جاتی ہے جو عام عادی اور فطری زبان سے مختلف ہوتی ہے؛ چنانچہ بعض اوقات مخصوص اشارات وکنایات سے ان کی باہم گفت وشنید ہوتی ہے، اور بعض اوقات اس کے بغیر بھی روحانی طریقے پر ربط وتعلق ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام انسانوں کے طریقے پر گفت وشنید ہوتی ہے۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ کو جس طریقے سے منظور ہوتا ہے اسی طریقے سے گفت وشنید کا معاملہ جاری ہوتا ہے۔

ان کی تحریر بھی تکوینی ہوتی ہے، بعض اوقات اس کو عام آدمی نہیں سمجھ پاتا، چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ بے ہنگم، بے تکی قسم کی لکیریں ہوتی ہیں، جو کسی کاغذ یا ٹھیکری پر لکھ کر کسی کو دیدیتے ہیں، پھر متعلقہ خدمت گار بحکمِ الٰہی اس کو پڑھ لیتے ہیں، اور اس کے مطابق کام انجام دیتے ہیں، اور اگر جواب دینا منظور ہو تو اسی انداز کی تحریر لکھ کر جواب دے دیا جاتا ہے۔

ان تکوینی حضرات کا بحکمِ الٰہی باہم تعارف اور بوقتِ ضرورت ملاقات بھی ہوتی ہے، جس کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔

تکوینی حضرات کا سفر بعض اوقات روحانی یعنی عنصری جسم اپنی جگہ برقرار رہتے ہوئے ہوتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، اُس مقام پر روحانی طور سے تعلق قائم ہوجاتا ہے، جس میں بعض اوقات مثالی جسم کا واسطہ بھی ہوتا ہے۔

اور بعض اوقات ان کا سفر جسدِ عنصری کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس میں بھی اگر مشیتِ ایزدی ہو تو تمام فاصلے بغیر کسی ظاہری اسباب کے طے کرادیے جاتے ہیں، جسے طیِّ ارض کی کرامت کہا جاتا ہے، اور کبھی سفر میں اسبابِ ظاہری کو بھی دخل ہوتا ہے۔

تکوینی حضرات کا مخصوص مقامات پر جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، قیام ہوتا ہے، اور مختلف مقامات پر ڈیوٹیاں بھی لگائی جاتی ہیں اور تبادلے وانتقال کا عمل اور عزل ونصب کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

مجذوبین

اور بعض تکوینی حضرات مجذوب ہوتے ہیں، یہ حضرات بھی بحکمِ الٰہی تقریباً ہر جگہ ہوتے ہیں یا پھر جہاں کہیں قدرت کو منظور ہوتا ہے، پہنچ جاتے ہیں، ان میں بعض کو اس درجے کا ہوش وحواس عقل وغیرہ ہوتی ہے کہ وہ بھوک پیاس سردی گرمی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا تدارک من جانب اللہ ہوتا رہتا ہے، بعض ایسے ہوتے ہیں جو باقاعدہ لباس وغیرہ پہنتے ہیں، عام آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے ہیں، لیکن کام کچھ نہیں کرتے، الٹی سیدھی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، جس میں ارکان کی ادائیگی رکعتوں کی تعداد وغیرہ نہیں ہوتی۔

اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو ننگ دھڑنگ ہوتے ہیں بالکل برہنہ یا تھوڑا بہت معمولی سا لباس، کہیں ہے کہیں نہیں، یہ عام لوگوں سے لاتعلق ہوتے ہیں ہر وقت ان کی انجذابی کیفیت ہوتی ہے، بہت کم بات کرتے ہیں وہ بھی الٹی سیدھی، پھر ان میں عمر کی بھی قید نہیں ہوتی، بہت کم عمر دس بارہ سال سے لے کر بڑی عمر تک کے ہوتے ہیں۔

مجذوبین میں سے اصحابِ تکوین کا انتخاب کرنے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بھی کارفرما ہوتی ہے کہ مجذوب مغلوب العقل ہونے کی حالت میں احکامِ شرع کی تکلیف سے مرفوع القلم اور مستثنیٰ ہوتے ہیں، لہٰذا اس حالت میں ان سے ایسے امور کا سرزد ہونا جو بظاہر خلافِ شرع معلوم ہوتے ہیں، ان کے لئے قادح نہیں ہوتے اور مکلفین کے لیے نظامِ شریعت بھی اپنی جگہ بحالہٖ وبقاعدہٖ باقی رہتا ہے۔

مجذوبین کے بارے میں کیونکہ عامۃُ الناس افراط وتفریط میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اس لیے ان کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی میں پڑ کر افراط تفریط میں ابتلاء نہ ہو۔

ذیل میں حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے ارشادات سے مجذوبین پر روشنی ڈالی جاتی ہے:

(۱)...... اہلِ خدمت اکثر مجاذیب ہوتے ہیں اور ان کے اسرار اکثر سمجھ میں نہیں

آتے، اس قسم کے مضامین میں نے ایک وعظ میں بیان کیے، ایک عالم خشک نے اعتراض کیا، کہ یہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں کہ اہلِ خدمت بھی کوئی چیز ہوتے ہیں، میں نے راوی سے کہا کہ ان سے پوچھنا چاہیے کہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو کیا کہو گے؟

گو یہ اصطلاح (اہلِ خدمت وغیرہ کی) قرآن میں نہ آئی ہو، مگر عنوانات تو مقصود نہیں ہوتے، معنوَن مقصود ہوتا ہے (الافاضاتُ الیومیہ جلد۳ صفحہ۶۲، ملفوظ نمبر۷۰)

(۲)......''مجنون وہ ہے جس کی عقل اخلاطِ فاسدہ کے غلبہ سے زائل ہوجائے اور مجذوب وہ ہے کہ جس کی عقل کسی وارِدِ غیبی کے غلبہ سے زائل ہوجائے، مگر کبھی احوال وواردات کے غلبہ سے اخلاط میں بھی تغیر ہوجاتا ہے، اس لئے علت سے تو اس کی پہچان مشکل ہے، مجذوب کے پاس بیٹھ کر قلب کو آخرت کی طرف کشش ہوتی ہے، علامت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ بصیرت (محققین جامع شریعت وطریقت) اس شخص پر نکیر نہ کرتے ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر مجنون مجذوب ہی ہوا کرے، اس میں ایک نکتہ ہے جس کی وجہ سے لوگ مجذوبوں کے طالب ہیں، وہ یہ ہے کہ مجذوب جو کچھ کہہ دیتا ہے وہی ہوجاتا ہے، حالانکہ اس کے کہنے سے نہیں ہوتا ہے، وہ منجانب اللہ ہوتا ہے، یعنی جب کوئی کام منجانب اللہ ہونے والا ہوتا ہے تو ان کو اس کا انکشاف ہوجاتا ہے نہ کہ وہ کام اس کے کہنے کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ ان کا کہنا اسی کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر یہ نہ بھی کہتے تو تب بھی ہوتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے تار بابو کے پاس تار آتا ہے اور وہ اس کو لکھ کر لوگوں کو تقسیم کردیتا ہے، اس میں ان کو دخل نہیں، اگر اس پر یہ آمد نہ ہو تو پھر کچھ نہیں لکھ سکتا، اب اگر کوئی اپنی بے وقوفی سے تار بابو کو مٹھائیاں اور نذرانہ پیش کرنے لگے تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے اور اس بے وقوفی کا کیا علاج، یہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ خبریں اس بابو کے اختیار میں ہیں، خواہ اچھی خبریں دے خواہ بری خبریں دیں، حالانکہ بابو کو اس کے اخفاء واظہار میں کوئی دخل نہیں، بلکہ تم اگر اس کو

برا بھی کہو گے تب بھی وہ اس میں کمی زیادتی نہیں کرسکتا، غرضیکہ مجذوب وغیرہ کے قول کا کچھ اثر نہیں ہوتا، لوگ ناحق اپنا وقت خراب کرتے ہیں (اس لئے کہ) مجذوب سے نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے نہ دین کا، دین کا اس لئے نہیں کہ وہ تعلیم ونصیحت پر موقوف ہے اور تعلیم ونصیحت اس سے حاصل نہیں ہوتی، جیسا کہ ظاہر ہے اور دنیا کا اس لئے نہیں کہ وہ دعا سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا کرتے نہیں کیونکہ وہ لوگ صاحبِ کشف ہوتے ہیں، ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دعا کرنا تو فضول وبے کار ہے، اور اس کے خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ کرنا ہے، بہرحال وہ لوگ دعا نہیں کرتے، البتہ کشف کی بنا پر کبھی بطورِ پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں یوں ہوگا، سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا، اس طرح ہوجانا کچھ ان کے کہنے کے سبب نہیں ہوا، غرض کہ مجذوب سے کسی طرح کا نفع نہیں ہوتا، ہاں دوسرے بزرگوں سے ہر طرح کا نفع ہوتا ہے، کیونکہ وہاں تعلیم ونصیحت بھی ہوتی ہے اور دعا بھی، دین کا بھی نفع ہوتا ہے اور دنیا کا بھی، بلکہ مجذوبوں کے فکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بے کار سمجھنے لگتے ہیں، شریعت کی وقعت وعظمت ایسے لوگوں کے دلوں سے جاتی رہتی ہے، کیونکہ مجذوب مکلّف نہ ہونے کے سبب شریعت کی پیروی تو کرتے نہیں، پس ان کی فکر کرنے والے بھی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، حالانکہ مجذوب لوگ تو بوجہ عقل جاتی رہنے کے معذور ہیں، اور ان لوگوں میں عقل وسمجھ سب کچھ ہے اس لئے یہ معذور نہیں (لہٰذا یہ اپنا دین برباد کرتے ہیں) تو یہ کتنا بڑا ضرر ہے جو مجذوبوں کی بدولت بجائے نفع کے پہنچتا ہے اس لئے ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے (مطلب یہ کہ ان کی صحبت اور ان سے کسی غرض کے لئے ملنا جلنا بالکل ترک کردینا چاہئے، البتہ مجذوب کو برا بھلا کہنا جائز نہیں پس) دعا تو سالک سے کرانی چاہئے کہ ان کی دعا کا اثر ہوتا ہے اور خلافِ انکشاف بھی دعا کرسکتے ہیں، بخلاف مجذوب کے کہ ان کو اس کی اجازت نہیں ہوتی، کیونکہ بوجہ نقصانِ حال اس انکشاف کا

یقین ہوگیا ہے اور سالک کو بوجہ کمالِ حال کشف کا یقین نہیں ہوتا۔

مجذوب کی نظر کبھی تو چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر ہو جاتی ہے اور نہ ہو تو بڑی سے بڑی بات پر بھی نہیں ہوتی، اس لئے کہ جذب کی وجہ سے استغراقی کیفیت ان حضرات پر غالب رہتی ہے، اسی لئے ان کا فعل حجت نہیں، مجذوبوں کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ زیادہ نہیں ہوتا وہ صرف معذور ہوتے ہیں۔

مجذوب گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں، کیونکہ وہ اعمال سے محروم ہیں اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے، ورنہ ارواح کو عالمِ ارواح سے عالمِ اجسام میں نہ بھیجا جاتا، کیونکہ عالمِ ارواح میں ارواح حاملِ احوال تھیں، مگر حاملِ اعمال نہ تھیں، چنانچہ ارواح میں محبت اس درجہ تھی کہ اس محبت ہی کی وجہ سے حملِ امانت پر آمادہ ہوگئیں، اس کا منشا محبت وعشق ہی تھا، مجذوب کی خدمت اگر ہو سکے کر دے لیکن توجہ کا ان سے ہرگز طالب نہ ہو، اور اگر ان کے حواس کی درستی میں شبہ ہو تو ان کی دی ہوئی چیز کو بھی نہ لے، اگر لے لے تو اس سے لقطہ کا معاملہ کرے‘‘ (شریعت وطریقت ص ۳۴۵)

(نیز ملاحظہ ہو: حسن العزیز جلد اول حصہ نمبر ا، صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱)

(۳)......ایسے مجاذیب بدلتے بھی رہتے ہیں جیسے سرکاری حکام گورنمنٹ کے بدلتے رہتے ہیں (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ صفحہ ۳۷۸، ملفوظ نمبر ۱۱۳۹)

(۴)......اقطابُ التکوین مجاذیب زیادہ ہوتے ہیں (الافاضات الیومیہ جلد ۲ صفحہ ۳۱، ملفوظ نمبر ۲۰)

(۵)...... ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت سنا ہے کہ یہ اُمورِ تکوینیہ مجذوبین کے متعلق ہوتے ہیں، بدون عقل کے وہ کیسے کام کرتے ہوں گے؟ فرمایا ان کے متعلق ہونا صحیح ہے اور گو ان میں عقل نہیں ہوتی لیکن جو کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے ،اس میں عقل کی ضرورت نہیں، اس لیے اس کو بخوبی انجام دیتے ہیں کیونکہ انجام دینا عقل پر موقوف نہیں بلکہ سلامتِ حواس بھی کافی ہے، جیسے بچہ کہ اس کو عقل تو ہوتی نہیں

مگر حواس ہوتے ہیں، بھوک پیاس میں کھانے پینے کو مانگتا ہے، خوشی کی بات سے خوش ہوتا ہے، رنج کی بات سے اگر ڈرایا جائے یا ہنسایا جائے، ڈرتا ہے ہنستا ہے، ان چیزوں میں عقل کی ضرورت نہیں؛ یہ فطری چیزیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقل اور چیز ہے اور حواس اور چیز، پس ان مجذوبین کی حالت مشابہ بچوں کے ہے، یہی وجہ ہے کہ سالکین مراتب میں مجذوبین سے افضل ہیں اور بعض اوقات سلامتِ حواس بھی شرط نہیں ہوتی (الافاضات الیومیہ جلد ۱ صفحہ ۵۵، ملفوظ نمبر ۳۶ و ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ، صفحہ ۸۵، ملفوظ نمبر ۱۴۶)

(۶)...... یہی مجذوب ہیں جن کے سپرد کارخانۂ تکوینیہ ہے اس کے انتظام کے ذمہ دار ہیں، باقی جو اہلِ ارشاد ہیں وہ نائبِ رسول اللہ ہیں، وارثانِ پیغمبر ہیں، ان کی شان کہیں ارفع واعلیٰ ہے (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ، صفحہ ۳۶۷، ملفوظ نمبر ۱۱۱۶)

(۷)...... تکوینی کارخانہ مجذوبین سے متعلق کرنے میں یہ حکمت ہے کہ ان میں عقل نہیں ہوتی، اس لیے تشریع کے مکلّف نہیں ہوتے اور ان کی بعض خدمتیں شرع پر منطبق نہیں ہوتیں، مثلاً اگر مسلمانوں اور کافروں میں مقابلہ ہو تو مسلمانوں کا غلبہ مقصودِ تشریعی ہے، اور ایسا ہونا بعض اوقات خلافِ مصلحت اور حکمت ہوتا ہے اس لیے ایسی جماعت سے سپرد کیا گیا جس کو اس سے کچھ بحث نہیں اور ایسا کام سالک کب کرسکتا ہے اور اس کو کیسے جائز ہوتا؟

اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ میرا رُجحان پہلے اس طرف تھا کہ مجذوبین اجتہاد نہیں کرتے محض امرِ صریح کے متبع ہیں (مگر بعد میں اس طرف رُجحان ہوگیا کہ یہ جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، وہاں بحکمِ الٰہی اجتہاد بھی کرتے ہیں) (الافاضات الیومیہ جلد ۱ صفحہ ۹۴، ملفوظ نمبر ۱۰۶)

(۸)...... مجذوب کی فکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو بے کار سمجھنے لگتے ہیں (الرفیق فی سواء الطریق صفحہ ۴۷)

اولیائے کرام کے کشف وکرامات کے متعلق چند اُصولی باتیں

جب تشریعی اور بالخصوص تکوینی اولیائے کرام کی کرامات اور کشف وغیرہ کی بحث آتی ہے، تو آج کل بعض لوگ اولیائے کرام کی کشف وکرامات کا انکار کرتے ہیں، اور بعض لوگ کشف وکرامات سرزد ہونے پر اولیائے کرام کی طرف خدائی صفات منسوب کرتے ہیں۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں اور حق بات ان دونوں کے درمیان ہے کہ کشف وکرامات کا صدور اولیائے کرام سے ممکن ہے (اور اس کے بے شمار دلائل قرآن وحدیث اور واقعات ومشاہدات سے ثابت ہیں) لیکن کشف وکرامات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کارفرما ہوتی ہے۔ یعنی کرامت ولی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو ولی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے، جس طرح انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات حق ہیں مگر انبیائے کرام علیہم السلام کا ان کے صادر کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا اسی طرح اولیائے کرام کی کرامات بھی حق ہیں لیکن ان کے صادر کرنے میں بھی اولیائے عظام کا کوئی کسب واختیار نہیں ہوتا، جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کے ہاتھ پر کوئی کرامت ظاہر کردیتا ہے، بسا اوقات ان کو علم اور شعور تک بھی نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی ہمارے ہاتھ پر ظاہر ہوگی یا ہوسکتی ہے۔

لہٰذا کشف وکرامات میں بندوں کی طرف خدائی صفات منسوب کرنا کرامت کی حقیقت سے بے خبری کی نشانی ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> میں نے کرامت کے متعلق ایک وعظ میں بیان کیا تھا، جس میں بعض غیر مقلدین بھی شریک تھے، جو بعض کرامات کے اعتقاد میں شرک کا شبہ کرتے تھے، میں نے اس بیان میں اس کا جواب دیا تھا کہ یہ بتاؤ کہ کرامت میں فاعل کون ہے؛ حق یا عبد؟
>
> سو ہم تو کرامت میں فاعل حق تعالیٰ کو مانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی قدرت محدود نہیں اس لیے بعید سے بعید کرامت کا صدور بشرطِ امکانِ عقلی وشرعی ممکن ہے، اور آپ فاعل مانتے ہیں عبد کو اس لیے کرامت میں حدود قائم کرتے ہیں، تو آپ غور کرلیجیے کہ

یہ آپ کا کراماتِ مستبعَدہ کو نہ ماننا اقرب الی التوحید ہوا یا اقرب الی الشرک؟

ظاہر ہے کہ آپ کا کراماتِ عظیمہ کو نہ ماننا اقرب الی الشرک ہے، اور ہمارا ان کو ماننا اقرب الی التوحید ہے (الافاضات الیومیہ جلد ۸ صفحہ ۳۲۶، ملفوظ نمبر ۴۵۳)

کرامت اس چیز کو کہتے ہیں جو نبی کی اتباعِ کامل کرنے والے پر ظاہر ہو اور قانونِ عادت سے خارج ہو (یعنی خلافِ عادت ہو) اور اگر وہ چیز خلافِ عادت نہ ہو تو کرامت نہیں ہے اسی طرح اگر وہ شخص نبی کی اتباع کرنے والا نہ ہو اگرچہ اتباع کا دعویٰ کرتا ہو اس کا فعل بھی کرامت نہیں۔

پس جو لوگ ہر قسم کے شخص کے ہاتھ پر خلافِ عادت چیزیں دیکھ کر اس کو کرامت سمجھ لیتے ہیں یا ایسے شخص کے معتقد ہوجاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، جیسے مسمریزم، حاضرات ہمزاد کا عمل، جادو، ٹونا ٹوٹکا، مختلف شعبدہ بازیاں اور نظر بندی وغیرہ۔

پھر کرامت کی دو قسمیں ہیں ایک حسّی (یعنی ظاہر میں محسوس ہونے اور نظر آنے والی) جیسے ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا وغیرہ، اور دوسری قسم معنوی ہے یعنی شریعت پر استقامت اختیار کرنا، نیک کاموں کی پابندی کرنا، اچھے اخلاق کا خوگر ہوجانا اور بُرے اخلاق سے دل کا پاک ہوجانا وغیرہ۔

محققین کے نزدیک معنوی کرامت کا درجہ زیادہ ہے کیونکہ اس میں کسی خرابی یا غلط چیز کے ساتھ مشابہت نہیں اور حسّی کرامت میں ظاہری طور پر کئی دوسرے احتمالات ہیں، اسی لئے عربی کا مشہور مقولہ ہے "اَلْاِسْتِقَامَۃُ فَوْقَ الْکَرَامَۃِ" یعنی دین پر ثابت قدم رہنا (حسی) کرامت سے بڑی چیز ہے۔

کشف وکرامت سے متعلق حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کے چند بہت ہی مفید ملفوظات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱)......بعض کشف ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بالکل احتمال غلطی کا نہیں ہوتا مگر پھر بھی شرعاً حجت نہ ہوگا، اور اس کو مستبعَد نہ سمجھا جاوے کہ جب اس میں غلطی کا احتمال نہیں پھر حجت نہ ہونے کی کیا وجہ؟

اس کی بالکل ایسی مثال ہے، کہ ایک شخص رمضان کی ۲۹ تاریخ کو عید کا چاند دیکھتا ہے،

اور دیکھنا ظاہر ہے کہ حسی طور پر ہے، جس میں کوئی اشتباہ نہیں، پھر اس پر یہ بھی واجب ہوگا کہ قاضی سے جا کر ظاہر کرے کیونکہ ممکن ہے کہ اور بھی کوئی شہادت ہو گو اپنے علم میں یہ واحد مگر یہ نہ سمجھے کہ واحد کی شہادت مقبول نہ ہوگی۔ تو شہادت سے کیا فائدہ کیونکہ اگر سب دیکھنے والے اپنے کو واحد واحد سمجھ کر شہادت سے تقاعد کریں تو رویت کیسے ثابت ہو؟ غرضیکہ اس نے جا کر قاضی سے کہا مگر اتفاق سے اور کوئی شہادت نہ تھی، اس لیے قاضی نے کہہ دیا کہ حجت نہیں تو اس صورت میں باوجود اس کے کہ اس نے خود دیکھا اور بلا اشتباہ دیکھا مگر پر بھی خود اس کے لیے بھی حجت نہیں۔

چنانچہ یہ بھی روزہ وجوباً رکھے گا (یعنی اس کو بھی بوجہ عید کا چاند خود دیکھ لینے کے بعد افطار کرنا جائز نہیں بلکہ روزہ ہی رکھنا واجب ہے، کیونکہ شہادت شرعی سے چاند ثابت نہیں ہوا) ایسے ہی اگر کسی کو کشف ہو اور بالکل بلا تلبیس مگر پھر بھی عدمِ تلبیس مستلزم نہیں۔ حجیت کو شیخ اکبر بعض کشوف میں تلبیس کی نفی فرماتے ہیں مگر غلطی سے یہ مشہور ہو گیا کہ وہ کشف بلا تلبیس کو حجت سمجھتے ہیں، ان کے قول میں یہ کہیں تصریح نہیں کہ بعض کشف حجت ہے، پس مذہب منصور سب کے نزدیک یہ ہی ہے کہ کشف حجت نہیں (الافاضات الیومیہ جلد۳ صفحہ۲۱۴، ۲۱۵، ملفوظ نمبر۳۴۷)

(۲)...... کشف تو یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص راستے میں آ رہا ہے اس کو یہیں بیٹھے دیکھ لیا اور پھر بعد میں وہ آ بھی گیا، فراست دل کی گواہی دینے کو کہتے ہیں، اس کو الہام کہنا زیادہ مناسب ہے، فراست اور عقل باہم مشابہ ہیں، عقلاء کو بھی عقل کے ذریعے باتیں معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن عقل اور فراست میں یہ فرق ہے کہ عقل تو اسبابِ ظاہری سے استدلال کرتی ہے اور فراست محض وجداناً محسوس ہوتی ہے (ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ صفحہ۲۹۴، ملفوظ نمبر۸۶۲)

(۳)...... بعض عارفین کا قول ہے کہ الہام میں غلطی نہیں ہوتی، جیسے حواس اگر ماؤف نہ ہوں تو ان میں غلطی نہیں ہوتی، مگر جمہور کا مذہب یہی ہے؛ خود اہلِ کشف میں سے بھی

،کہ کشف والہام ظنی ہے، قطعی نہیں (حسنُ العزیز صفحہ ۳۲۰، ملفوظ نمبر ۵۱۸)

(۴)......لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی چیز نہیں، اس کو قُرب میں کچھ بھی دخل نہیں؛ بعضوں کو اس سے فطری مناسبت ہوتی ہے، بعضوں کو نہیں؛ جیسے بعضوں کی نظر پیدائشی طور پر دُور بین ہوتی ہے بعضوں کی نزدیک بین (حسنُ العزیز صفحہ ۴۲، ملفوظ نمبر ۶۲)

(۵)......غیب کے دو معنیٰ ہیں؛(۱) حقیقی (۲) اور اضافی۔

حقیقی وہ جس کے علم کا کوئی ذریعہ نہ ہو، یہ خاص ہے حق تعالیٰ کے ساتھ، اور عبد کے لیے اس کا حصول محالِ شرعی وعقلی ہے؛ اضافی وہ جو کسی ذریعہ سے بعض کو معلوم کرادیا جاوے، اور بعض کو پوشیدہ رکھا جاوے، یہ عبد کے لیے بھی باعلامِ الٰہی (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگاہ کرنے سے) حاصل ہوسکتا ہے، پس غیب کے معنیٰ اول اور کشف میں تو تباین ہے، اور معنیٰ ثانی کے اعتبار سے دونوں میں تباین نہیں ہے............

کبھی متوجہ ہونے سے کشف ہوجاتا ہے اور کبھی بلا توجہ ہوجاتا ہے، اور کبھی متوجہ ہونے سے بھی نہیں ہوتا، غرض امرِ اختیاری نہیں ہے، البتہ گاہے قصد پر مرتب ہوجاتا ہے

............انبیاء اور اولیاء سے دو قسم کے اُمور صادر ہوتے ہیں، ایک معجزات اور کرامات، دوسرے تصرفات، پس معجزات انبیاء کے اور کرامات کے اولیاء کے اختیاری نہیں، اور تصرفات اختیاری ہیں، ان تصرفات کو معجزہ یا کرامات نہیں کہتے، لیکن کبھی مجازاً کہہ بھی دیتے ہیں (امدادالفتاویٰ جلد پنجم صفحہ ۱۴۴، جواب سوال نمبر ۱۵۴)

اب کرامت کے متعلق حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا ایک جامع مضمون نقل کیا جاتا ہے، جس سے کرامت کا مسئلہ اپنے مالہٗ وماعلیہا کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ پوری طرح واضح ہوجائے گا۔

جاننا چاہیے کہ خلاصۂ کلام محققین کا اس باب میں یہ ہے کہ کرامت اُس امر کو کہتے ہیں جو کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے کسی متبع کامل سے صادر ہو اور قانونِ عادت سے خارج ہو، پس اگر وہ امر خلافِ عادت نہ ہو تو کرامت نہیں ہے، اور جس شخص سے وہ امر صادر

ہوا ہے اگر وہ کسی نبی کا متبع اپنے کو نہیں کہتا وہ بھی کرامت نہیں ہے جیسے جوگیوں، ساحروں وغیرہم سے بعض امور ایسے سرزد ہو جاتے ہیں اور اگر وہ شخص مدعی اتباع کا تو ہے، مگر واقع میں متبع نہیں ہے خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو، جس طرح اہلِ بدعت یا فروع میں جیسے فاسق فاجر، اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو تو وہ بھی کرامت نہیں ہے، بلکہ استدراج ہے، جس کا ضرر یہ ہے کہ یہ شخص بوجہ خرقِ عادت کے اپنے کو کامل سمجھتا ہے اور اس دھوکہ میں کبھی حق کے طلب کرنے اور اتباع کرنے کی کوشش نہیں کرتا، نعوذ باللہ کس قدر خسرانِ عظیم ہے، پس کرامت اُس وقت کہلائے گی جبکہ اُس فعل کا صدور مؤمن متبعِ سنت کاملُ التقویٰ سے ہو۔

اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی فعل عجیب سرزد ہو جاتا ہے، اُس کو غوث، قطب قرار دیتے ہیں، خواہ اس شخص کے کیسے ہی عقائد ہوں اور کیسے ہی اعمال واخلاق ہوں؟ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا یا پانی پر چلتا ہو دیکھو، اگر شریعت کا پابند نہ ہو تو اس کو بالکل ہیچ سمجھو۔

اور جاننا چاہیے کہ کرامت کے لیے نہ اُس ولی کو اُس کا علم ہونا ضروری ہے، اور نہ اُس کے متعلق قصد کا متعلق ہونا ضروری ہے، اور احیاناً علم ہوتا ہے اور قصد نہیں ہوتا اور کبھی علم اور قصد دونوں امر ہوتے ہیں؛ اس بناء پر کرامت کی تین قسمیں ٹھہری۔

ایک قسم وہ جہاں علم بھی ہو اور قصد بھی ہو، جیسے نیل کا جاری ہونا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان مبارک سے۔

اور دوسری قسم وہ جہاں علم ہو اور قصد نہ ہو جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے فصل میووں کا آ جانا۔

تیسری قسم وہ جہاں نہ علم ہو نہ قصد جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دو چند اور سہ چند ہو جانا، چنانچہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ

عنہ کو تعجب ہوا، جس سے اُن کے علم اور قصد کا پہلے سے متعلق نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اور ایک احتمال حصرِ عقلی میں سے خلافِ واقع ہے کہ قصد ہو اور علم نہ ہو، کیونکہ بدون علم قصد ممکن نہیں اور لفظ تصرف و ہمت کا صرف قسمِ اول پر اطلاق کیا جاتا ہے، قسمِ ثانی وثالث کو تصرف نہیں کہتے البتہ برکت و کرامت کہلاتی ہیں۔

اور جاننا چاہیے کہ ایک اور اعتبار سے کرامت کی دو قسم ہیں، ایک حسی، ایک معنوی۔

عام لوگ اکثر حسی کو جانتے ہیں اور اسی کو کمال شمار کرتے ہیں جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہو جانا، پانی پر چلنا، ہوا پر اُڑنا وغیرہ۔

اور خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامتِ معنوی ہے یعنی شریعت پر مستقیم رہنا، مکارمِ اخلاق کا خوگر ہو جانا، نیک کاموں کا پابندی و بے تکلفی سے صادر ہونا، حسد و کینہ ودیگر صفاتِ مذمومہ سے قلب کا طاہر ہو جانا، کوئی سانس غفلت میں نہ گزرنا، یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال ہی نہیں بخلاف قسمِ اول کے کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے، اسی واسطے کاملین صدورِ کرامت کے وقت بہت ڈرتے ہیں کہ یہ استدراج نہ ہو یا خدانخواستہ اس سے نفس میں عُجب نہ پیدا ہو جائے یا اس کی وجہ سے عوام میں شہرت وامتیاز پیدا ہو کر موجبِ ہلاکت ہو، بلکہ بعض نے فرمایا ہے کہ بعض اولیاء نے مرتے وقت تمنا کی ہے کہ کاش دنیا میں ہماری کوئی کرامت صادر نہ ہوتی تاکہ اس کا عوض اور اجر بھی آخرت میں ملتا کیونکہ یہ امر مقرر ہے کہ جس قدر دنیا میں کسی نعمت میں کسی کو کمی رہے گی، اُس کا بدلہ آخرت میں عنایت ہوگا۔

اور جاننا چاہیے کہ بعض علماء نے کرامت کی قوت ایک حد خاص تک معین کی ہے اور جو امور نہایت عظیم ہیں، جیسے بدون والد کے اولاد پیدا ہونا، یا کسی جماد کا حیوان بن جانا، یا ملائکہ کا باتیں کرنا، اس کا صدور کرامت سے ممتنع قرار دیا ہے، مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں کیونکہ وہ فعل پیدا کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا ہے، صرف ولی کے ہاتھ پر اُس کا ظہور ہو گیا ہے، واسطے اظہارِ کرامت وقرب ومقبولیت اُس ولی کے۔

سو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جب کوئی حد نہیں، پھر کرامت محدود کیسے ہو سکتی ہے۔

رہا یہ شبہ کہ معجزہ کے ساتھ مساوات لازم آنے کا احتمال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جب صاحبِ کرامت خود کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام ہوں تو جو کچھ اُس سے ظاہر ہوا ہے یہ تبعیت اس نبی کے ہے، استقلالاً نہیں جو اس شبہ کی گنجائش ہو، البتہ جس خرقِ عادت کی نسبت نبی کا ارشاد ہو کہ اس کا صدور مطلقاً محال ہے، وہ بطورِ کرامت کے سرزد نہیں ہو سکتی، جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔

اور جاننا چاہیے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفاء واجب ہے، مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو یا غیب سے اذن ہو، یا حالت اس قدر غالب ہو کہ اُس میں قصد واختیار باقی نہ رہے، یا کسی طالبِ حق ومرید کے یقین کا قوی کرنا مقصود ہو، وہاں جائز ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ بعض اولیاءِ کاملین کا مقام غلبۂ عبودیت ورضا کا ہوتا ہے، اس لیے کسی شے میں وہ تصرف نہیں کرتے، اس وجہ سے اُن کی کرامتیں نہیں معلوم ہوتیں، اور بعضوں کو قوتِ تصرف ہی عنایت نہیں ہوتی، تسلیم وتفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کے لیے کرامت کا وجود یا ظہور ضروری نہیں، اور جاننا چاہیے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات اور خوارق سرزد ہوتے ہیں، اور یہ امر معنیً حدِ تواتر تک پہنچ گیا ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ کرامت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اسبابِ طبعیہ سے وہ اثر پیدا نہ ہوا ہو، خواہ وہ اسباب جلی ہوں یا خفی، اس مقام پر لوگوں کو دو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں، بعض تو مطلق عجیب امور کو کرامت سمجھتے ہیں، اور عامل کے معتقدِ کمال بن جاتے ہیں۔
آج کل اس قسم کے بہت قصے واقع ہو رہے ہیں، مسمریزم، فریمیسن، حاضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات ونقوش، طلسمات، وشعبدات، تاثیراتِ عجیبہ، ادویات، سحر، چشم بندی وغیرہ کہ اس میں بعض کے آثار تو محض خیالی ہیں اور بعض کے واقعی بھی ہوں، تو اسبابِ

طبعیہ خفیہ سے مربوط ہیں، کرامت ان سب خرافات سے منزہ ہے اور بعض کرامات کو بھی قوتِ طبعیہ پر محمول کر کے سب کو ایک لکڑی ہانکتے ہیں، صاحبِ بصیرت طالبِ حق کو قرائنِ قویہ سے بنظرِ انصاف فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں قوی طبعیہ کو دخل ہے، یا محض قوتِ قدسیہ ہے یا کسی قوت کو بھی دخل نہیں، محض کائن عن الغیب ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ جس فعل کا ظاہری قویٰ سے کرنا ممنوع ہے (باطنی قویٰ سے بھی ممنوع ہے) جیسے کسی بے گناہ کو قتل کرنا یا کسی کے قلب پر زور ڈال کر اُس سے کچھ روپیہ لے لینا ، یا کسی کا راز پنہانی معلوم کرنا یا قصداً نامحرم کی طرف التفات کرنا، بعض لوگ مطلقاً خرقِ عادت کو شعبہ ولایت کا سمجھ کر ان سب تصرفات کو حلال اور داخلِ کرامت سمجھتے ہیں۔

اور جاننا چاہیے کہ ولی سے احیاناً کوئی امر ناجائز صادر ہو جانا بشرطیکہ اُس پر اصرار نہ ہو اور تنبیہ کے وقت توبہ کرنے یا کسی اختلافی مسئلہ میں غلط شق کو اختیار کرنا ولایت وکرامت میں قادح نہیں۔ یہ کُل دس مسئلے اس باب کے متعلق ہیں (بوادرُ النوادر صفحہ ۷۸ تا ۸۰، وبصائرِ حکیم الامت صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۲)

تشریعی وتکوینی اولیائے کرام کا وجود برحق ہے

تکوینی نظام اور اصحابِ تکوین کے ثبوت کی سب سے بڑی دلیل تو واقعۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام ہے، جس پر تفصیلی کلام اس مضمون کے شروع میں کر دیا گیا ہے، اس کے علاوہ متعدد احادیث وروایات اور آثار سے بھی ان مقدس ہستیوں کے وجود کا ثبوت ہوتا ہے۔

ابدال کے بارے میں امام سخاوی رحمہ اللہ نے ''مقاصد حسنہ'' میں اور شیخ اسماعیل بن محمد عجلونی نے اپنی کتاب ''کشف الخفاء ومزیل الالباس'' میں طویل کلام کیا ہے۔

اور فرمایا کہ ابدال کے بارے میں مختلف طرق سے احادیث وارد ہیں، اگرچہ الگ الگ سنداً ضعیف ہی کیوں نہ ہوں، اس لئے وہ تمام احادیث مل کر قوی بن جاتی ہیں۔

اسی طرح امام سیوطی رحمہ اللہ نے اللآلی المصنوعہ میں مبسوط بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں ایک مستقل

رسالہ بھی اس موضوع پر لکھا ہے جو ان کے فتاویٰ ’’الحاوی للفتاویٰ‘‘ میں شامل ہے۔اس لئے جن لوگوں نے اس سلسلہ کی روایتوں کو سرے سے باطل قرار دے دیا ہے۔ان کا قول صحت سے بعید ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ہے ’’**الخبر الدال علیٰ وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال**‘‘ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اس رسالہ میں اولیائے کرام کی ان اقسام کا انکار کرنے والوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبعد: فقد بلغنی عن بعض من لا علم عنده انکار مااشتهر عن السادة الاولیاء من ان منهم ابدالاً ونقباء ونجباء واوتاداواقطابا،وقد وردت الاحادیث والاثار باثبات ذلک فجمعتها فی هذا الجزء لتستفادولایعول علی انکار اهل العناد وسمیته''الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال'' والله الموفق.

فاقول: ورد فی ذلک مرفوعا وموقوفا من حدیث عمر بن الخطاب ، وعلی بن ابی طالب،وانس،وحذیفةبن الیمان،وعبادة بن صامت،وابن عباس وعبدالله بن عمر ،وعبدالله بن مسعود،وعوف بن مالک،ومعاذبن جبل،وواثلة بن الاسقع ، وابی سعید بن الخدری،وابی هریرة ،وابی الدرداء،وام سلمةرضی الله تعالیٰ عنهم،ومن مرسل الحسن وعطاء وبکر بن خنیس،ومن الاثار عن التابعین ومن بعدهم مالایحصی

(الحاوی للفتاویٰ ج۲ ص ۲۹۱ و ۲۹۲)

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے بعض لاعلم لوگوں کے بارے میں کہ وہ اکابر اولیاء میں سے مشاہیر کے حق میں اس چیز کا انکار کرتے ہیں کہ ان میں سے ابدال، نقباء، نجباء، اوتاد اور اقطاب ہوا کرتے ہیں (جو کہ اولیاء میں سے اصحابِ تکوین کے مختلف مقامات کے اصطلاحی نام ہیں) حالانکہ احادیث وآثار اس امر کے ثبوت میں

وارد ہو چکے ہیں، چنانچہ میں نے اس مجموعہ میں ان احادیث و آثار کو یکجا و جمع کر دیا تا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکے اور اہلِ عناد (ہٹ دھرم مدعیانِ علم) کے انکار کی طرف میلان ورجحان نہ کیا جائے اور میں نے اس کو موسوم کیا ہے "**الخبر الدال علی وجود القطب والاتاد والنجباء والابدال**" کے نام سے اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

پس عرض ہے کہ اس بارے میں حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی، حضرت انس، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت عبادہ بن صامت، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عوف بن مالک، حضرت معاذ بن جبل، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت ابوسعید الخدری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو درداء، حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہم سے موقوف ومرفوع دونوں طرح کی احادیث وارد ہوچکی ہیں، نیز حضرت حسن بصری، حضرت عطاء، حضرت بکر بن خنیس اور دیگر تابعین اوران کے بعد بزرگوں کے اتنے آثار موجود ہیں جو حد وشمار سے باہر ہیں (الحاوی للفتاویٰ ج۲ ص۲۹۱، ۲۹۲)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے مذکورہ رسالہ میں منکرین پر رد کرنے کے لئے چند روایات تحریر فرمائی ہیں، جو یہاں مع ترجمہ نقل کی جاتی ہیں:

(۱)...... **عن علی سألت رسول اللہ ﷺ عن الابدال؟ قال :"هم ستون رجلاً فقلت یارسول اللہ حلهم لی قال لیسوا بالمتنطعین ولا بالمبتدعین ولا بالمتعمقین لم ینالوا ما نالوا بکثرة صلاة ولا صیام ولا صدقة ولکن بسخاء الأنفس وسلامة القلوب والنصیحة لأئمتهم "** (اخرجه الخلال فی کرامات الاولیاء)(الحاوی للفتاویٰ ج۲ ص ۲۹۳)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے ابدال کے متعلق پوچھا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ ستر آدمی ہیں، میں نے عرض کیا کہ مجھے

کچھ ان کی پہچان بتائیں ،فرمایا وہ نہ طعنہ دینے والے، نہ بدعات کا ارتکاب کرنے والے ہوں گے، نہ زیادہ باریکیوں میں پڑیں گے،لوگ ان کوزیادہ نماز، روزہ،صدقہ جیسے بزرگی کی عام علامات سے نہ پاسکیں گےلیکن ان کی علامات جود وسخا نفس (جوکہ ایک اعلیٰ درجے کی باطنی استعداد ہے)اور سلیم القلب ہونااور اپنے امراء (ائمہٗ وقت) کے لئے خیر خواہ ہونا ہے (اس کو خلال نے کراماتُ الاولیاء میں روایت کیا ہے)

(۲)......**عن علی بن ابی طالب ان رسول اللہ ﷺ قال:"لاتسبوا اھل الشام فان فیھم الأبدال "** (قال الطبرانی :لم یرو ھذا الحدیث الا زید بن ابی الزرقاء،قال ابن عساکر :ھذا وھم من الطبرانی بل رواہ الولید بن مسلم ایضاً عن ابن لھیعة)(الحاوی للفتاویٰ ج۲ص ۲۹۳)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اہلِ شام کوگالی مت دو (بُرا بھلا نہ کہو)اس لئے کہ ان میں ابدال ہیں (طبرانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صرف زید بن ابی زرقاء نے روایت کی ہے،ابنِ عساکرفرماتے ہیں، کہ یہ طبرانی کا وہم ہے بلکہ یہ حدیث ولید بن مسلم نے بھی ابن لھیعہ سے روایت کی ہے)

(۳)......**علی بن ابی طالب یقول لا تسبوا اھل الشام فان فیھم الابدال وسبوا ظلمتھم** (اخرجہ الحاکم فی المستدرک من طریق احمد بن الحارث بن زید بہ وقال صحیح واقرہ الذھبی فی مختصرہ)(الحاوی للفتاویٰ ج۲ص ۲۹۳)

ترجمہ: حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ شام کو بُرا بھلامت کہو اس لئے کہ ان میں ابدال ہیں،البتہ ان کے ظالموں کی مذمت اور برائی کا ذکر کرسکتے ہو (حاکم نے مستدرک میں احمد بن حارث کے طریق سے اس حدیث کی تخریج کی ہےاور فرمایا ہے کہ یہ صحیح ہے،اورذہبی نے بھی اپنی ''مختصر'' میں اس کا اقرار کیا ہے)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے اس رسالہ میں تکوینی اولیائے کرام کے منکرین پرَرد کرتے ہوئے درجِ ذیل اشعار بھی نقل فرمائے ہیں:

عاب قوم علم الحديث وقالوا   هو علم طلابه جهال
عدلوا عن محجة العلم لما   دق عنهم فهم العلوم وقالوا
انما الشرع یاأخیّ کتٰب اللہ   لاهو ـةبه ولا أشكال
ثم من بعده حديث رسول اللہ   فاض يقضى اليه المآل
وطريق الآثار تعرف بالنقل   وللنقل فاعلمنه رجال
همهم نقله ونفى الذى قد   وضعته عصابة ضلال
وقضوا لذة الحياة اغتباطاً   بالذى حرروه منه وقالوا
ورضوه من كل شيئ بديلا   فلعمرى لنعم ذاک البدال
ولقد جاء نا عن السيد الما   جد حلف العلياء فيهم مقال
احمد المتنمى الى حنبل أكـ   ـرم به فيه مفخر وجمال
ان أبدال أمة المصطفى احمد   هم حين تذكر الأبدال

(الحاوی للفتاویٰ ج۲ ص۳۰۶)

﴿ترجمۂ اشعار﴾

(۱) کچھ لوگوں نے علمِ حدیث کی طرف عیب منسوب کیا اور کہا کہ اس علم کے طلب گار جاہل ہیں۔

(۲) اعراض کیا انہوں نے حجیتِ علم سے جب شاق ہوا ان پر معلوم کا سمجھنا اور کہنے لگے۔

(۳) بے شک اے بھائی دین وشریعت تو بس اللہ کی کتاب ہے کہ جس میں نہ کوئی ھویٰ اور نہ کوئی اشکال ہے۔

(۴) پھر اس کے بعد اللہ کے رسول کی حدیث ہے جو ایسا قاضی ہے کہ مآل وانجام کا (پہلے ہی) فیصلہ دیدیتی ہے۔

(۵) اور آثار وروایات کے طریقے نقل سے جانے جاتے ہیں اور نقل کے لئے تو بتاکید جان رکھ! رجال کارہوتے ہیں۔

(۶) ان کی ساری توجہ اور فکر اس کے نقل کے لئے ہوتی ہے اور مٹادیں انہوں نے وہ موضوع احادیث جو گمراہ گروہوں نے گھڑی تھیں۔

(۷) پوری کرلی انہوں نے زندگانی کی لذت رشک کرتے ہوئے اس پر جو انہوں نے اس (علمِ حدیث) میں سے تحریر کیا۔

(۸) اور اس کے بدلے میں یہ ہر چیز چھوڑنے پر راضی ہوگئے میری زندگی کی قسم کیا ہی بہترین ان کا یہ تبادلہ ہے۔

(۹) اور آچکی خبر ہمارے پاس بزرگی والے سردار کی طرف سے جس نے مراتبِ عالیہ کو پیچھے چھوڑ دیا کہ ان احادیث میں کلام ہے۔

(۱۰) (وہ سردار) احمد منسوب بہ حنبلؒ ہیں جن کا مرتبہ اونچا ہے اس علم میں اور یہی ان کے لئے مقامِ فخر و جمال ہے۔

(۱۱) (فرمایا انہوں نے) کہ امتِ محمدیہ حضرت محمد ﷺ کے ابدال ہیں لوگوں نے جب ان کے سامنے ابدال کا ذکر کیا (اشعار کا ترجمہ ختم ہوا)

مسلمانوں کی بے حسی

جو سب سے بڑی مصیبت ہے وہ یہ کہ کسی برائی کو برائی، کسی گناہ کو گناہ، کسی حرام شے کو حرام سمجھا ہی نہیں جاتا، احقر کو حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ الفاظ آج بھی یاد ہیں، فرماتے تھے کہ: ''بھئی اب تم ٹی وی دیکھنا، فلمیں دیکھنا، وی سی آر چلانا، ان باتوں سے رکو گے تو نہیں، تمام رسوماتِ قبیحہ اسی طرح کرتے رہوگے، آج کل حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ ان چیزوں سے لوگوں کو روکنا محال ہوگیا ہے، اب رونا اس بات کا ہے کہ خدا کے لئے ان چیزوں کو حرام تو سمجھو، ان افعال کو گناہ تو سمجھو، ان پر فخر تو مت کرو، آج کل تو فخریہ انداز میں ان باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے کہ میرے پاس ٹی۔وی، وی۔سی۔آر، ویڈیو کیمرہ وغیرہ ہے، ارے ان کو گناہ تو سمجھو، گناہ سمجھ کر ان کاموں کو کرو، ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ ایمان سے محروم ہوجاؤ گے (شامتِ اعمال صفحہ نمبر ۸، تالیف: عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ تنویر احمد خان صاحب مدظلہم)

تشریعی وتکوینی نظام پر علامہ شامی رحمہ اللہ کا رسالہ

(مکمل اردو ترجمہ)

علامہ ابنِ عابدین شامی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ بنام ''اجابة الغوث ببيان حال النقباء والنجباء والابدال والاوتاد والغوث'' تحریر فرمایا ہے، جو اِن کے مجموعہ رسائل ابنِ عابدین ج ۲ کا حصہ ہے، یہاں افادۂ عام کے لئے اس رسالہ کا مکمل ترجمہ تحریر کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذى شرف هذه الامة المحمدية بانواع التشريف، وشرع لها شرعا رضينا وحكما مبينا وكلفها باسهل تكليف، وجعل منهاعباداعبادا بادروا الى امتثال اوامره واجتناب نواهيه حتى اماتوا انفسهم واغرقوها فى بحار حياة التوحيد والتنزيهه، وجعل منها اوتادا ونقباء واقطابا وابدالا واخياراواوتادا وانجابا، فرحم بهم عباده الضعفا، والبس بعضهم جلباب الستر والخفا، وجردهم عن الكدورات البشرية واغرقهم فى بحار الاحدية واشهدهم اسراراسمائه وصفاته، وجعل قلوبهم مشكاة لاشعة تجلياته، والصلاة والسلام على من الكل مقتبس من نبراس انواره وملتمس من فيض عرفانه واسراره ومغترف من بحار شرعه وهداه، ومقتطف من ثمار جوده وجدواه، وعلى اله واصحابه الذين لهم الغايةالقصوى فى هذا الشان، والخبول المضمرة بين الفرسان فى السابق الى هذا الميدان.

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، جس نے اس امتِ محمدیہ کو مختلف انواع کی شرافتوں اور خوبیوں سے سرفراز فرمایا، اور جس نے اس امت کے لئے مضبوط شریعت اور واضح احکامات مقرر فرمائے، اور جن احکامات کا اس امت کو مکلّف اور ذمہ دار

بنایا اس میں سہولتیں رکھیں، اور پھر اس امت میں ایسے ایسے بندے پیدا فرمائے جنہوں نے حق تعالیٰ شانہٗ کے اوامر کی بجا آوری اور ممنوعات سے اجتناب میں نہ صرف یہ کہ سبقت کی بلکہ اپنے آپ کو حیاتِ توحیدی اور تنزیہی کے سمندروں میں فنا کر دیا اور اپنے نفوس کو مردہ کر دیا، پھر اس امت میں سے بعض کو اوتاد بنایا اور بعض کو نقباء اور بعض کو اقطاب بنایا، اور بعض کو ابدال، اور بعض کو اخیار میں سے بنایا اور بعض کو اوتاد اور نجباء بنایا، پھر ان باکمال بندوں کو ذریعہ بنا کر ضعفاء پر رحم فرمایا، اور بعض بندے ایسے بھی بنائے جن پر ستاری کی چادر اوڑھا دی (یعنی ان کو مکتومین میں سے بنایا) اور ان کو کدوراتِ بشریہ سے پاک صاف کیا، اور ان کو وحدانیت وتوحید کے سمندروں کا غوطہ ور بنایا، اور ان پر اپنے اسماء وصفات کے رازہائے سربستہ منکشف فرمائے، اور ان کے دلوں کو اپنی تجلیات کی شعاعوں کا مشکاۃ (چراغ) بنایا۔

اور صلاۃ وسلام ہو اس ذات پر جس کے انوار کی شعاعوں سے سب ہی روشنی حاصل کرنے والے ہیں، اور جس کے اسرار ومعرفت کے فیوض سے مستفید ہونے کے لئے ساری مخلوق طلبگار رہے، اور جس کی ہدایت وشریعتِ مبارکہ کے دریاؤں سے سب چلّو بھرنے والے ہیں، اور جس کے باغہائے جود وکرم سے سب ہی خوشہ چین ہیں، اور اس کی آل واصحاب پر بھی صلاۃ وسلام نازل ہو جن کو مشکاۃِ نبوت سے اکتسابِ فیض میں سب سے بڑی شان حاصل ہے، اور جو اس میدانِ مقابلہ کے درجہ اول کے چھپے رستم ہیں۔

امابعد! یہ بندہ جو گناہوں کے مرض کا قیدی اور اس پروردگار کی صفتِ عفو ودرگزر سے پُر امید ہے جس کا نام محمد امین ہے اور جو کہ ابنِ عابدین کی کنیت سے مشہور ہے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمائے اور اس کے عیوب پر پردہ ڈالے، عرض گزار ہے کہ میں نے بعض معزز حضرات کی خواہش پر ایک رسالہ کی تالیف کا کام شروع کیا، جو رسالہ ”قطب“ کے بارے میں ہے، جو ہر زمانہ اور ہر وقت میں پائے جاتے ہیں اور

اس میں میں نے ابدال، نقیبوں اور نجیبوں کے بیان کا وعدہ کیا تھا اور میں نے اس رسالہ کو مرتب کرنے کی طرف جلدی کی، ان بلند ہستیوں کی طرف سے اجازت لینے کے بعد اور ان پاکیزہ ارواح کو ایصالِ ثواب کرنے کے بعد۔

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خوشبوؤں کے ساتھ معطر فرمائیں گے اور ہم پر ان کی عظیم برکات کا فیض فرمائیں گے۔

میں نے اس رسالہ میں ہر اس بات کو جمع کیا ہے جس پر میں معتبر ائمہ کرام کے کلام میں سے مطلع ہوا ہوں، اور اس پر میں نے دسترس حاصل کرنے کے لئے منجھے ہوئے حضرات کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

جو رسالہ میں نے تالیف کیا ہے اسے میں نے چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا ہے اور اس کا نام "**اجابة الغوث ببيان حال النقبا والنجبا والابدال والاوتاد والغوث**" رکھا ہے، میں نے ان بزرگ ہستیوں کے لئے ایک نسخہ لکھا، اور ان کی طرف روانہ کر دیا، پھر میں نے ایسی چیزیں جو اس مقام کے موزوں تھیں اور اہلِ فہم ان کے ذکر کو مستحسن سمجھتے ہیں بیمار کی شفاء طلب کرنے کی خاطر، ان کا الحاق اس رسالہ کے ساتھ پسند کیا، اور اس رسالہ کا نام اور ترتیب باقی رہنے دی البتہ تھوڑی بہت تبدیلی کی ہے اور میں نے مدد طلب کی پروردگار سے جو قریب اور مجیب الدعوات ہے۔

پہلا باب (اقطاب، ابدال، اوتاد، نجباء اور نقباء کے بارے میں)

پہلا باب اقطاب، ابدال، اوتاد، نجباء، اور نقباء کے بیان اور ان کی صفات اور ان کی تعداد اور ان کی رہائش گاہوں کے بارے میں ہے۔

(۱)......اقطاب

اقطاب قطب کی جمع ہے، جیسے اقفال قفل کی جمع ہے اور صوفیاء کی اصطلاح میں باطنی خلیفہ کو قطب کہا جاتا ہے اور وہ اپنے اہلِ زمانہ کا سردار ہوتا ہے اور اسے "قطب" اس

لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ذات تمام مقامات واحوال کی حامل اور جامع ہوتی ہے اور تمام مقامات واحوال اس کے ارد گرد گھومتے ہیں اور ''قطب'' عربی میں، **قطب الرحی الحدیدۃ التی تدور علیھا** (یعنی لوہے کی چکی کے درمیان میں جو محور یا کیل ہوتی ہے جس کے اطراف پر چکی کے پاٹ گھومتے رہتے ہیں) کو کہتے ہیں، یہ اس سے ماخوذ ہے۔

شیخ شرف الدین عمر بن الفارض رحمہ اللہ کے رسالہ تائیہ کی شرح جو شیخ عبدالرزاق قاشانی رحمہ اللہ نے کی ہے اس میں ہے کہ:

قطب قوم کی اصطلاح میں کامل ترین انسان کو کہتے ہیں جو فردیہ کے مقام پر فائز ہوں اس پر مخلوق کے احوال گردش کرتے ہوں۔

اور وہ قطب یا تو صرف ''عالَمِ شہادۃ'' میں بسنے والی مخلوقات کا قطب ہوتا ہے، اور اس کی وفات کے وقت ''ابدال'' میں سے جو ''قطب'' کے مرتبہ کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ بدل اس کا خلیفہ بنتا ہے پس اس وقت وہ اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور وہ بدل، ابدال میں سب سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔

اور یا وہ قطب عالَمِ غیب اور عالَمِ شہادۃ (دونوں عالموں) میں بسنے والی تمام مخلوقات کا قطب ہوتا ہے جس کا ابدال میں سے کوئی خلیفہ نہیں بنتا، اور اس کا مخلوق میں سے کوئی قائم مقام نہیں ہوتا، اور وہ یکے بعد دیگرے آنے والے ''عالم شہادۃ'' کے قطبوں کا قطب ہے نہ اس سے پہلے کوئی قطب آیا ہے، اور نہ اس کے بعد کوئی قطب آئے گا، اس قطب الاقطاب سے پہلے کوئی قطب نہیں ہوتا اور نہ اس کی جگہ اس کے بعد کوئی قطب ہوگا، اور یہ قطب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی روحِ مبارک ہے جس کی شان یہ ہے کہ ''**لَوْلاَکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلاَکَ** ''یعنی اس کامل مقام پر آپ کا کوئی خلیفہ نہیں ہوسکتا، اگرچہ اس مقام سے نیچے درجے کا خلیفہ ہوسکتا ہے جیسے کہ خلفاءِ راشدین کے نیچے کے درجہ کے اعتبار سے خلیفہ ہونے میں کوئی ٹکراؤ نہیں (یعنی آپ ﷺ کے

اس مقامِ قطبیت پر اس سے کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ آپ کی قطبیت اس مرتبہ کی ہے جو خلفائے راشدین کے درجہ سے بہت اعلیٰ وافضل ہے) جیسا کہ ابھی ذکر آتا ہے۔

اور عارف باللہ سید محی الدین ابنِ عربی نے اپنی بعض تصانیف میں فرمایا کہ یہ بات یاد رکھو کہ قطب کا لفظ استعمال کرنے میں کبھی توسع سے کام لیا جاتا ہے، اس طرح کہ ہر وہ شخص جس پر مقامات میں سے کوئی مقام گردش کر جائے وہ قطب کہلاتا ہے، اور وہ اپنے زمانے کے ہم جنسوں پر منفرد وممتاز ہوتا ہے، اور کبھی ایک شہر کے اعتبار سے بھی آدمی کو اُس شہر کا قطب کہا جاتا ہے اور کبھی جماعت کے اعتبار سے بھی شیخ الجماعت کو بھی قطب الجماعت کہا جاتا ہے، لیکن اقطاب اصطلاح کے اعتبار سے جبکہ اس کی اضافت کسی اور چیز کی طرف نہ کی جائے اور مطلق بولا جائے وہ ایک ہی ہوتا ہے، اور وہی غوث بھی کہلاتا ہے، اور وہ اپنے زمانے کا سیدُ الجماعت ہوتا ہے، اور ان میں سے بعض قطب خلافتِ باطنی کے ساتھ خلافتِ ظاہری کے بھی جامع ہوتے ہیں، اور خلافتِ باطنی کے ساتھ خلافتِ ظاہرہ کا پایا جانا بھی ممکن ہے جس طرح کہ خلافتِ باطنی ممکن ہے، جیسا کہ خلفائے راشدین حضرت ابوبکر، عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم ہیں، کہ وہ خلافتِ باطنی کے ساتھ خلافتِ ظاہری کے بھی حامل تھے۔

کچھ قطب ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف خلافتِ باطنی کے حامل ہوتے ہیں جیسے کہ اکثر اقطاب ہوتے ہیں (کہ صرف خلافتِ باطنی کے حامل ہوتے ہیں)

اور ابنِ حجر کے فتاویٰ حدیثیہ (جدید فتاویٰ) میں ہے کہ:

’’یہ رجالُ الغیب ہوتے ہیں ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ انہیں نہیں جانتے ،اس کا سردار ایسی قطب وغوث جامع شخصیت ہوتی ہے جسے چاروں آفاق میں گردش کرنے والا بنا دیا جاتا ہے، اور وہ دنیا کے ارکان (ستون) ہیں جس طرح سیارہ آسمان کے افق میں گردش کرتا ہے، اور ان کے احوال کو اللہ تعالیٰ خواص اور عوام سے پوشیدہ رکھتا ہے، ہاں اس کی یہ عجیب بات ہوتی ہے کہ وہ عالم کو جاہل، بے

وقوف کو سمجھدار اور اسباب چھوڑنے والے کو اسباب اختیار کرنے والا اور دور کو نزدیک اور نرم طبیعت والے کو سخت اور پُر امن کو پُر خطر نظر آتا اور محسوس ہوتا ہے، اور اس کا مقام اولیائے کرام میں ایسا ہوتا ہے جیسے نقطہ دائرہ کے لئے ہوتا ہے، وہ سب کا مرکز ہوتا ہے، اسی سے سارے عالم کی اصلاح کا تعلق ہوتا ہے (انتہیٰ)

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''**المعدن العدني في اويس القرني**'' میں فرماتے ہیں کہ ''میرا گمان یہ ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ابدال کے قطب یعنی قطب الابدال حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ تھے (انتہیٰ)''

اور شیخ المشائخ شہاب احمد المنینی ''الخصائص النبویۃ'' کی منظوم شرح میں فرماتے ہیں کہ: صوفیاء میں سے ''علامہ تونسی رحمہ اللہ'' کی تحقیق یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد سب سے پہلے جو قطب بنا وہ آپ کی صاجزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں، علامہ شیخ شہاب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے لئے سلف میں (کوئی تائید) نہیں دیکھی البتہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد سب سے پہلے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ قطب بنے ہیں۔

اور جب قطب کا انتقال ہو جاتا ہے، تو دو اماموں میں سے کوئی ایک امام اس کی جگہ خلیفہ بنتا ہے، کیونکہ یہ دو امام دو وزیروں کے قائم مقام ہوتے ہیں، ایک ان میں سے عالمِ ملکوت کے مشاہدہ تک محدود ہوتا ہے، اور دوسرا عالَم ملک کے مشاہدہ پر، اور جس امام کی نظر عالَم ملکوت پر ہوتی ہے وہ دوسرے امام سے زیادہ بلند مقام ومرتبہ پر ہوتا ہے (انتہیٰ)

(۲)......ابدال

ابدال ہمزہ کے زبر کے ساتھ جمع بدل کی ہے، انہیں ابدال اس وجہ سے بولا جاتا ہے کہ حدیث میں مذکور ہے کہ ''كُلَّمَامَاتَ رَجُلٌ اَبْدَلَ اللهُ مَكَانَهُ رَجُلاً'' ترجمہ: ''جب

کسی مرد (صالح) کا انتقال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے مرد (صالح) کو بدلے میں مقرر فرما دیتے ہیں' اور انہیں اس وجہ سے بھی بدل کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے برے اخلاق بدل دیئے ہیں اور اپنے نفوس کو پسند کے موافق بنالیا، یہاں تک کہ ان کے اخلاقِ حسنہ ان کے اعمال کی زینت بن چکے ہیں اور یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ انبیاء کے خلیفہ ہیں جیسا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے کلام میں عنقریب آتا ہے، یا اس وجہ سے (بھی انہیں بدل کہا جاتا ہے) جو حضرت علامہ شیخ شہاب المنینی نے عارف باللہ ابنِ عربی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''جب کوئی بدل ایک جگہ سے چلا جاتا ہے تو وہاں اپنی جگہ ایک حقیقتِ روحانیہ کو چھوڑ جاتا ہے، اور اس علاقہ والوں کی ارواح اس کے پاس اس علاقہ میں جمع ہوتی ہیں جہاں سے یہ ولی کوچ کر گیا ہے، پس اگر اس علاقہ کے لوگوں کا اس (غائب) شخص کی طرف اشتیاق بڑھ جائے تو یہ حقیقتِ روحانیہ جسے یہ شخص اس علاقہ میں اپنے بدل کے طور پر چھوڑ گیا تھا، وہ ان سے باتیں کرتی ہیں اور وہ اس سے باتیں کرتے ہیں، حالانکہ وہ ولی وہاں سے غائب ہوتا ہے اور کبھی یہ صورت بدل کے علاوہ دوسرے کے ساتھ بھی ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ بدل جب کوچ کرتا ہے تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر جارہا ہوں، لیکن غیر بدل کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر جارہا ہوں یا نہیں، اگرچہ وہ اپنا قائم مقام چھوڑ جاتا ہے، انتہیٰ''

علامہ قاشانی رحمہ اللہ کی کتاب شرح التائیہ میں یہ ہے کہ:

ابدال سے مراد اہلِ محبت، اور اہلِ کشف اور اہلِ مشاہدہ اور حضور ﷺ کی ایک جماعت

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ابدال'' بدل کی جمع ہے ابدال اولیائے کرام کی اس جماعت کو کہتے ہیں جن کا بدل اللہ تعالیٰ پیدا کرتا رہتا ہے۔ دنیا ان کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوتی۔ ایک کی وفات ہوتی ہے اور دوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے۔ تبادلہ کے اسی غیر منقطع سلسلہ کی بناء پر انہیں ابدال کہا جاتا ہے۔

کفایۃ المعتقد للیافعی میں ہے کہ ابدال کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب ان ہی کا کوئی چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ ایک روحانی ہستی لے لیتی ہے (الحاوی للفتاویٰ ج۲ ص۲۹۱و۲۹۲)

ہے، جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی تابعداری کی طرف بلاتی ہیں، ان کے وجود کی وجہ سے بندوں اور شہروں کا وجود ہے اور ان کی وجہ سے مصیبت اور فساد کو لوگوں سے ٹال دیا جاتا ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میرے بندے پر میرے ساتھ مشغولیت غالب ہو جاتی ہے تو میں اپنے ذکر میں اس کا فکر اور لذت پیدا کرتا ہوں اور جب میں اس کا فکر اور لذت اپنے فکر میں کرتا ہوں تو وہ مجھ سے محبت کرنے لگتا ہے اور میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور اپنے اور اس کے درمیان حائل پردہ اٹھا دیتا ہوں اور جب لوگ مجھ سے غافل ہوتے ہیں تو یہ غافل نہیں ہوتا، ان کا کلام انبیاء کے کلام کی طرح ہوتا ہے، اور یہی لوگ سچے ابدال ہیں، یہ ایسے افراد ہیں کہ جب میں زمین والوں کو سزا یا عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں تو میں انہیں اس میں یاد کرتا ہوں پھر ان کی وجہ سے دوسروں سے عذاب پھیر دیتا ہوں“ اور ابدال کل چالیس مرد ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کا مخصوص مرتبہ ہوتا ہے، پہلے درجہ کے ابدال صالحین کے سب سے اونچے مرتبہ پر ہوتے ہیں اور ابدال کا سب سے اونچا مرتبہ قطب کے ابتدائی مرتبہ کے موافق ہوتا ہے، جب بھی ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اس کا بدل اس شخص کو بناتے ہیں جو اس کے ماتحتوں میں سے اس (مرحوم) بدل کے قریب ہوتا ہے، اور تبدیلی تمام ماتحت ابدال میں ظاہر ہوتی ہے ہر ماتحت بدل ایک مرتبہ اوپر ترقی کرتا ہے، اس وقت ابدال کے ابتدائی درجہ میں صالحین کا سب سے اونچے مرتبہ والا داخل ہوتا ہے اور وہ ابدال کے درجے میں داخل کر دیا جاتا ہے“

اور ان کی یہ تعداد ہمیشہ کامل رہتی ہے، یہاں تک کہ جب قیامت آنی ہوگی تو سب کو وفات دے دی جائے گی، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے (انتہیٰ)

اور امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب احیاء علوم الدین میں کتاب ذم الکبر والعجب میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک کلام منقول ہے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ

عنہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہوتے ہیں جن کو ابدال کہا جاتا ہے جو انبیاء کے خلیفہ ہوتے ہیں، یہی زمین کے اوتاد ہوتے ہیں، جب نبوۃ کا سلسلہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر منتہی ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے امتِ محمد ﷺ میں سے ایک قوم کو ان کی بدل پر رکھ دیا، وہ اور لوگوں سے کثرتِ صوم اور صلاۃ یا شکل وصورت کے اعتبار سے خاص امتیاز نہیں رکھتے، ہاں! کمالِ ورع اور حسنِ نیت اور تمام مسلمانوں سے اپنے دل کو صاف رکھنے اور تمام مسلمانوں کے ساتھ نصیحت وخیر خواہی میں مضبوط تر اور انتہائی تواضع میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، یہ ایسی قوم ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے خالص فرما لیا اور انہیں چن لیا ہے، اور وہ چالیس صدیق ہوتے ہیں جن میں سے تیس مرد ہوتے ہیں، ان کے دلوں میں ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام جیسا یقین ہوتا ہے، ان میں سے کوئی اس وقت تک انتقال نہیں کرتا جب تک اللہ تعالیٰ اس کا خلیفہ پیدا نہیں فرما دیتا، اور میرے بھائی یہ یاد رکھو کہ وہ کسی پر لعنت نہیں کرتے کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتے، کسی کی تحقیر نہیں کرتے، کسی پر بڑائی نہیں جتاتے، کسی سے حسد نہیں کرتے، کسی کی دنیا پر حرص نہیں کرتے، خیر کے معاملہ میں سب سے اچھے اور سب سے نرم خو اور طبیعت کے وہ سخی ہوتے ہیں، ان کی علامت سخاوت ہے اور ان کی خصلت میں بشاشت ہوتی ہے اور ان کی صفت سلامتی ہے، آج خشیت کل غفلت والی کیفیت میں نہیں ہوتے، اپنی ظاہری حالت میں یکساں ہوتے ہیں، اپنے اور اپنے رب کے درمیان مگن رہتے ہیں، تند وتیز ہوائیں اور تیز رفتار گھوڑے ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ان کے قلوب اللہ رب العزت کے شوقِ لقاء میں اڑتے ہیں اور سابق بالخیرات رہتے ہیں" اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ. اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "(یہی ہیں حزب اللہ اور سن لو حزب اللہ ہی کامیاب ہونگے) راوی کہتے ہیں کہ میں نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے عرض کیا میں نے آج تک اس طرح کا بیان آپ سے نہیں سنا تھا، مجھ سے ارشاد فرمایئے کہ میں کیسے ان تک پہنچ سکتا ہوں، فرمایا

تمہارے اور ان حالات والوں میں کافی مسافت ہے، البتہ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم دنیا سے نفرت کرنے لگو جب دنیا سے نفرت کرو گے تو آخرت کی طرف یقیناً رغبت کرو گے اور پھر آخرت کی محبت کی بقدر دنیا سے زہد اختیار کرو گے، اور پھر اسی کی بقدر تم خود ہی دیکھو گے وہ چیز جو تمہیں نفع دے گی، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی حسنِ طلب کو دیکھتے ہیں تو اس پر مراد کی بارش فرما دیتے ہیں اور اس کو اپنی حفاظت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں اور بھتیجے! اس بات کو یاد رکھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب میں ہے ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ '' (بے شک اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو نیکوکار ہیں)
یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہم نے اس بات میں غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ اللہ کی محبت اور اس کی رضا حاصل کرنے میں جو لذت ہے وہ لذت کسی میں نہیں ہے (انتہیٰ)

فائدہ (ابدال کے لیے چار مجاہدات)

عارف باللہ حضرت ابنِ عربی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''حلیۃ الابدال'' میں فرماتے ہیں کہ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ میں ایک رات اپنے مصلے پر بیٹھا تھا اور میں نے اپنا وظیفہ مکمل کر لیا تھا اور اپنا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھے ہوئے ذکر میں مشغول تھا، اچانک میں نے ایک شخص کی آہٹ محسوس کی اس نے میرے نیچے سے مصلیٰ کھینچا اور اس کو بچھا کر بیٹھ گیا یا یوں فرمایا کہ وہ نماز پڑھنے لگا اور حال یہ تھا کہ میرا دروازہ بند تھا، مجھے بڑی گھبراہٹ ہوئی تو مجھ سے کہنے لگا کہ جو اللہ تعالیٰ سے اُنس حاصل کرنا چاہتا ہے وہ گھبرایا نہیں کرتا، پھر میں نے آواز نکالنے کی ہمت کی، میں نے عرض کیا اے میرے سردار! ابدال کس چیز سے ابدال بنا کرتے ہیں، تو اس نے جواب میں فرمایا کہ ان چار باتوں جن کو ابو طالب نے اپنی کتاب ''قوت'' میں ذکر فرمایا ہے، یعنی (۱) خاموشی (۲) تنہائی (۳) بھوک (۴) بیداری (یہی چار چیزیں صوفیاء کرام

کے نزدیک جسمانی مجاہدے کے ارکانِ اربعہ کہلاتے ہیں) پھر وہ بزرگ چلے گئے اور مجھے پتہ نہیں چلا کہ وہ کیسے داخل ہوئے اور نہ ہی پتہ چلا کہ وہ گئے کیسے؟ جبکہ میرا دروازہ ہی بند تھا (انتہیٰ)

محی الدین ابنِ عربی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ شخص ابدالوں میں سے معاذ بن اشرس تھے اور جن چار باتوں کا انھوں نے ذکر فرمایا وہ اس مبارک طریق کی بنیاد اور ستون ہیں، اور جس شخص نے اس میں قدم نہ رکھا ہو اور اس میں رسوخ اور پختگی نہ پیدا کیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے دور حیران وسرگرداں ہے اور اسی سلسلہ میں میں نے یہ شعر کہے ہیں:

یامن ارادامنازل الابدال　　من غیر قصد منه للاعمال

لاتطمعن بهافلست من اهلها　　ان لم تزاحمهم علی الاحوال

واصمت بقلبک واعتزل عن کل من　　یدنیک من غیرالحبیب الوالی

واذاسهرت وجعت نلت مقامهم　　وصحبتهم فی الحل والترحال

بیت الولایة قسمت ارکانه　　سادات نافیه من الابدال

مابین صمت واعتزل دائم　　والجوع والسهرالنزیه العالی

(ترجمۂ اشعار) ایسے وہ شخص جو ابدال کے مرتبوں پر پہنچنا چاہتا ہے اور اعمال کا اہتمام نہیں کرتا تو اس طمع میں مت رہو کیونکہ تم اس کے اہل نہیں (بن سکتے) حالات چاہے کیسے ہی ہوں جب تک ہر حال میں تم ان کی طرح کے اعمال پر جم نہ جاؤ، اگر احوال کی مزاحمت کے باوجود اعمال پر جم نہیں سکتے۔ اپنے دل کو خاموش کرو اور ہر اس شخص سے دور بھاگو جو آپ کو حبیب اور ولی سے ہٹا کر کسی اور سے قریب کرے۔ جب تم جاگو گے اور بھوکے رہو گے اور سفر وحضر میں ان کے ہم نشین بنو گے تب ان کے مقام کو پاؤ گے۔ ولایت کے مکان کو اکابر ابدال نے خاموشی، اور عزلت گزینی اور شب بیداری اور بھوک کے ستونوں پر بتایا ہے (انتہیٰ)

اس مضمون کو شہاب المنینی نے اپنی منظوم شرح ''الخصائص'' میں ذکر فرمایا ہے۔

(۳)......اوتاد

اوتاد وتد کی جمع ہے ''ت'' کے زبر اور زیر دونوں طرح کی لغت ہے۔

ابنِ عربی رحمہ اللہ نے اپنے بعض مؤلفات میں فرمایا ہے کہ ان کو کبھی ''جبال'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا'' اس لئے ان کی حیثیت عالم میں ایسی ہے جیسے جبال کی حیثیت زمین میں، کیونکہ زمین میدان کا ٹھہراؤ پہاڑوں سے ہے۔

شیخ شہاب المنینی نے مناوی سے نقل فرمایا ہے کہ اوتاد ہر زمانہ میں چار ہوتے ہیں نہ کم ہوتے ہیں نہ زیادہ، ایک سے اللہ تعالیٰ مشرق کی حفاظت فرماتے ہیں، اور ایک سے مغرب کی، ایک سے جنوب کی اور ایک سے شمال کی، ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں چاروں اوتادوں میں سے ہر ایک کے لئے بیت اللہ کا ایک رکن مقرر ہے، اور ہر ایک کسی نہ کسی نبی کے قلب کے قریب ہوتا ہے، اور جو حضرت آدم علیہ السلام کے قلب کے قریب ہوتا ہے اس کے لئے رکنِ شامی ہے، اور جو ابراہیم علیہ السلام کے قلب کے قریب ہوتا ہے اس کے لئے رکنِ عراقی ہے، اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب کے قریب ہوتا ہے اس کے لئے رکنِ یمانی ہے، اور جو آنحضرت ﷺ کے قلب کے قریب ہوتا ہے اس کے لئے حجرِ اسود والا رکن ہے (ابنِ عربی فرماتے ہیں) **وهو لنا بحمدالله تعالیٰ** (یعنی یہ حجرِ اسود والا رکن ہمارے لئے ہے بحمداللہ تعالیٰ) انتہیٰ۔

(۴)......نجباء

نجباء نجیب کی جمع ہے اور کبھی کبھی خلافِ قیاس انجاب بھی بولا جاتا ہے، ابدال اور اقطاب کی مناسبت سے انجاب کہہ دیتے ہیں، اور قاعدے کے موافق تو جمع نجباء ہے، جیسے کریم کی جمع کرماء ہے، سیدی عارف باللہ ابنِ عربی رحمہ اللہ نے اپنی بعض

تصانیف میں فتوحات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اولیاء میں سے بعض نجباء ہوتے ہیں، اور وہ ہر زمانہ میں آٹھ ہوتے ہیں نہ کم نہ زیادہ، اور وہ آٹھ صفات کے علم والے ہوتے ہیں، سات تو مشہور ہیں (یعنی حیاۃ، علم، ارادہ، قدرت، سمع، بصر، کلام) اور آٹھویں صفت ادراک ہے، ان کا مقام کرسی ہوتا ہے، وہاں سے ہٹتے نہیں، تیسیرِ کواکب کے علم میں یہ بڑے ماہر ہوتے ہیں، اس مرتبہ کے علماء یہاں اس کا جو طریقہ معلوم ہے انہیں کشف واطلاع کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، انتہیٰ۔

(۵)......نقبا

نقبا، نقیب کی جمع ہے، صحاح میں ہے کہ نقیب عریف کو کہتے ہیں جو قوم کا نگران اور ذمہ دار ہوتا ہے، عارف باللہ ابنِ عربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جونویں آسمان کے علم کے حامل ہوتے ہیں، اور نجباء افلاکِ ثمانیہ کے جو کہ نویں آسمان کے نیچے ہے، ان افلاک کے علم کے حامل ہوتے ہیں، ایک اور جگہ پر ابنِ عربی فرماتے ہیں کہ اولیاء کی ایک قسم ہے جو نقباء کہلاتے ہیں یہ بارہ ہوتے ہیں ہر زمانہ میں نہ کم نہ زیادہ، فلک کے برجوں کی تعداد کے برابر، ہر نقیب ایک برج کی خاصیات کا عالم ہوتا ہے اسی طرح وہ ان اسرار وتاثیرات کا بھی عالم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر ودیعت فرمائی ہیں، اسی طرح وہ کواکب وسیارات اور ثوابت کی حرکت کا بھی واقف کار ہوتا ہے، اس لئے کہ ثوابت کے لئے بھی حرکت وقطع ہوتی ہے بروج میں جس کا ظہور ہزاروں سال میں ہوتا ہے، اہلِ رصد اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان نقباء ہی کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے نازل کردہ شریعتوں کے علوم رکھے ہیں اور نفوس کے مخفی اُمور اور نفوس کے مکر وخداع اور چال بازیوں ومکاریوں کی معرفت کا استخراج بھی انہیں کے ہاتھوں کے ذریعہ فرماتے ہیں، ابلیس ان کے نزدیک ظاہر ہوتا ہے ابلیس کے بارے میں یہ وہ جانتے ہیں جو

خود ابلیس بھی اپنے بارے میں نہیں جانتا (انتہٰی)
اولیاء کی قسم اامامان کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔

(۶)......افراد

اور ایک قسم اولیاء کی وہ ہوتی ہے جن کا نام الافراد ہوتا ہے، ابنِ عربی رحمہ اللہ نے ان کا تذکرہ اپنی بعض کتابوں میں فرمایا ہے، اور فرمایا کہ ان کی نظیر فرشتوں میں سے ارواحِ مہیمہ ہیں یعنی وہ الکروبیون ہیں جو حضورِ حق پر معتکف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ انہیں کچھ پتہ نہیں، بس جس چیز کی انہیں معرفت حاصل ہے اس کے مشاہدہ میں رہتے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی علم نہیں ہوتا، اور ان کو ان کے علاوہ دوسرا نہیں جانتا ہے ان کا مقام صدیقیت اور نبوت کے درمیان ہوتا ہے (انتہٰی)

فصل (ان اولیائے کرام کی تعداد اور ان کی جائے سکونت)

یہ فصل اہلِ تکوین کی تعداد اور ان کی جائے سکونت کے بیان میں۔
شیخ برہان ابراہیم لقانی نے اپنی بڑی منظوم شرح الموسوم "**عمدة المريد لجوهرة التوحيد**" میں ابن تلمسانی کی شفاء کے حواشی سے بیان فرمایا ہے کہ خطیب نے تاریخِ بغداد میں کتانی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل فرمایا ہے، جس میں اس کی صراحت ہے کہ نقباء تین سو ہوتے ہیں، اور نجباء ستر ہوتے ہیں اور ابدال چالیس اور اخیار سات ہوتے ہیں۔
اور عمد جن کو اوتاد بھی کہتے ہیں یہ چار ہوتے ہیں اور غوث ایک ہوتا ہے۔
نقباء کا مسکن مغرب ہے اور نجباء کا مسکن مصر ہے، اور ابدال کا مسکن شام ہے، اور اخیار زمین میں سیاحت کرتے رہتے ہیں (چلتے پھرتے رہتے ہیں) اور عمد زمین کے چاروں کونوں میں ہوتے ہیں، اور غوث کا مسکن مکہ ہے، جب مخلوق کی کوئی حاجت درپیش ہو تو نقباء اللہ تعالیٰ سے عاجزی کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس کے

بعد نجباء اس کے بعد ابدال اس کے بعد اخیار اور پھر ان سب کے بعد آخر میں عمد۔
یا تو کسی ایک فریق کی دعا قبول کر لی جاتی ہے اور یا سبھوں کی مشترکہ، اور اگر پھر بھی قبول نہ ہو تو غوث بھی دعا میں مشغول ہوتا ہے، اس کا سوال پورا ہونے سے پہلے اس کی دعا قبول کر لی جاتی ہے (انتہیٰ)

حضرت ذوالنورین مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نقباء تین سو، نجباء ستر، بدلاء چالیس، اخیار سات، عمد چار، اور غوث ایک ہوتا ہے۔

ابوبکر المطوعی نے ایک ایسے صاحب سے جنہوں نے حضرت خضر کو دیکھا ہے اور ان سے بات کی ہے ان سے نقل فرمایا ہے حضرت خضر نے ان سے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے تو زمین رونے لگی اور عرض کیا الٰہی میں اس حالت کو پہنچ گئی کہ اب قیامت تک کوئی نبی میری پشت پر نہیں چلے گا، تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ میں تیری پشت پر اس امت کے ایسے افراد پیدا کرتا رہوں گا جن کے دل انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے جیسے ہونگے، اور قیامت تک کبھی تجھے خالی نہیں چھوڑونگا، زمین کہنے لگی وہ کتنے ہونگے؟ ارشاد فرمایا کہ تین سو اولیاء، ستّر نجباء، چالیس اوتاد، دس نقباء، سات عرفاء، تین مختارون، ایک غوث۔

جب غوث کا انتقال ہوتا ہے تو تین میں سے ایک اس کا قائم مقام کر دیا جاتا ہے، اور سات میں سے ایک تین کی جگہ بھرتی کر دیا جاتا ہے، اور دس والوں میں سے ایک کو سات والوں کی طرف اور چالیس میں سے ایک دس والوں کی طرف اور ستر میں سے ایک چالیس والوں کی طرف اور تین سو میں سے ایک ستر والوں کی طرف اور پوری مخلوق میں سے ایک کو ان تین سو میں بھرتی کر دیا جاتا ہے، اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا (انتہیٰ)

(علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میں عرض کرتا ہوں کہ یہاں جو تعداد مذکور ہے اس میں اور ماسبق میں جو تعداد مذکور ہوئی دونوں میں کچھ فرق ہے، اور ہوسکتا ہے جس نے

اکثر کا ذکر فرمایا اس نے سب کا تذکرہ فرما دیا، اور جس نے تعداد کم ذکر کی انہوں نے ان میں جو اہم اور رئیس یا بقیہ میں جو راسخُ القدم ہوتے ہیں ان کا ذکر فرما دیا ہو جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، واللہ اعلم۔

اس کے جواب میں بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے جو کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد صحیح طور پر متعین نہیں، اور بعضوں نے اس کے علاوہ اور بھی جواب دیئے ہیں خوب اچھی طرح سمجھ لو۔

دوسرا باب (ان اولیائے کرام کے وجود اور ان کے فضائل)

دوسرا باب اہلِ تکوین کے وجود اور ان کے فضائل کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے بیان میں ہے۔

اپنی منظوم شرح میں حافظ ابنِ حجر نے الفتاویٰ الحدیثیہ میں اور شہاب الدین احمد المنینی اپنی منظوم شرح میں علامہ سیوطی کے حوالہ سے اور امام مناوی نے اور اسی طرح ملا علی قاری نے ''**المعدن العدنی فی اویس القرنی**'' میں ذکر فرمایا ہے۔

ان میں سے ایک یہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ شام کو برا نہ کہو کیونکہ اہلِ شام میں ابدال ہوتے ہیں، اس کو طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی سے مرفوعاً ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ان کے مظالم کی برائی کرو اور ایک روایت میں ہے ''**لَا تَعُمُّوْا فَاِنَّ فِیْهِمُ الْاَبْدَالُ**'' عمومیت کے ساتھ سب کو برا نہ کہو، کیونکہ ان میں ابدال ہوتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ ابدال شام میں اور نجباء کوفہ میں ہوتے ہیں، ایک اور روایت میں ہے کہ سن لو اوتاد اہلِ کوفہ میں سے اور ابدال اہلِ شام میں سے ہوتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ نجباء مصر میں، اخیار عراق والوں میں سے، قطب یمن میں اور ابدال شام میں ہوتے ہیں اور

وہ تھوڑے ہیں۔

(علامہ شامی کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس روایت میں یہ ہے کہ نجباء مصر میں ہوتے ہیں اور سابق میں یہ گذرا کہ وہ کوفہ میں ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی ایک جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں، کبھی کوفہ میں ہوتے ہیں تو کبھی مصر میں، واللہ اعلم۔ [1]

امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابدال ملکِ شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس آدمی ہوتے ہیں، انہیں کے سبب سے بارشیں برسائی جاتی ہیں، اورانہیں کے سبب سے دشمن کے مقابلہ میں مدد کی جاتی ہے، اوراہلِ شام سے ان ہی کی برکت سے عذاب ہٹایا جاتا ہے (علامہ شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ شہاب المنینی کی شرح میں ہے کہ اس روایت میں جو قید ہے کہ اہلِ شام سے عذاب ان کی برکت سے دفع کیا جاتا ہے یہ ان احادیث کے منافی نہیں ہے جن میں عذاب کے دفع میں اطلاق ہے اور ملکِ شام کی قید مذکور نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ جو ان کے پڑوسی ہیں ان پر ان کی برکت زیادہ تام ہے، اگرچہ ان کی برکت سب کو عام ہے (انتہیٰ)

ابنِ ابی الدنیا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی تخریج فرمائی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ابدال کے بارے میں سوال کیا ،اس میں ہے کہ وہ ساٹھ افراد ہوتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول !اس کا وصف بیان فرمایئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''لَیْسُوْا بِالْمُتَنَطِّعِیْنَ وَلَا بِالْمُبْتَدِعِیْنَ وَلاَ بِالْمُتَعَمِّقِیْنَ '' کہ ''نہ وہ غالی ہوتے ہیں اور نہ بدعتی ہوتے ہیں اور نہ زیادہ چرب لسان ہوتے ہیں''، جس مرتبہ پر بھی وہ پہنچتے ہیں وہ کثرتِ صلاۃ وصوم اور کثرتِ تلاوت

[1] قال الزرقانی فی شرح المواهب والمرادبالعمد بضمتین الاوتاد وبالغوث القطب المفردالجامع والمراد بکون الابدال مسکنهم الشام اکثرهم فلایخالف ماورد ان ثمانیة عشربالعراق ان صح ثم المراد ان محل اقامتهم بهافلاینافی تصرفهم فی الارض کلها (کشف الخفاء ومزیل الالباس ،الجزء الاول ص۲۷)

کی وجہ سے نہیں پہنچتے، بلکہ نفوس کی سخاوت اور قلوب کی سلامتی اور ائمہ کے ساتھ نصیحت کرنے کی وجہ سے پہنچتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابدال چالیس مرد ہوتے ہیں جن میں سے بائیس ملکِ شام میں اور اٹھارہ عراق میں ہوتے ہیں ،جب ان میں سے کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کی جگہ مقرر فرمادیتا ہے، جب قیامت قریب ہوگی تب سب وفات دیئے جائیں گے، اور اس وقت قیامت آجائے گی، اس کو حکیم ترمذی نے روایت کیا۔

اور ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت فرماتے ہیں کہ ابدال چالیس مرد اور چالیس عورتیں ہیں جب ان میں سے کسی مرد کا انتقال ہوتا ہے تو کوئی دوسرا مرد اس کی جگہ مقرر کردیا جاتا ہے، اور کسی عورت کا انتقال ہوتا ہے تو کوئی عورت اس کی جگہ مقرر کردی جاتی ہے، اس کو دیلمی نے تخریج کیا ہے مسند الفردوس میں۔

اور ایک اور روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہے کہ میری امت کے بدلاء جنت میں کثرتِ صوم کثرتِ صلاۃ کی بناء پر داخل نہیں ہوں گے بلکہ سینوں کی سلامتی اور نفوس کی سخاوت کی وجہ سے داخل کئے جائیں گے، اس کو ابنِ عدی نے روایت کیا ہے۔

اور خلاّل نے بھی اس کو بیان کیا ہے اس میں اتنا اضافہ ہے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کی بناء پر جنت میں داخل ہوں گے۔

اور ایک دوسری روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سندِ حسن کے ساتھ مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا زمین خالی نہیں رہے گی چالیس آدمیوں سے جو خلیل الرحمٰن کے مشابہ ہونگے، انہیں کی برکت سے بارش ہوگی، اور انہیں کی برکت سے دشمن کے مقابلے پر مدد کی جائے گی، جب ان میں سے کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا بدل مقرر فرمادیتا ہے، قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ

حضرت حسن ان میں سے ہیں۔

اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد زمین کبھی بھی خالی نہیں ہوتی ایسے سات افراد سے کہ ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ اہلِ زمین میں سے بلاء ومصیبت کو دور فرماتے ہیں۔

اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خیار امتی (میری امت کے بہترین افراد) ہر زمانہ میں پانچ سو ہوتے ہیں ابدال میں چالیس ہوتے ہیں، نہ تو وہ بہترین افراد پانچ سو سے کم ہوتے ہیں اور نہ وہ ابدال چالیس سے کم، جب بھی ان میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے، تو ان پانچ سو میں سے وہ چالیس میں بھرتی کر دیئے جاتے ہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ان کے خصوصی اعمال کیا ہیں انہیں بیان فرمایئے، تو آپ نے فرمایا کہ جو ظلم کرے اس کو معاف کر دیتے ہیں اور جو ان کے ساتھ برائی کرتا ہے یہ اس کے ساتھ احسان کرتے ہیں، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ انہیں مرحمت فرماتا ہے اس میں سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں، اس کی ابونعیم وغیرہ نے تخریج کی ہے۔

اور ایک روایت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر زمانہ میں میری امت میں سے سابقون ہوتے ہیں، اس کو ابونعیم نے حلیہ میں اور حکیم ترمذی نے روایت کیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں تین سو خاص افراد ہوتے ہیں جن کے دل آدم علیہ السلام کے دل پر ہوتے ہیں اور چالیس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ہوتے ہیں اور پانچ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل حضرت جبرئیل علیہ السلام کے دل پر ہوتے ہیں، اور تین ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میکائیل علیہ السلام کے قلب پر ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ایک ایسا ہوتا ہے کہ جس کا دل اسرافیل علیہ السلام کے قلب پر ہوتا ہے، جب کوئی ایک وفات پاتا ہے تو تین میں سے

ایک کواس کی جگہ لایا جاتا ہے،اور جب تین میں سے کوئی وفات پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ پانچ میں سے ایک کو تین میں داخل فرماتے ہیں،اور جب پانچ میں سے کوئی گذر جاتا ہے تو سات میں سے ایک کو اس کی جگہ لایا جاتا ہے،اور جب سات میں سے کوئی انتقال کرتا ہے تو چالیس میں سے ایک کو اس کی جگہ لایا جاتا ہے،اور جب چالیس میں سے کوئی گذر جاتا ہے تو عام مخلوق میں سے ایک کو ان تین سو میں داخل کر دیا جاتا ہے،اللہ تعالیٰ ان کے سبب سے زندگی دیتے ہیں،موت دیتے ہیں،اوران کی وجہ سے غلے اگتے ہیں،اور بلائیں دور ہوتی ہیں،حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا کہ ان کی وجہ سے موت وحیات دینے کا کیا مطلب ہے؟ تو فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے امت کی کثرت کی دعا کرتے ہیں تو زیادہ کئے جاتے ہیں اور ظالم لوگوں پر بددعا کرتے ہیں تو وہ لوگ ہلاک کئے جاتے ہیں،وہ بارش کی دعا کرتے ہیں تو بارش ہوتی ہے،اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں تو کھیت اور باغ اگتے ہیں،اور مخلوق کے حق میں دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ مخلوق سے بلاؤں کو دفع فرماتے ہیں اس کو ابنِ عسا کر نے روایت کیا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس روایت میں آپ ﷺ نے اس بات کا تذکرہ نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کے قلب پر بھی ہوتا ہے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم خلق اور عالم امر میں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ کوئی باعزت اور اشرف اور الطف نہیں پیدا فرمایا،سارے انبیاء اور ملائکہ اور اولیاء کے قلوب حضور ﷺ کے قلب کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے کواکب سورج کے مقابلے میں،اور شاید یہ اس لئے کہ آپ ﷺ جمیع صفات میں مظہرِ حق ہیں،اور دیگر حضرات بعض صفات میں مظہر ہیں اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی صورتوں میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی اُمور پر۔

(علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ نے اپنے قلب پر ہونا کسی کا نہیں فرمایا تو یہ سوچنے کی بات ہے جو ابنِ عربی نے فرمائی ہے جو پیچھے اوتاد کے بارے میں گفتگو کے ضمن میں گذری،کہ اوتاد میں سے ایک قلبِ

محمدی پر ہوتا ہے، اور پھر اس مقام کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ان موصوف قدس اللہ سرہ ونفعنا بہ، ان کا مقام اتنا عالی ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، جیسا کہ اس کو ہر وہ شخص جس کی بصیرت کی آنکھیں اللہ نے کھول دیں، اور اس کے باطن کو مرضِ حسد سے پاک رکھا، اس سے یہ بات مخفی نہیں، جب بطریقِ کشف اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مرتبہ کو منکشف فرمایا، تو بات یہ تھی کہ بعض وہ تھے جو قلبِ ابراہیم علیہ السلام پر تھے، اور ان سے برتر علوم ومعارف میں اور کوئی نہیں سوائے آنحضرت ﷺ کے تو اپنے اقران میں اپنے مرتبے کے سب سے آگے ہونے کو بیان کرنے کے لئے شیخ نے یہ تعبیر استعمال فرمائی کہ وہ قلب محمد ﷺ پر ہیں، اگر چہ حقیقت کے اعتبار سے من کل الوجہ قلبِ محمد پر نہیں ہیں، پھر ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ کسی ولی کا قلبِ نبی یا قلبِ فرشتہ پر ہونے کا یہ مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ خود شیخ رحمہ اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں ذکر فرمایا ہے۔ [1]

کہ علومِ الٰہیہ کا قلوب پر فیضان ہوتا ہے، تو انبیاء وملائکہ کے قلوب پر جو وارادات ہوتے ہیں یہ حضرات جن کو کسی نبی یا ولی کے قلب کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اسی طرح کے علوم ومعارف اور اسی طرح کے واردات سے مشرف کئے جاتے ہیں۔

اور اسی مضمون کو بعض مرتبہ یوں بھی تعبیر کرتے ہیں کہ فلاں ولی فلاں نبی کے قدم پر ہے، دونوں تعبیرات ایک ہی مفہوم میں ہیں (انتہی)

تنبیہ (ابدال واقطاب وغیرہ کی احادیث کی اسنادی حیثیت پر کلام)

شیخ شہاب المنینی فرماتے ہیں کہ ابنِ جوزی رحمہ اللہ نے ابدال کے بارے میں جو

---

[1] فقیر کہتا ہے کہ کسی بزرگ کا کشف یا واردحجتِ قطعی نہیں ہوتا اگر کوئی قلبِ محمدی پر ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہوتے، جن کے بارے میں ان کے فضائل احادیث سے ثابت ہیں، حضور اکرم ﷺ کا قلبِ مبارک جو کچھ اپنے اندر سمائے ہوئے تھا، کسی اور کے قلب میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوسکتا، جیسا کہ حدیث میں ہے ''علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' دوسرے انبیاء کے قلب کا حوالہ خود حضور ﷺ نے فرمایا لیکن اپنے قلب کی نفی کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ تنویر احمد

احادیث وارد ہوئی ہیں ان پر طعن فرمایا ہے، اوران پر وضع کا حکم لگایا ہے۔
علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ان کا تعاقب فرمایا ہے کہ ابدال کے متعلق روایات صحیح ہیں، بلکہ اس بارے میں طویل کلام فرماتے ہوئے فرمایا کہ معنوی اعتبار سے ابدال کے وجود پر روایات حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، اس لئے ابدال کے وجود کا حکم علمِ ضروری کے طور پر صحت ویقین کے ساتھ ثابت ہے (انتہیٰ)
علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ابدال کی روایات مختلف الفاظ سے وارد ہیں سب ضعیف ہیں پھر ان احادیث کا تذکرہ فرما کر فرمایا کہ سب سے زیادہ صحیح روایت اس باب میں وہ ہے جو امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت فرمائی ہے کہ ”**البدلاء یکونون بالشام وهم اربعون رجلا کلما مات رجل ابدل الله مکانه رجلا یسقی بهم الغیث وینصر بهم علی الاعداء ویصرف بهم عن اهل الشام العذاب**“ اس روایت کے بعد علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں سوائے شریح بن عبید کے، اور وہ بھی ثقہ ہیں (انتہیٰ)
ان کے شیخ ابنِ حجر رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ ابدال کا ذکر متعدد روایات میں آیا ہے بعض ان میں صحیح ہیں اور بعض صحیح نہیں ہیں، اور قطب کا ذکر بعض آثار میں ہے، البتہ غوث جو صوفیاء کے یہاں انکے مخصوص معنوں میں مشہور ہے وہ روایات میں مذکور نہیں اور بعض روایات میں ہے کہ ابدال کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ ان کی اولاد نہیں ہوتی، اور وہ کسی پر لعنت نہیں کرتے (انتہیٰ)
لیکن یہ بات پہلے آ چکی ہے اور آگے بھی مذکور ہوگی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے کلام کے حوالہ سے کہ قطب کی تفسیر غوث سے کی گئی ہے تو یہ اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک معنیٰ میں ہیں اس کو یاد رکھو، اور غالباً حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے جو عدمِ ثبوت کا ذکر فرمایا ہے اس کی مراد یہ ہے کہ احادیثِ

صحیحہ میں اس کا ورود نہیں (عدمِ ورود الگ شئ ہے اور عدمِ وجود یا عدمِ ثبوت الگ شئ ہے، عدمِ ورود سے عدمِ وجود یا عدمِ ثبوت لازم نہیں آتا) اس کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کے تذکرے اہلِ طریق اور قلوبِ طاہرہ کے درمیان ثابت ومعروف ہیں، واللہ اعلم (انتہیٰ)

اور فتاویٰ حدیثیہ میں اخیر کی حدیث کو امام یافعی سے اختصار اور معمولی سے تغیر کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اس کے بعد امام یافعی کے حوالے سے فرماتے ہیں ،بعض عارفین کا فرمانا ہے وہ واحد جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ قطب ہے اور اسی کو غوث اور فرد کہتے ہیں، پھر یہ فرمایا کہ یہ حدیث جو ذکر فرمائی ہے وہ صحیح ہے اور اس میں کئی فوائد چھپے ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اعداد یہ اصطلاحی میں کہ بعض مراتب کے اعتبار سے ایک عدد ہے جس کو انہوں نے ابدال ،نقباء، نجباء اوتاد وغیرہ سے تعبیر کیا ہے اور حدیث میں بعض دوسرے مراتب کے اعتبار سے ایک عدد ہے، یہ وجہ ہے روایات میں فرق کی اور سب متفق ہیں ان اعداد کے وجود پر۔

اور اس حدیث کا ایک فائدہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں اور اہلِ سنت والجماعت کے کلام سے باستثناء بعض پتہ چلتا ہے کہ انبیاء افضل ہیں ملائکہ سے۔ [1]

ایک فائدہ یہ ہے کہ میکائیل افضل ہیں جبرئیل سے ،جبکہ مشہور اس کے برخلاف ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے اسرافیل ان میں افضل ہیں اور میکائیل بہ نسبت اسرافیل کے تو یہ سب کے یہاں مسلم ہے البتہ جبرئیل کی بنسبت اختلاف ہے اور دلائل دونوں طرف ہیں، جیسے کہا گیا ہے کہ جبرئیل افضل ہیں، ان کے صاحب السر اور انبیاء ورسل کے پیغام رساں اور ان کی خدمت وتربیت پر قائم ہونے کی وجہ سے، بعضوں نے کہا

[1] انسان کے اشرفُ المخلوقات اور انبیائے کرام کے اس جنسِ اشرف المخلوقات میں افضل وبرتر ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں، ممکن ہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں یہ افضلیت جزئی اور کسی خاص جہت سے مراد ہو۔ تنویر احمد

ہے کہ اسرافیل افضل ہیں کیونکہ وہ تو ساری مخلوق کے لئے صاحب السر ہیں، کیونکہ لوحِ محفوظ ان کی پیشانی میں ہے جن پر کوئی مطلع نہیں اور جبرئیل اوران کے علاوہ وہ سب جو کچھ بھی لوحِ محفوظ سے لیتے ہیں وہ اسرافیل ہی سے لیتے ہیں پھر وہ صاحبِ صور ہیں جو اپنے منہ میں لیے ہوئے منتظرِ حکم ہیں تا کہ اس میں نفخ کریں اور ساری مخلوق ختم ہو، **الامن استثنیٰ اللہ تعالیٰ**.

امام یافعی فرماتے ہیں اس بات کو جاننا چاہئے کہ یہ حدیث محدثین معتمد علیہم میں سے کسی نے بیان کی ہے وہ میں نے نہیں دیکھا لیکن بہت سی احادیث میں ایسے مضامین آئے ہیں جو اس حدیث میں موجود بہت سی باتوں کی تائید کرتے ہیں پھر ان احادیث کا تذکرہ فرمایا پھر اسی اثناء میں فرمایا کہ دونوں حدیثوں میں کوئی مخالفت نہیں، یعنی سابق والی ابونعیم کی روایت اور امام احمد والی روایات میں کوئی منافاۃ نہیں جو ابدال کی تعداد کے بارے میں مختلف ہیں، اس لئے کہ ''بدل'' کا لفظ جس کی جمع ابدال ہے اس کے اطلاقات الگ الگ ہیں اس کو کئی موقعوں پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ آگے آنے والی حدیث سے بھی معلوم ہوگا ان کی علامتوں اور صفات کے فرق میں، اور یہ کہ وہ کبھی چالیس ہوتے ہیں اور کبھی تیس لیکن اس روایت پر اثر پڑتا ہے جس میں چالیس سے کم یا زیادہ نہ ہونے کی صراحت ہے (انتہیٰ)

اور اس کی تائید سابقہ کلام سے بھی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں امام یافعی نے ایک واقعہ بعض مشائخ کا ذکر فرمایا ہے، فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ اس موضوع پر اپنے بعض مشائخ کے ساتھ ایک عجیب بات پیش آئی، وہ یہ کہ میں نے اسی جماعت کے بعض حضرات کی گود میں پرورش پائی جو احتیاط برتتے ہیں اور کسی پر ملامت کرنے سے گریز کرتے ہیں ان کی باتیں میرے دل میں بیٹھی ہوتی تھیں، کیونکہ اس زمانہ میں تو میرا دل بالکل خالی تھا، جس کے ساتھ نشست و برخاست کی، وہ جم گئی پھر جب میں علومِ ظاہرہ میں مشغول تھا اس وقت میری عمر چودہ برس تھی اور میں مختصر شیخ ابوشجاع پڑھ رہا تھا شیخ

ابوعبداللہ سے، اس زمانہ میں شیخ محمد جوینی جامع ازھر مصر کے معلم تھے، میں نے ان کی صحبت ایک مدت تک اختیار کر لی تو ایک دن اسی موضوع پر گفتگو چل پڑی جس میں قطب، نجباء، نقباء، ابدال وغیرہ جو گذر چکے ہیں اس پر شیخ نے شدت سے انکار فرمایا اور فرمانے لگے کہ یہ سب کچھ نہیں، اس کی کچھ حقیقت نہیں اور حضور ﷺ سے اس بارے میں کچھ ثابت نہیں، میں نے عرض کیا جبکہ موجودین میں سب سے چھوٹا میں تھا یہ تو بالکل حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ اولیاء اللہ نے اس کی خبر دی ہے اور معاذ اللہ وہ جھوٹے تو نہیں اور اس کو امام یافعی نے ایسے صاحب کے بارے میں فرمایا تھا جن کے پاس علومِ ظاہرہ وباطنہ دونوں جمع تھے اس پر شیخ اور زیادہ مخالفت کرنے لگے، میرے لئے سکوت کے علاوہ کوئی گنجائش نہ تھی، میں خاموش ہو گیا، میں نے سوچا اس سلسلہ میں میری مدد شیخ الاسلام امامُ الفقہاء والعارفین ابو یحییٰ زکریا انصاری ہی فرما سکتے ہیں، میری عادت یہ تھی کہ میں شیخ محمد جوینی کو جن کی بینائی کمزور ہو گئی تھی جہاں انہیں جانا ہوا کرتا لے کر جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام کی مجلس میں شیخ محمد جوینی کو لے جانے لگا، جب ہم ان کے گھر کے قریب پہنچے تو میں نے شیخ جوینی سے عرض کیا اگر ہم شیخ الاسلام کے سامنے یہ قطب وغیرہ کے مسئلہ کا تذکرہ کریں تو اس میں کیا حرج ہے دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں، چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو شیخ الاسلام نے جوینی کا استقبال فرمایا اور ان کا خوب اکرام فرمایا اور ان سے دعا کی درخواست کرتے رہے پھر میرے لئے بھی دعائیں دیں ان میں سے ایک یہ بھی دی ”اللّٰھم فقھه فی الدین “(یا اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرمایئے) اور وہ مجھے یہ دعا بہت دیا کرتے تھے۔

جب ہم شیخ کی زیارت سے فارغ ہوئے اور شیخ جوینی نے واپسی کا ارادہ فرمایا تو میں نے شیخ الاسلام سے عرض کیا کہ حضرت یہ قطب، اوتاد، نجباء، ابدال وغیرہ جس کو صوفیائے کرام بیان فرماتے ہیں آیا اس کی کوئی حقیقت ہے؟ فرمانے لگے صاحبزادے

اللہ کی قسم! یہ صحیح ہے؛ میں نے عرض کیا حضرت! شیخ اور میں نے شیخ جوینی کی طرف اشارہ کیا اس کو نہیں مانتے اور سختی سے رد فرماتے ہیں، یہ سن کر شیخ الاسلام شیخ محمد جوینی سے فرمانے لگے " **ھکذا یا شیخ محمد!**"، شیخ محمد یہ ایک حقیقت ہے اور اس کو بار بار فرمانے لگے یہاں تک کہ شیخ محمد کہنے لگے "**آمنت بذلک وصدقت به وقد تبت**" اس پر شیخ نے فرمایا تمہارے بارے میں میرا یہی گمان ہے کہ تم مان جاؤ گے اے شیخ محمد، پھر ہم وہاں سے چل پڑے اور شیخ محمد جوینی نے مجھ سے کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں فرمایا (انتہیٰ)

اور شیخ عثمان عجلونی کی کتاب "**الاجوبة المحققة عن الاسئلة المفرقة**" میں سیرۃ حلبیہ کے حوالے سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تین باتیں جس میں ہوں وہ ابدالوں میں سے ہوگا جن سے دنیا قائم ہے "**الرضاء باللہ، الصبر عن محارم اللہ، والغضب فی ذات اللہ**" (اللہ تعالیٰ کی رضا اور اللہ تعالیٰ کی محرمات سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے غصہ)

ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء میں ہے کہ جو شخص دس مرتبہ "**اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ فَرِّجِ الْکَرْبَ عَنْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ**" کہے گا اس کا مرتبہ ابدال میں لکھا جائے گا (انتہیٰ)

شبراملسی نے مواہب کے حاشیہ میں اس کا یہ مطلب لکھا ہے وہ وصف کے اعتبار سے ان کے مثل ہے اور قیامت کے دن اُن کا مصاحب بنا کر محشور کیا جائے گا، یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں ابدال میں سے ہو جاتا ہے، تو اب یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ جو پڑھے گا وہ ابدال ہو جائے گا اگرچہ کہ اس کی بہت اولاد ہو (انتہیٰ) (یہ بھی ایک علامت مشہور ہے کہ وہ صاحبِ اولاد نہیں ہوتے)

تیسرا باب (غوث اور اقطاب کے بعض احوال)

تیسرا باب غوث اور قطب کے بعض احوال پر گفتگو کے بیان میں ہے، نفعنا اللہ تعالیٰ بہ۔
یہ بات پہلے گذری ہے کہ قطب کا مسکن مکہ ہوتا ہے یا یمن ہوتا ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ بعض اوقات کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے یا غالب اوقات کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الجواہر والدرر'' میں اپنے شیخ عارفِ ربانی سید علی الخواص رحمہ اللہ کے بارے میں نقل فرمایا ہے کہ میں نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ قطب غوث کیا ہمیشہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہوتا ہے جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ قطب کا دل تو ہمیشہ حضرتِ حق کے طواف میں ہوتا ہے کبھی اس سے وہ خارج نہیں ہوتا جیسا کہ عام لوگ بیت اللہ کے طواف میں ہوتے ہیں، وہ ہر جہت میں ہر جہت سے حضرتِ حق کا مشاہدہ کرتا ہے جیسا کہ بیت اللہ کے اطراف کے لوگ ہمیشہ طواف میں مشغول رہتے ہیں، وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلیٰ۔
اس لئے کہ وہ حق تعالیٰ سے ان تمام آفات اور انعامات کا جو مخلوق پر فائض ہوتی رہتی ہے (تعلق) وصول کرتا رہتا ہے، اس لئے اس کے سر میں بھی ہمیشہ ایک قسم کی گرانی رہتی ہے وارادات کے وزن وازدحام سے، البتہ قطب کا جسم مکہ یا غیر مکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جہاں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہاں رہتا ہے (اور جہاں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں پیدا ہوتے ہیں) [1]
اور یہ بھی میں نے شیخ کو فرماتے ہوئے سنا ہے تمام شہروں میں کامل ترین شہر بلدِ حرم یعنی مکہ ہے اور تمام گھروں میں کامل ترین گھر بیت الحرام ہے اور تمام مخلوق میں کامل ترین

[1] وقیل ان الغوث مسکنه الیمن والاصح ان اقامته لاتختص بمکة ولابغیرها بل هو جوال وقلبه طواف فی حضرة الحق تعالیٰ وتقدس لایخرج من حضرته ابدا ویشهده فی کل جهة ومن کل جهة انتهیٰ (کشف الخفاومزیل الالباس ،الجزء الاول،ص۲۷،۲۸)

مخلوق ہر زمانے میں قطب ہے، تو بلد اس کے جسم کی نظیر ہے اور بیت اس کے قلب کی نظیر ہے اور اس سے مخلوقات استعدادوں کے موافق امداداتِ الٰہیہ متفرع ہوتے رہتے ہیں، اگرچہ اکثر امدادات مکہ مکرمہ میں نازل ہوتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا (يُجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىْءٍ) خاص طور پر جو احرام باندھ کر دور دراز سے حاضر ہوتے ہیں۔

اس لئے کہ امداداتِ الٰہیہ کسی بندے پر اسی وقت نازل ہوتی ہیں جب اس کی نظر اپنی حسنات سے ہٹ جاتی ہے اور وہ اپنے کو فقیرِ محض پاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ) اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص حج کرے اور رفث اور فسوق نہ کرے تو اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ اس دن گناہوں سے پاک تھا جب وہ اپنی ماں سے پیدا ہوا تھا، گویا اس کو یہاں ایک نئی ولادت نصیب ہوتی ہے اور بسا اوقات بعض لوگوں کی نیکیاں اس مقامِ مقدس کے اعتبار سے مثل گناہوں کے ہوتی ہیں، میں نے شیخ سے پوچھا کیا کوئی ولی قطب کے اخلاق کا احاطہ کر سکتا ہے؟ تو فرمانے لگے بہت کم ولی اللہ قطب کو پہچان پاتے ہیں چہ جائیکہ کوئی اس کے اخلاق کا احاطہ کر سکے، بلکہ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ قطب اور غوث یہ دیکھنے والے کی استعداد کے اعتبار سے نظر آتے ہیں (انتہیٰ)

اور فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے یہ بھی پوچھا کہ کیا قطب کی کوئی مدت متعین ہوتی ہے اور کیا اس کو اپنے عہدہ سے معزول کیا جا سکتا ہے یا وہ موت سے ہی معزول ہوتا ہے، تو شیخ رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ قطب کا حال اس معاملہ (مدت) میں دیگر اولیاء کی طرح ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں رہتا ہے اور معزول بھی ہو سکتا ہے اور میں جو بات کہتا ہوں (وساعده الوجود) کہ قطبیت کے لئے کوئی مدت متعین نہیں ہے اور جب کسی کو یہ عہدہ دیا جاتا ہے تو پھر معزول نہیں ہوتا جب تک موت نہ آ جائے، کیونکہ اس کے حق میں خروج عن العدل صحیح نہیں کہ عزل

کی نوبت آئے۔

فرمایا اس کی وضاحت یہ ہے کہ فروع اصول کے تابع ہوتے ہیں قطبیتِ کبریٰ پر حضورﷺ کا اپنی مدتِ رسالت یعنی ۲۳ سال تک جلوہ رہا، اور پوری امت متفق ہے کہ آپ کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور آپ حضورﷺ کی خلافت پر دو سال چند ماہ رہے اور وہ اس امت کے سب سے پہلے قطب ہیں، ایسے ہی حضرت عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی مدتِ خلافت ہے اور ان کے بعد ظہورِ مہدی رحمہ اللہ تک سلسلہ جاری رہے گا اور حضرت مہدی علیہ الرحمۃ خلفاءِ محمدیین میں سے آخری قطب ہیں اس کے بعد قطبِ وقت خلیفۃ اللہ فی الارض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے۔ اور چالیس سال خلافت پر متمکن رہیں گے جیسا کہ وارد ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قطبیت کی کوئی مدت متعین نہیں ہے، اگرچہ کہ قطبیت قطب پر پہاڑوں کی طرح ثقیل ہوتی ہے کیونکہ کوئی بلاء آسمان اور زمین سے نازل نہیں ہوتی مگر پہلے قطب پر اترتی ہے پھر آگے جاتی ہے، اسی لئے اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دائمی سردرد میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ ایسا لگتا ہے گویا کہ کوئی اسے دن رات مار رہا ہے۔

فرمایا کہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ شیخ ابوالنجا سالم جو شہر ''فوہ'' میں مدفون ہیں کہ وہ قطبیت پر چالیس سال قائم رہے پھر انتقال فرمایا اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ وہ اس مقام پر دس دن رہے، اور شیخ ابو مدین المغربی کے بارے میں بھی اسی طرح منقول ہے، پھر میں نے اپنے شیخ سے دریافت کیا کہ کیا قطب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اہلِ بیت میں سے ہو، جیسا کہ بعضوں نے فرمایا ہے، تو فرمایا کہ نہیں اسکی کوئی شرط نہیں وہ ایک وہبی امر ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں مرحمت فرماتے ہیں تو قطب اشرافِ نسب میں بھی ہوتے ہیں اور ان کے غیر میں بھی (انتہیٰ)

فصل (قطب کی پہچان)

مذکورہ تفصیلات سے یہ معلوم ہوگیا کہ قطب اکثر لوگوں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو کوئی کوئی ہی پہچانتا ہے، اور یہ شاید اس لئے بھی ہو کہ واردات کی عظمت کا جو بوجھ وہ اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اس کا عام مخلوق تحمل نہیں کرسکتی اور جو ھیبت اور وقار کا لباس اللہ تعالیٰ انہیں پہناتا ہے اس کی وجہ سے شاید مخلوق ان کی رؤیت کا تحمل نہیں کرسکتی۔

چنانچہ امام شعرانی رحمہ اللہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس بات کی صراحت فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے فرمایا کہ اکثر اولیاء نہ ان کے پاس جمع ہوسکتے ہیں اور نہ پہچان سکتے ہیں چہ جائیکہ دیگر لوگ، کیونکہ ان کی شان اخفاء ہے اور اگر کسی شخص کے لئے ظاہر ہوجائیں تو وہ اُن کے چہرے کے سامنے اپنا سر نہیں اٹھاسکتا اِلاَّ یہ کہ وہ اس کا اہل ہو۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص حضور ﷺ کے سامنے لایا گیا وہ آپ کی ہیبت سے تھرتھرانے لگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سکون سے رہو میں تو قریش کی ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھالیا کرتی تھی، یہ حال ہے اس شخص کا جس نے سرکار دوعالم ﷺ کو دیکھا حالانکہ آپ ﷺ ساری مخلوق میں سب سے زیادہ تواضع اختیار فرمانے والے تھے، اور قطب بالیقین آپ کا نائب ہوتا ہے زمین میں۔

(علامہ شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ سید شریف شیخ شرف الدین جو کہ مصر کے ایک ممتاز اور صالح علماء میں سے ہیں انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے شیخ عثمان الخطاب نے بیان فرمایا کہ جب وہ اپنے شیخ ابوبکر الدقدوسی کے ہمراہ حج کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے (شیخ عثمان نے) اپنے شیخ سے فرمائش کی کہ ان کو قطب سے ملوایئے مکہ مکرمہ میں، تو شیخ نے فرمایا کہ عثمان تم ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، تو انہوں نے کہا کہ نہیں ضرور ملایئے، اور اپنے شیخ کو مقامِ ابراہیم اور زمزم کے درمیان قسم دی کہ

آپ کو ملانا ہوگا اور کہنے لگے کہ یہاں سے اٹھنا نہیں ہے جب تک کہ وہ تشریف نہ لے آئیں، تو ہوا یوں کہ شیخ عثمان کا سروزنی ہونے لگا اور بوجہ ثقل کے نیچے کی طرف جھکتا چلا گیا، یہاں تک کہ ان کی داڑھی ان کی رانوں میں چلی گئی، قطب آ گئے اور بیٹھ گئے، اور شیخ ابوبکر کے ساتھ کافی دیر تک بیٹھے بات کرتے رہے پھر اس کے بعد قطب نے شیخ سے فرمایا کہ عثمان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہو کیونکہ اگر وہ زندہ رہا تو رجال اللہ میں سے بنے گا، جب قطب صاحب تشریف لے جانے لگے تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ لایلاف پڑھی اور تشریف لے گئے جب شیخ ابوبکر نے ان کو رخصت کیا اور واپس آئے تو شیخ عثمان کی گردن بہت دیر تک دباتے رہے تاکہ ان کی بات سن سکیں پھر فرمایا کہ عثمان تمہارا یہ حال صرف ان کا کلام سننے سے ہوگیا اگر تم قطب صاحب کو دیکھ لیتے تو تمہارا کیا حال ہوتا، اس وقت سے شیخ عثمان جب کسی شخص سے ملاقات کرتے تو جدائی کے وقت سورہ فاتحہ اور سورہ قریش ضرور تلاوت کرتے قطب صاحب کی عادتِ شریفہ سے استبراک کرتے ہوئے، علامہ شعرانی کا کلام یہاں ختم ہوا۔

علامہ شیخ محمد شوبری رحمہ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں جو اس بارے میں ان سے کیا گیا تھا فرمایا کہ امام یافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''کفایۃ المعتقد'' میں بعض عارفین کا کلام نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ غیرت کی وجہ سے قطب کے احوال جو کہ وہی غوث بھی کہلاتا ہے خواص اور عوام سب سے چھپاتے ہیں، البتہ یہ بات ہے کہ وہ عالم کو جاہل معلوم ہوتے ہیں اور بے وقوف کو سمجھدار معلوم ہوتے ہیں، تارک الدنیا کو آخذ الدنیا معلوم ہوتے ہیں، دور کو نزدیک آسان کو مشکل، مطمئن کو ڈروالے نظر آتے ہیں، اور اوتاد کے احوال خواص پر مکشوف ہوتے ہیں اور ابدال کے احوال خواص اور عارفین پر مکشوف ہوتے ہیں اور نجباء اور نقباء کے احوال خواص وعوام سے مستور ہوتے ہیں، البتہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے مکشوف ہوتے ہیں۔

اور صالحین کے احوال خواص وعوام سب کو معلوم ہوتے ہیں (لِيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ

مَفْعُوْلاً)(انتہیٰ)

چوتھا باب (قطب پر نازل ہونے والے احوال)

چوتھا باب قطب پر جس چیز کا نزول ہوتا ہے اس کے بیان میں اور یہ کہ جو چیز اس پر وارد ہوتی ہے تو اس میں وہ تصرف کس طرح کرتے ہیں؟

علامہ شعرانی رحمہ اللہ نے ''جو ہر اور درر'' میں فرمایا ہے کہ میں نے اپنے شیخ سے عرض کیا ،کیا قطب پر وہ بلا نازل ہوتی ہے جو مخلوق پر نازل ہونے والی ہے پھر وہاں سے پھیلتی ہے جیسا کہ نعمتیں اور امداد اس پر نازل ہوتی ہیں یا پھر فیض پہنچانے کا حکم نعمتوں کے ساتھ خاص ہے؟ تو شیخ نے فرمایا کہ ہاں اس پر سب بلائیں بھی نازل ہوتی ہیں جو اہلِ زمین پر نازل ہونے والی ہوں جب کوئی بلیۃ نازل ہوتی ہے تو قطب انتہائی خوف اور قبول کے ساتھ اس کو لیتا ہے پھر انتظار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوح محفوظ میں جو کچھ محو واثبات میں ہے اس میں سے کیا ظاہر فرماتے ہیں اور کس کو چھوڑتے ہیں اگر محو وتبدیل ظاہر ہو تو اللہ تعالیٰ کا قضا نافذ ہوتا ہے،اور اہلِ تسکیک کے واسطہ سے جو کہ وہ ان کے خدام میں سے ہوتے ہیں ان کے اوپر کو گذار کر قطب کی طرف سے اس کو چلتا کر دیتے ہیں ،اور خدام ماتحتین کو پتہ بھی نہیں چلتا،اور اگر اس بلیۃ کا اثبات لوح محفوظ سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ وہ محو ہونے والی نہیں تو پھر قطب اس کو اپنے سے نسبۃً جو قریب ہیں اور عدداً بھی جو قریب ہے اس کے حوالہ کرتا ہے اور وہ دونوں امامین ہیں وہ اس کا تحمل کرتے ہیں پھر اس کو دفع کرتے ہیں چاروں اوتاد کی طرف اور اسی طرح سلسلہ آگے چلتا ہے پھر بھی وہ مصیبت نہیں ٹلتی ،تو عامۂ مومنین میں سے جو عارفین ہوتے ہیں ان کے افراد پر اس کو متفرق کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو ان کے تحمل کی وجہ سے دفع فرما دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات بعض آدمی اپنے اندر ایک ضیق اور تنگی محسوس کرتے ہیں اور

اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا، اور کبھی ایسی بے چینی ہوتی ہے کہ نیند نہیں آتی اور بعض مرتبہ غفلت ہوجاتی ہے اور بعض مرتبہ ایسی خاموشی طاری ہوجاتی ہے کہ ایک حرف نہیں بولا جاتا یہ سب اس مصیبت کی وجہ سے ہوتی ہے جوان پر تقسیم کردی گئی، اور اگر تقسیم نہ کی جائے تو جن پر وہ بلا نازل ہوتی وہ ایک چشم زدن میں ختم ہوجائیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ)

خاتمہ (اولیائے کرام اور ان کی کرامات کا ثبوت)

جب ہم قطب وغوث کے سلسلہ کی گفتگو یہاں تک لے آتے ہیں (اَعَادَاللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْنَا مِنْ بَرَكَاتِهٖ وَلَمَّحْنَا بِلَمْحَةٍ مِّنْ لَمْحَاتِهٖ) اور ان کے عجیب وغریب حالات کا بیان کر دیا ہے جو کہ خلافِ عادت ہے اور عملِ خارق ہے جو کہ خاص اسی شخص کے لئے ممکن ہے جس کے اوپر اللہ کا خاص فضل ہو۔

تو اب بیان کی سواری اور انگلیوں کی لگام کچھ کرامتوں اور خوارق عادات امور کی طرف پھیرتے ہیں کہ پہلے ولی کا بیان کرتے ہیں جس کے ہاتھوں کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔

تو ہم کہتے ہیں کہ سیدنا الامام ابوالقاسم عبدالکریم ابن ھوازن القشیر ی نے اپنے رسالہ میں فرمایا ہے کہ اگر پوچھا جائے کہ ولی کے کیا معنیٰ ہیں؟ تو اس سے کہا جائے گا کہ دو باتوں کا احتمال ہے ایک فعیل کے وزن پر جو فاعل کا مبالغہ ہے علیم اور قدیر کے وزن پر تو اس صورت میں ولی کے معنیٰ یہ ہونگے ''وہ شخص جس کی اطاعت مسلسل ہو بغیر معصیت کے تخلل کے''

اور یہ بھی ممکن ہے ولی فعیل کے وزن پر ہو جو مفعول کے معنیٰ میں آتا ہے جیسے قتیل مقتول کے اور جریح مجروح کے معنیٰ میں آتا ہے تو معنیٰ یہ ہونگے کہ ولی وہ شخص ہے کہ حق تعالیٰ اس کی حفاظت اور حراست ایسی دائمی فرماتے ہوں کہ اس کو گناہوں کی رسوائی

لاحق نہ ہو اور اس کو طاعات کی مدام توفیق عطا فرماتے ہوں، جیسے فرمایا (وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ) (انتہیٰ)

اس کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ ولی کا محفوظ ہونا ضروری ہے جیسے کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے۔

لیکن اس معنیٰ کر وہ خطا وزلل میں پڑا نہیں رہے گا اگر مبتلا ہو بھی گیا تو توبہ کا الہام ہوگا اور وہ تائب ہو جائے گا، جیسا کہ رسالہ میں اس کی تصریح موجود ہے، چنانچہ اسی میں یہ مذکور ہے کہ حضرت جنید رحمہ اللہ سے عرض کیا گیا کہ کیا عارف زنا کر سکتا ہے تو تھوڑی دیر آپ نے سر جھکایا پھر اپنا سر اٹھایا اور فرمایا (وَكَانَ اَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا) اسی میں یہ بھی ہے اگر یہ سوال ہو کہ ولی پر اس کے صحو کے اوقات میں کیا چیز غالب ہوتی ہے تو کہا جائے گا کہ وہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں صادق ہوگا۔

پھر مخلوق پر رفق اور شفقت کرے گا اپنے تمام احوال میں پھر وہ ساری مخلوق ہی پر اپنی رحمت نچھاور کرے گا اور اس کے ساتھ دوامِ تحمّل اس کا شعار ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ان پر احسان کی درخواست کرتا رہتا ہے بغیر مخلوق کی جانب سے مطالبہ کے اور مخلوق کی نجات کے لئے اپنی ہمت صرف کرتا ہوگا، مخلوق سے انتقام نہیں لے گا، ان سے کینہ نہیں رکھے گا ان سے کوئی طمع نہیں وابستہ کرے گا، ان کے بارے میں اپنی زبان گندی نہیں کرے گا اور ان کی برائیوں میں شرکت سے اپنے کو محفوظ رکھے گا، اور دنیا ہو یا آخرت دونوں میں کسی کو اپنا خصیم نہیں بنائے گا۔

جب ولی کی تعریف اور اوصاف سامنے آ گئے تو اب ہم عرض کرتے ہیں کہ کرامت اس بات کا نام ہے کہ ایک ایسا آدمی جس کا اعتقاد صحیح ہو اور وہ اعمالِ صالحہ کا پابند ہو اور کسی (آخری نبی) نبی کی اتباع کا التزام کرتا ہو اور نبوت کا دعویٰ نہ کرتا ہو اس کے ہاتھ پر کسی ایسی بات کا ظاہر ہونا جو کہ خلافِ عادت ہو کرامت کہلاتی ہے۔

مدعی نبوت نہ ہونے کی قید معجزہ سے الگ کرنے کے لئے ہے اور اعتقادِ صحیح اور عملِ

صالح کی قید اس لئے لگائی گئی ہے تا کہ استدراج سے الگ ہو جائے جو کہ غیر مومن کے ساتھ ہوتا ہے، اسی طرح بعض مرتبہ کذابین کی تکذیب کے لئے بھی بعض خوارق پیش آجاتے ہیں، ان سے کرامت کی تعریف کو الگ کرنے کے لئے ایمان وعملِ صالح کی قید لگائی گئی ہے، تکذیبِ کذابین کی صورت یہ ہوتی ہے جیسے کہ مسیلمہ کذاب کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے ایک اعور کے لئے دعا کی کہ اس کی آنکھ صحیح ہو جائے تو اس کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی، اس نے ایک مرتبہ ایک کنویں میں اپنا تھوک ڈالا تا کہ اس کی حلاوت میں اضافہ ہو جائے تو پانی انتہائی کڑوا ہو گیا، اس نے ایک یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ یتیم گنجا ہو گیا، اس کا نام اھــانة ہوتا ہے، جیسا کہ بعض ولیوں کے ذریعہ عام مسلمانوں کے ہاتھ پر کوئی خرقِ عادت پیش آئے تا کہ مسلمان مصیبت اور مکروہ سے نجات پا جائیں تو اس کا نام معونۃ ہوتا ہے۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ خوارق چار قسم کے ہوتے ہیں، معجزہ، کرامت، اھانۃ، معونۃ، بعضوں نے اسی پر اکتفاء کیا ہے (اور ایک قسم تصرف کی ہوتی ہے جو مشق وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے جو مسمرائزر سے صادر ہوتی ہے) اور بعض حضرات نے اس میں ارھاص کا اضافہ کیا ہے، ارھاص کا مطلب ہوتا ہے دعویٰ نبوت سے پہلے جو خوارق نبی کے ساتھ پیش آتے ہیں جیسے پتھروں کا سلام کرنا، بادلوں کا سایہ فگن ہونا وغیرہ جو حضور ﷺ کے ساتھ نبوت کے عطا کئے جانے سے پہلے پیش آئے۔

اور استدراج فاسق کے ہاتھ پر خوارق کا ظہور ہے جو اس کے دعویٰ کے موافق ہوتا ہے، پھر اس کی دو صورتیں ہیں ایک بغیر کسی سبب کے جیسے فرعون کے کہنے پر جادو اور شعبدہ کا ظہور ہوا، اور دوسرے سبب کے ساتھ جیسے سانپوں کا کھا جانا سانپ اس کو ڈستے تھے مگر وہ متاثر نہ ہوتا تھا۔

پھر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو خارقِ عادت بات عارف کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے اس کی دو جہتیں ہوتی ہیں ایک جہت سے وہ کرامت ہے دوسری جہت سے وہ معجزہ

ہے، کرامت عارف اور ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہونے کے اعتبار سے ہے اور معجزہ حضورﷺ کی نسبت سے ہے کہ آپ کے امتی ہونے کی وجہ سے یہ کرامت ہے جو نبی کا معجزہ ہے کیونکہ وہ آپ کی تصدیق اور آپ کی اطاعت کی وجہ سے ہی تو ولی بنا ہے ورنہ وہ ولی نہ ہوتا، تو حضورﷺ کی طرف نسبت کرتے ہوئے معجزہ ہے چاہے وہ خود حضور اکرمﷺ کے دستِ مبارک سے ظاہر ہو یا ان کے کسی امتی کے ذریعہ سے ظاہر ہو، اور ولی کی طرف نسبت کرتے ہوئے صرف کرامت ہوگی کیونکہ ولی کی طرف سے نبوت کا دعویٰ نہیں ہوتا اور نبی کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کو نبی ہونے کا علم ہو اور خرقِ عادت کے اظہار کا ارادہ بھی ہو اور جس معجزہ کا وہ اظہار کر رہا ہے اس کا حکم قطعی ہوتا ہے اور اس کا ظہور ضروری ہوتا ہے، مگر یہ سب چیزیں ولی کے لئے ضروری نہیں جیسا کہ محققین نے فرمایا ہے (اور بعض مرتبہ اولیاء سے بغیر ارادہ اور بغیر علم خوارق صادر ہو جاتے ہیں)

اور اسی کی طرف امام قشیری نے اپنے رسالہ میں اشارہ کیا ہے، پھر فرمایا کہ حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک مشکیزہ شہد سے بھرا ہوا اور اس میں سے ایک قطرہ شہد ٹپک جائے تو تمام اولیاء کو جو میسر ہوتا ہے وہ ایسا ہے جیسے قطرہ اور مشکیزہ میں جو کچھ ہے اس کی مثال وہ ہے جو حضورﷺ کو حاصل ہے (انتہیٰ)

اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کرامت میں وہ سب ہوسکتا ہے جو نبی سے معجزے کے طور پر ہوسکتا ہے جیسے سمندر کا پھٹنا، عصا کا اژدھے سے بدل جانا، مردہ کا زندہ ہو جانا وغیرہ، لیکن بعض حضرات نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ پھر اس صورت میں معجزہ اور کرامت میں امتیاز نہیں رہتا۔

برھان اللقانی کی ''عمدۃ المرید'' میں ہے کہ شیخ سعد امام نے ان باتوں کی تردید میں فرمایا ہے، یہ جو بعضوں نے مخالفت کی وہ صحیح نہیں، صحیح یہی ہے کہ تمام خوارق کا ظہور ولی سے

ممکن ہے جہاں تک معجزہ اور کرامت میں امتیاز کا تعلق ہے وہ نبوت کا دعویٰ ہے، اگر کوئی ولی نبوت کا دعویٰ کرے گا تو وہ ولی کہاں رہے گا وہ عدواللہ ہو جائے گا پھر وہ کرامت کا مستحق نہیں رہے گا بلکہ لعنت اور اہانت کا مستحق ہو جائے گا (انتھیٰ)

پھر یہی مضمون امام نووی رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے ان بعض لوگوں کی تغلیط کی ہے جو کرامت ومعجزہ میں امتیاز کے قائل ہیں اور فرمایا کہ درست بات یہ ہے کہ ولی سے بھی قلبِ اعیان وغیرہ جیسی چیزیں صادر ہو سکتی ہیں اور امام نسفی رحمہ اللہ نے بھی یہی بات فرمائی ہے چنانچہ شارح وھبانیہ نے اس کو منظوم کیا ہے ؎

واثباتها فی کل ما کان خارقا عن النسفی النجم یروی وینصر

تَتِمَّه (کراماتِ اولیاء حق ہیں)

رسالہ میں مذکور ہے کہ ولی کے لئے کرامت کا ٹھہراؤ نہیں ہوتا بلکہ کبھی جب یقین کی قوۃ اور بصیرت کی زیادتی کا کوئی موقعہ ہوتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور اللہ ہی کے فعل سے اس کا ظہور ہو جاتا ہے جس سے لوگ اس بزرگ کے عقائد اور اعمال کی صحت پر استدلال کرتے ہیں تو ولی کی کرامتوں کے امکان کو تسلیم کرنا ضروری ہے (وقوع ہر ایک کے لئے ضروری نہیں) جمہور اہلِ معرفت یہی رائے رکھتے ہیں۔

بزرگوں کی کرامات اور خوارق کے اتنے واقعات ہیں اور اس کثرت سے تواتراً ثابت ہیں کہ اس کی وجہ سے یہ علم اتنا قوی ہے کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے جو شخص بزرگوں کے درمیان رہتا ہے اور ان صادق القول والحال بزرگوں کے اتنے قصے اولیاء کی کرامات وخوارق کے سننے میں آتے ہیں کہ کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اور قرآنِ کریم میں خود کتنے ہی واقعات کا ذکر ہے جیسے ایک جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صاحب کے قصہ میں مذکور ہے (اَنَا اٰتِیْکَ بِہٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ) حالانکہ وہ نبی نہیں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر صحیح سند سے ثابت ہے کہ خطبہ کے دوران جمعہ کے دن فرمایا ''یَاساریۃَ الجبل ''اور اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز حضرت ساریہ تک پہنچ گئی اور انہوں نے اسی وقت پہاڑ کے دامن میں چھپے دشمن سے اپنا بچاؤ کیا۔

پھر قرآنِ کریم میں اولیاء کی کرامات کے سلسلہ میں مزید شہادتوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ میں فرمایا اور یہ سب جانتے ہیں کہ مریم نبی اور رسول نہیں تھیں، بلکہ ولیہ تھیں(كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ. وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا)وہ پوچھتے ہیں(اَنّٰى لَكِ هٰذَا)وہ فرماتی ہیں(هُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ)اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام سے فرمایا(وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا)اور یہ رطب کا زمانہ نہیں تھا۔

ایسے ہی اصحابِ کہف کا قصہ اور وہ عجائب جو ان کے ساتھ پیش آئے وغیرہ۔

اور انہیں کرامتوں میں سے ذوالقرنین کا قصہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ تمکین عطا فرمائی جو دوسروں کو نہیں۔

اور انہیں کرامتوں میں سے حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر دیوار کا درست کرنا بھی ہے، اور اس کے علاوہ بہت سے عجائب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخفی تھے، یہ سارے ہی کام ایسے تھے جو کہ عادت کے خلاف ہیں جو حضرت خضر کے ساتھ مخصوص تھے، دراں حالیکہ حضرت خضر نبی نہیں ہیں بلکہ ولی (صاحبِ تکوین) ہیں۔

پھر آثار واخبار اور حکایاتِ عجیبہ جو صحابہ اور تابعین اور ائمہ معتبرین سے ثابت ہیں، ان کو شیخ نے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے جن کے انکار کرنے کی کوئی طاقت نہیں رکھتا، اگر ہم ان سب کا ذکر کرنے لگیں تو بات دور نکل جائے گی۔

''فسبحان الملک المعبود الذی تفرد فی الوجود بافاضۃ الخیر و الجود''

جس پر چاہتے ہیں اپنے عطایا کی بارش برساتے ہیں اوراپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتے ہیں خاص فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ ان اولیاء کی محبت کے ساتھ ہمیں موت دے اوران کی شرابِ محبت سے ہمیں بھی سیراب فرمائے اوران کی برکاتِ ظاہرہ ہم پر بھی بار بار لوٹائے، اوران کی انفاسِ طاہرہ سے ہم کو نفع پہنچائے، اور ان کے لباسِ فاخرہ ہمیں پہنائے، اور دنیاوآخرت دونوں میں ہمیں ان کی جماعت میں شامل فرمائے، بے شک آپ اکرم الاکرمین اورارحم الراحمین ہیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا وسندنا محمد خیر المقربین وعلیٰ آله واصحابه واتباعه واحزابه الی یوم الدین.

(علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں)اس مقالہ کی تحریر سے فراغت ۱۲۲۴ھ ۸ شوال بدھ کے دن ہوئی۔

میرے شیخ مؤلفِ رسالہ فرماتے ہیں کہ اس کتابچہ کے ختم پر اللہ تعالیٰ نے بزرگوں سے توسل کے سلسلہ میں ایک نظم بھی الہام فرمادی، اسے بھی اس کا حصہ بناتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی اوران کے اتباع کی برکت سے قبول فرمالیں، چنانچہ عرض ہے: ؎

(۱)......اللہ بزرگ وبرتر کی بارگاہ میں اقطاب سے توسل اختیار کرو۔اور عقل پر فتوحات کے دروازے کو کھٹکھٹاتے رہو۔

(۲)......اورسادات ابدال نقباء اورسادات اوتاد اورانجاب سے توسل اختیار کرو۔

(۳)......ایسے ہی اخیار اور نقبا سے توسل کرو۔ پانی کے قطروں اور ریت کے ذروں کے بقدر خیر پاؤ گے۔

(۴)......یہ حضرات لوگوں کے لئے ہر مصیبت وپریشانی سے بچاؤ کا سامان ہیں۔انہیں کے ذریعہ مصیبت ونقصان اور بیماری سے بچاجاتا ہے۔

(۵)......یہ وہ لوگ ہیں جو بلند مقامات پر فائز ہوئے۔اور ایسے مرتبے حاصل کئے جن کو پیمائش سے نہیں ناپا جاسکتا۔

(۶)......جو حالت ان کے لئے تجویز ہوئی اس کے لئے انہوں نے اپنے نفوس کو راضی کرلیا۔بغیر کسی ذلت اور انکسار اور مشقت کے۔

(۷)......تو پھر انہیں ایسی عزت نصیب ہوئی جو کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔اور یہ دولت انہیں اپنے مولیٰ کے حضور اور اطاعت سے حاصل ہوئی۔

(۸)......تم بھی ان کی محبت میں پورے شعور کے ساتھ آگے بڑھتے رہو۔اور ان کی سیرت اختیار کرنے میں خوب کوشش کرو۔

(۹)......ہمیشہ ان کا دامن تھامے رہو۔اور جھوٹوں اور بہتان طرازوں اور شکیوں کی باتوں پر دھیان نہ دو۔

(۱۰)......اور اس طرح دعا کرو کہ اے وہ ذات جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے۔اور جس سے بغیر مانگے خیر کی بارش ہوتی ہے۔

(۱۱)......میں آپ سے اس منتخبہ ذات کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں ۔جو سب عابدوں،ناسکوں کی سردار ہے۔

(۱۲)......جن کا اسمِ گرامی محمد ہے جو سب سے بہتر عنصر ہیں۔تمام اشرف آباء اور اطہر اصلاب کے۔

(۱۳)......اور ان معزز آل کے واسطے سے مانگتا ہوں۔جو تمام نقائص سے پاک اور آپ کے اشرف اصحاب میں سے ہیں۔

(۱۴)......ائمہ میں سب سے بڑے صدیق کے واسطہ سے۔ایسے ہی الفاروق عمر بن الخطاب کے واسطے سے۔

(۱۵)......عثمان ذوالنورین۔اور حیدرِ کرار اسد اللہ الغالب کے واسطے سے۔

(۱۶)......اویس قرنی کے واسطے سے جو اپنے زمانہ میں چھپے رہے۔جو بغیر کسی حجاب کے امام الفضل ہوئے۔

(۱۷)......اسی طرح مجتہدین اور ان کے شاگرد۔اور ان کے اتباع اہلِ فضل اور طلبۂ علم

کے واسطہ سے

(۱۸)......پھر اس زمانہ کا جو قطب مدار ہے اور۔اس کی جماعت کے واسطے سے جو اس کائنات نعمت کدہ کے امام ہیں۔

(۱۹)......میرے رب مدد فرمایئے میری مدد فرمایئے۔اور مجھے ہر رنج اور غم اور تعب سے نجات مرحمت فرمایئے۔

(۲۰)......میرے ضعف پر رحم فرمایئے۔میری ذلت دور کیجئے میرے گناہ معاف فرمایئے جنھوں نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔

(۲۱)......اوران کی شفاعت میرے حق میں قبول فرمایئے۔جس دن سوائے آپ کے عفو کے نہ مال کام آئے گا نہ دوست واحباب۔

(۲۲)......ہمیشہ مجھے تقویٰ کے راستے پر چلایئے۔مہربانی فرما کر اور اسباب آسان فرما کر۔

(۲۳)......جو میری آپ سے امید ہے اس کو پورا فرمایئے۔اور فضل فرما کر میرے گناہوں کو معاف بھی کیجئے اور ستاری فرمایئے۔

(۲۴)......اسی طرح میرے شیوخ اور ساتھی اور والدین۔اور میرے انصار واعوان سب کے حق میں یہ دعا قبول فرمایئے۔

وصل وسلم یاالٰھی مبارکا علی المصطفیٰ خیر الوریٰ مراحقاب

وآل واصحاب وحزب به اقتدوا فهم خیر اصحاب وآل واحزاب

علامہ شامی رحمہ اللہ کے رسالے کا ترجمہ مکمل ہوا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مذکور کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ہماری اس ادنیٰ کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائیں،اور سب مسلمانوں کے لئے اس کو دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح کا ذریعہ بنائیں۔فقط۔۲/رجب المرجب/۱۴۲۸ھ۔18 / جولائی 2007ء بروز جمعرات